# عامر بن علی کی سفر نامہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل۔اُردو

۲۰۲۲ء-۲۰۲۴ء


مقالہ نگار:

**روبینہ شہادت**

رجسٹریشن نمبر:22- UE-01082

رول نمبر:MSF2200374

نگران مقالہ:

**ڈاکٹر عمارہ طارق**

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

یونی ورسٹی آف ایجوکیشن بنک روڈ کیمپس، لاہور


**ڈویژن آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ،**

**یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور**

# عامر بن علی کی سفر نامہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل۔ اُردو

۲۰۲۲ء-۲۰۲۴ء


مقالہ نگار:

**روبینہ شہادت**

رجسٹریشن نمبر:22- UE-01082

رول نمبر: MSF2200374

نگران مقالہ:

**ڈاکٹر عمارہ طارق**

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

یونی ورسٹی آف ایجوکیشن بنک روڈ کیمپس، لاہور


**ڈویژن آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ،**

## یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور

**یہ تحقیقی مقالہ ایم فل۔ اُردو ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلے میں شعبہ اُردو ڈویژن آف اسلامک اینڈ اورینٹل لرننگ، یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لوئر مال کیمپس، لاہور کو سند عطا کیے جانے کے لیے پیش کیا گیا۔**

# تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ زیرِ نظر مقالہ بہ عنوان:

**عامر بن علی کی سفر نامہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ**

روبینہ شہادت، رول نمبر:MSF2200374، رجسٹریشن نمبر:22-UE-01082 نے ایم۔ فل اردو کی سند کے حصول کے لیے قاعدے وضابطے کی مزید کارروائی کے لیے بتاریخ ۱۷ مئی ۲۰۲۴ کو جمع کروایا ہے۔

**نگرانِ مقالہ**

ڈاکٹر عمارہ طارق

اُستاد شعبہ اُردو

**ڈائریکٹر**

پروفیسر ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان

# تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ زیر نظر مقالہ بہ عنوان:

**"عامر بن علی کی سفرنامہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"**

روبینہ شہادت رول نمبر رول نمبر :MSF2200374 رجسٹریشن نمبر :22-UE-01082 نے ایم۔ فل اردو

کی سند کے حصول کے لیے میری زیر نگرانی مکمل کیا ہے ۔

**نگرانِ مقالہ**

ڈاکٹر عمارہ طارق

ایسوسی ایٹ پروفیسر (شعبہ اُردو)

تاریخ: ۱۷ مئی ۲۰۲۴

# اقرارنامہ

میں روبینہ شہادت، رول نمبر:MSF2200374، رجسٹریشن نمبر:22-UE-01082 اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ میں پیش کیا جانے والا مواد بہ عنوان:

***عامر بن علی کی سفر نامہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی***

میری ذاتی کاوش ہے اور یہ کام پاکستان یا پاکستان سے باہر کسی بھی تحقیقی یا تعلیمی ادارے کی طرف سے شائع یا پیش نہیں کیا گیا۔

مقالہ نگار:

روبینہ شہادت

# تصدیق نامہ

**عنوانِ مقالہ: عامر بن علی کی سفرنامہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ**

مقالہ نگار: روبینہ شہادت

رول نمبر: MSF2200374

رجسٹریشن نمبر: 22- UE-01082

یہ تحقیقی و تنقیدی مقالہ ڈویژن آف اسلامک اینڈ اوری اینٹل لرننگ، لوئر مال کیمپس، یونی ورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور کی مقالہ کمیٹی میں ایم۔فل اُردو کی ڈگری کے تقاضوں کی جزوی تکمیل کے طور پر منظور کیا گیا۔

**مقالے کی امتحانی کمیٹی:**

۱. داخلی ممتحن ____________________

۲. خارجی ممتحن ____________________

۳. ڈائریکٹر ____________________

تاریخ: ____________________

بسم اللہ الرّحمن الرّحیم

# فہرست


| شمار | عنوان | صفحہ |
|---|---|---|
| | **پیش لفظ** | |
| **باب اول:** | اردو میں سفر نامہ: روایت کے تناظر میں | ۱۳ |
| **باب دوم:** | عامر بن علی: احوال و آثار | ۳۶ |
| **باب سوم:** | سفر نامہ آج کا جاپان: تحقیقی و تنقیدی جائزہ | ۴۹ |
| **باب چہارم:** | سفر نامہ جہاں گردی: تحقیقی و تنقیدی جائزہ | ۸۱ |
| **باب پنجم:** | ''سفر نامہ نگر نگر اک نظر''اور ''مشرق کی طرف دیکھ'': تحقیقی و تنقیدی جائزہ | ۱۳۰ |
| | (الف) نگر نگر اک نظر: تحقیقی و تنقیدی جائزہ | ۱۳۱ |
| | (ب) مشرق کی طرف دیکھ: تحقیقی و تنقیدی جائزہ | ۱۶۵ |
| | **محاکمہ** | ۱۹۳ |
| | **کتابیات** | ۱۹۸ |

# پیش لفظ

سفر انسانی زندگی کی ایک ناگزیر حقیقت ہے، جسے ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرنے، مسافت طے کرنے اور نقل مکانی وغیرہ کے معنی میں مراد لیا جاتا ہے۔ سفر کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں:

سفر زندگی کے لیے برگ و ساز  سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

(اقبالؔ)

انسان بنیادی طور پر تنوع پسند ہے اور یہی تنوع پسندی اسے یکسانیت سے نکال کر زمانے کی رفتار میں شامل کرتی ہے۔ ایم۔فل کے لیے مقالہ لکھنے کا وقت آیا تو اسی تنوع پسندی کی وجہ سے میں نے سفر نامے کا انتخاب کیا جس میں حیرت تجسس انجانی، ان دیکھی راہوں اور دوسری دنیاؤں کو جاننے کا شوق بھی شامل تھا۔ میرے ایم۔فل کے مقالے کا موضوع ''عامر بن علی کی سفر نامہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' ہے۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے: پہلا باب ''اردو میں سفر نامہ: روایت کے تناظر میں'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مختصراً سفر نامے کے بنیادی مباحث زیر بحث لائے گئے ہیں جو سفر نامے کے لغوی معنی، اصطلاحی معنی، تعریف و مفہوم، اقسام اور سفر نامے کی روایت پر مشتمل ہے۔ یہ باب ایک طرح سے تمہید ہے جو مقالے کی تفہیم میں معاونت کرے گا۔ دوسرا باب ''عامر بن علی: احوال و آثار'' کے عنوان کے تحت ہے۔ اس باب میں عامر بن علی کا خاندانی پس منظر، پیدائش، ابتدائی تعلیم، عملی زندگی اور تصانیف کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

باب سوم کا عنوان ''سفر نامہ آج کا جاپان: تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' اس باب میں جاپان کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب و ثقافت، سائنس اور ٹیکنالوجی میں جاپان کے بڑھتے انقلاب کے ساتھ ساتھ جاپان کا پاکستان کے ساتھ تجزیہ بیان کیا گیا ہے۔ باب چہارم ''سفر نامہ جہاں گردی: تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں جاپان، تھائی لینڈ، سری لنکا، قطر، ارجنٹائن، پیرو، چلی اور میکسیکو کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب و ثقافت پر بحث کی گئی ہے۔

باب پنجم کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (الف) ''سفر نامہ نگر نگر اک نظر: تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' کے عنوان کے تحت ہے۔ اس باب میں جاپان سمیت مختلف ممالک کے سیاسی اور تعلیمی نظام کو تقابلی جائزہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نامور ادباء اور شعراء کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح حصہ (ب) کا عنوان ''سفر نامہ مشرق کی طرف دیکھ: تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مصنف کی تازہ تصنیف ہے جو کہ اپریل ۲۰۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس باب میں جاپان، پاکستان، جنوبی کوریا، تھائی لینڈ اور ملائشیا کے عمومی اور بنیادی موضوعات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

اختتام پر محاکمے کی صورت میں مقالے کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے اور مقالے کی پیش کردہ معلومات سے نتائج اخذ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ کتابیات کے عنوان سے تمام مصادر و منابع کی فہرست دی گئی ہے جس سے دوران تحقیق استفادہ کیا گیا ہے۔

خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثناء اور لاکھوں کروڑوں درود و سلام حضور نبی کریم ﷺ پر کہ جن کا ذکر باعث خیر و برکت ہے۔ رب ذوالجلال کی عنایتوں اور نوازشوں کا ڈھیروں شکریہ کہ جس کی عطاہ کردہ قوت، ہمت اور حوصلے کے سبب میرا یہ مقالہ تکمیل کو پہنچا ہے۔

اظہار تشکر کے طور پر مجھے سب سے قبل اپنی استاد محترمہ 'ڈاکٹر عمارہ طارق صاحبہ' کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے تمام مراحل میں میرا ساتھ دیا اور تحقیق کے سفر میں گویا انگلی پکڑ کر مجھے چلنا سکھایا۔ موضوع کا انتخاب تھا یا اُس پر بحث و تمحیص کا انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود مجھے وقت دیا اور میری کاوش کو اپنی نگرانی میں مکمل کرایا۔ میں ایک بار پھر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ان کی ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں علم وادب کی راہبری ور ہنمائی کے لیے ہمیشہ سلامت رکھے۔ (آمین)

میں پروفیسر ڈاکٹر وحید الرحمن خان (ڈائریکٹر ڈویژن آف اسلامک اینڈ اوری اینٹل لرننگ) کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جن سے تعلیم حاصل کرنا میرے لیے باعث افتخار ہے۔ ایم۔ فل اُردو میں ہمیں زیور تعلیم سے آراستہ کرنے والے اساتذہ کرام ڈاکٹر سلیمان بھٹی (صدر شعبہ اُردو)، ڈاکٹر صائمہ علی، ڈاکٹر شبیر حسن اور ڈاکٹر نبیل احمد نبیل کی بے حد شکر گزار ہوں کہ جن کی محبت و شفقت مجھے ہر وقت میسر رہی اور جن کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے اس ڈگری کو پایہ تکمیل تک پہنچا پائی ہوں۔

تحقیق کے سلسلے میں میرے والدین کی دعاؤں اور بہن بھائی کی محبتوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاص طور پر میرے بھائی محمد وقاص مدد و معاون ثابت نہ ہوتے تو شاید آئندہ دس سال تک بھی یہ کام مکمل نہ کر پاتی۔ میرے عزیز ماموں جان رائے آصف محمود ایڈووکیٹ نے بھی مجھے بہت حوصلہ دیا اور ایسا ماحول فراہم کیا کہ میں آسانی سے کام مکمل کر سکوں۔ میں لاہور میں اپنی ممانی کنول آصف کا احسان اتار ہی نہیں سکتی کہ انہوں نے جس طرح سے میرے ساتھ تعاون کیا، وہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں میری بہت اچھی اور بہت معاون و مددگار دوست حافظہ نجمہ نے بھی تحقیق کے راستوں کو آسان بنانے میں میرا ساتھ دیا۔ ان کے قابل قدر مشورے اور کتابوں کی فراہمی میرے لیے احسان عظیم سے کم نہیں۔ میں اپنے کمپوزر حافظ محمد عمار احمد کی بھی تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے بہت ہی اچھے انداز اور دل جمعی سے میرے مقالے کو حتمی روپ دیا۔ اللہ تعالیٰ سب کا حامی و ناصر ہو۔

مقالہ نگار

**روبینہ شہادت**

# انتساب

والد محترم کے خوابوں کے نام

اور

والدہ محترمہ کی دعاؤں کے نام

## باب اول:

# اُردو میں سفرنامہ: روایت کے تناظر میں

''سفر'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ ''نامہ'' فارسی زبان کا لفظ ہے۔ سفر کے لغوی معنی ''مسافت طے کرنا، سیاحت کے لیے نکلنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اور کوچ کرنے'' کے ہیں، جبکہ ''نامہ'' کے لغوی معنی ''لکھے ہوئے خط، فرمان یا تحریر شدہ عبارت'' کے ہیں۔ عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کو ملا کر اردو کے علمانے ''سفر نامہ'' کی اصطلاح وضع کی۔ سفر نامہ کو ہندی زبان میں ''یاترا اور تتانت'' اور انگریزی زبان میں ''Travelogue'' کہا جاتا ہے۔ سفر کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہی ہے، پیغمبروں اور اولیائے اکرام کے ساتھ حکمائے قدیم کے نزدیک زندگی ایک ایسا سفر ہے جو ازل سے ابد تک جاری ہے۔ بنیادی طور پر سفر اور زندگی کا رویہ ایک جیسا ہے کہ زندگی حرکت اور عمل سے عبارت ہے۔ میر تقی میر نے کیا خوب کہا:

**موت اک ماندگی کا وقفہ ہے**
**یعنی آگے چلیں گے دم لے کر**

یا پھر میر تقی میرؔ کے اس شعر کی مانند ہے:

**میرؔ اس شہر پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے**
**کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ**

ڈاکٹر انور سدید سفر نامے کی فنی بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

**''زندگی چوں کہ خود ایک مسلسل حرکت ہے اس لیے سفر بھی زندگی کا ہی استعارہ ہے۔''** (۱)

اُردو ادب میں سفر نامہ ایک بیانیہ صنف ہے۔ ایک سفر نامہ نگار اپنے سفر کے حالات، واقعات، مشاہدات، تجربات اور احساسات کو صفحہ قرطاس پر پیش کرتا ہے اور سفر نامہ وجود میں آتا ہے۔ اگر سفر نامے کی تعریف کی جائے تو یوں کی جاسکتی ہے کہ اُردو زبان میں سفر نامہ وہ بیانیہ صنف ہے جس میں سفر نامہ نگار دورانِ سفر اپنے تجربات، مشاہدات اور قلبی تاثرات کو اَدبی تحریر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ بنیادی طور پر سفر نامہ ''سفر'' کی رُوداد ہوتی ہے۔ انسان مختلف مقاصد کے لیے سفر اختیار کرتا ہے مثلاً کائنات کے سربستہ رازوں کو جاننے کی خواہش، زمین کو کھنگالنے کا جذبہ، کہکشاؤں پر کمندیں ڈالنے کا شوق۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنے درونِ خانہ میں جھانکنے کی جستجو کا ذریعہ سفر ہی ہے۔

سفر کا لفظ سب سے پہلے قرآن پاک کے دوسرے پارے میں استعمال ہوا ہے:

**''فمن کان منکم مریضاً او علیٰ سفرا''** (۲)

اور پھر قرآن کریم میں بھی سفر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

**''قل سیر وافی الارض فانظروا کیف بدا الخلق ثم اللہ ینشی النشاۃ الاخرۃ۔ ان اللہ علی کل شئی القدیر''**

**''ترجمہ: کہہ دو کہ تم زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے مخلوق کو کس طرح پہلی دفعہ پیدا کیا ہے اور پھر خدا ہی پچھلی پیدائش کو پیدا کرے گا بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''**(۳)

یہ ہی وجہ ہے جب عہد اسلام میں تسخیر عالم کا شوق حج کعبہ تقدیس و عظمت روضہ رسولؐ کی زیارت کا شوق یہ ایسے محرکات تھے جس کے سبب عربوں اور مسلمانوں میں سیرت و سیاحت کا ذوق و شوق مقبولیت کی حد تک تھا۔ سفر دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے اہم ہے۔ سفر سے تجربہ وسیع اور زمانے کے نشیب و فراز کو سمجھنے، دنیا کے رسم و رواج، طرزِ معاشرت، انتظامی اور سیاسی امور سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

سفر کامیابیوں اور کامرانیوں کی نوید لے کر آتا ہے۔ سفر کے ذریعے سے ہی ہمیں اپنی تاریخ، سیاست اور تہذیب و ثقافت سے آشنائی معلوم ہوتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو بشر کا خلد سے نکلنا بھی ایک بڑے سفر کا پیش خیمہ ہی ہے۔ انسان کو ہر پل اپنی ذات کی شناخت اور پہچان کی جستجو سفر پر رواں رکھتی ہے۔ سفر نامہ دورِ جدید کی معروف اَدبی صنف ہے۔ مختلف اُردو لغات میں اُردو سفر نامے کے متعدد معنی و مفاہیم درج ہیں۔ سفر نامے پر تفصیلی بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم لغات میں درج معنی و مفاہیم سے آگاہ ہو سکیں۔

سفر نامہ کے معنی ''علمی اردو لغت'' میں یہ لکھے گئے ہیں:

**''سفر نامہ کا روزنامچہ، سفر کے حالات پر مشتمل کتاب یا مضمون۔''**(۴)

''جامع اللغات'' میں سفر نامے کے معنی:

**''در سفر کے حالات اور سر گزشت دیئے گئے ہیں''**(۵)

سفر کے حالات اور سر گزشت فرہنگ آصفیہ'' کے مطابق:

**''سیاحت نامہ، سفر کی کیفیت، روزنامچہ سفر، حالات و سر گزشت سفر''**(۶)

''رنگین فیروز اللغات اردو جامع'' میں سفر نامے کے معنی میں یہ الفاظ لکھے گئے ہیں:

**''سفر کے حالات پر کتاب، سیاحت نامہ''**(۷)

فیروز اللغات فارسی کے اُردو میں سفر نامہ کے معنی:

**''وہ کتاب جس میں سیر و سیاحت کے حالات درج ہوں''**(۸)

سفر نامہ کی تعریف Oxford Dictionary کے مطابق کچھ یوں کی گئی ہے:

**"Travelugue a film/movies, broadcast or piece of woiling about travel"**(9)

The Dictionary of English کے مطابق:

"A documantry film describing a country
travel etc.
A lecture describing travel usually illustrated
as wilk photo graphics slides, etc." (10)

سفر نامے کے لغوی اور لفظی مفاہیم کے بعد ہم اگر سفر نامے کی مکمل اور جامع تعریف دیکھنا چاہیں تو وہ مختلف ناقدین اور محققین کی نگاہ میں کچھ یوں ہے۔ڈاکٹر انور سدید ''اُردو اَدب میں سفر نامہ'' میں اس بارے اپنی رائے کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

**''سفر نامہ سفر کے تاثرات، حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام پر اپنے مشاہدہ، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے''(۱۱)**

ایک سیاح ضروری نہیں کہ صرف معلومات یا خبر کا وسیلہ بنے بلکہ خوبصورت الفاظ میں سمو کر اپنی سفر کی روداد کو جو واقعات و مشاہدات کے ساتھ تاثرات و احساسات پر مبنی ہو اس طرح بیان کرے کہ زندگی کے نئے راستوں کا ادراک اور فہم بھی پیدا ہو۔ چونکہ سفر نامہ اپنے مزاج کے حوالہ سے نہ تو افسانہ ہے، نہ ناول، نہ ہی ڈرامہ پھر بھی موضوعات کے تنوع اور وسعت کی وجہ خارج کے ساتھ ساتھ داخلی عناصر اور تخیلی رنگ آمیزی اس کو ایک دلچسپ تخلیقی صنف ادب بنا دیتی ہے۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

**''سفر نامہ ہر ادب کی ایک بیانیہ صنف ہے جس میں خارجی مشاہدے کو تخیل پر فوقیت حاصل ہے البتہ سفر سے متعلق ہونے کے باعث سفر نامے میں تحیر کا عنصر نمایاں تر ہے لیکن یاد رہے کہ مستقل ادبی صنف ہونے کے ناطے سفر نامے کی پیش کش ادبی نوع کی ہو گی نہ کہ محض مسافر کا بیان۔ اس لیے یہ امر مجبوری سفر اختیار کرنے والے ہر مسافر کا سفری احوال، ادب کی ایک مستقل صنف سفر نامہ یا سیاحت نامہ نہیں کہلائے گا۔''(۱۲)**

ڈاکٹر قدسیہ قریشی سفر نامے کی تعریف میں رقمطراز ہیں:

**''سفر نامے کے معنی داستانِ سفر، روداد سفر یا سفر کے قصے کے ہیں، جیسے تحریری طور پر پیش کیا گیا ہو۔''(۱۳)**

**امجد اسلام امجد سفر نامہ کی ذیل میں کہتے ہیں:**

**''قاری سفر نامے کے ذریعے مصنف کی انگلی پکڑ کر وہاں کی سیر کراتا ہے''(۱۴)**

سفر نامے کے بارے میں مرزا ادیب لکھتے ہیں:

''سفر نامہ نگار تو جو کچھ لکھتا ہے جو کچھ پاتا ہے، جس مقام سے گزرتا ہے، اس کی ساری خوشبوئیں، اس کے سارے باطنی رنگ اور اس کی ساری کیفیات جو سرا پاراز میں چھپی ہوئی ہے ان سب کو سمیٹ لیتا ہے۔ وسائل و ذرائع پر تکیہ کر کے یہ چیز ممکن نہیں ہے۔ سفر نامہ نگاری لازماً ایک تخلیقی تجربہ ہے۔ اس کا اطلاق انہی حصوں پر ہوتا ہے جو تخلیقی تجربے سے وابستہ کئے جاتے ہیں''(۱۵)

ڈاکٹر خالد محمود سفر نامے کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''سفر نامہ نگار دوران سفر یا واپسی پر اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات اور تاثرات و احساسات کو ترتیب دے کر جو تحریر رقم کرتا ہے، وہ سفر نامہ ہے''(۱۶)

رفیع الدین ہاشمی کے الفاظ ہیں:

''سفر نامہ ایک طرح کی روداد یا رپورتاژ ہے، جسے آپ بیتی کی ایک شکل کہا جا سکتا ہے۔ سفر نامے کی عمدگی اور دل چسپی دو باتوں پر منحصر ہوتی ہے ایک واقعاتِ سفر کی لذت و جدت اور دوسرے اندازِ بیان میں تازگی''(۱۷)

نفیسہ حق سفر نامہ کی تعریف اور وسعت کے بارے میں لکھتی ہیں:

''سفر عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مسافت طے کرنا، سیاحت کے لیے نکلنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہونا کے ہیں۔ اردو زبان میں یہ لفظ عربی سے مستعار ہے اور انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے''(۱۸)

سفر نامے کی تعریف کے ساتھ ساتھ اس کی تکنیک میں بھی تنوع پایا جاتا ہے جبکہ سفر نامے کا فن کسی خاص تکنیک کا محتاج نہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سہیل لکھتے ہیں:

''سفر ناموں کی تکنیک کا مزاج مختلف النوع طبائع کا منت پذیر ہوتا ہے۔ ہر سفر نامہ نگار اپنے باطن کا پوسٹ مارٹم کر کے آپ کے سامنے بکھر جاتا ہے۔ آپ اس کی شخصیت کی جُزی سے جُزی جھوٹ اور سچ سے واقف ہو جاتے ہیں بلکہ لکھتے وقت تو اسے خبر بھی نہیں ہوتی ہے کہ وہ کہاں کہاں قاری کی گرفت میں اس طرح آگیا ہے کہ اب اپنا آپ چھپانا مشکل ہے۔ نثر کے دوسرے اصناف میں مصنف خود کو چھپا سکتا ہے مگر سفر نامہ وہ واحد صنف نثر ہے جس میں داخلیت سے سروکار رہتا ہے اور ذات کے سمندر کو بلونا پڑتا ہے''(۱۹)

سفر نامہ نگار کن مشکلات اور مصائب کا شکار ہوتا ہے پروفیسر غلام عباس وڑائچ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سفر نامہ تحریر کرنا شاید اتنا دشوار نہ ہو جتنا کہ بذاتِ خود سفر دشوار ہوتا ہے بغیر سفر کیے سفر نامہ لکھنا ممکن نہیں۔ ناول اور افسانہ تو تخلیقی اَدب ہے۔ آپ گھر بیٹھے لکھ سکتے ہیں مگر سفر نامہ ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر ہی لکھا جاسکتا ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ سفر کرتے ہیں مگر ان کے پیشِ نظر کچھ اور مقاصد ہوتے ہیں۔ سیاح تو اس مقصد کے لیے کرتا ہے کہ وہ رنگا رنگ کی زندگیوں کا مشاہدہ کرے، قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہو اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا وسیع مشاہدہ کرے۔ جتنا مشاہدہ ایک سیاح دوسرے ملک میں جا کر کرتا ہے اتنا مشاہدہ وہاں رہنے والا بھی نہیں کرتا'' (۲۰)

سفر بالعموم کسی خاص جگہ، مقام کی محض سیاحت نہیں ہوتی بلکہ ایک طے شدہ منزل کا تعین ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار سفر کے حالات وواقعات دیکھ کر جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ پروفیسر غفور شاہ قاسم اسی تناظر میں لکھتے ہیں:

> ''سفر نامہ ایک ایسی غیر افسانوی صنفِ اَدب ہے، جس میں فکشن کی تنظیم، آپ بیتی کی ذاتیت، رپورتاژ کی قوتِ متخیلہ، انتھراپولوجسٹ کی انسان دوستی، جیالوسٹ کی وسعت، مورخ کی تحقیقی بصارت، فطرت کی جولانیاں شامل ہوسکتی ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سفر اور آورگی میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ سفر میں منزل متعین ہوتی ہے اور ہر اُٹھنے والا قدم منزل سے قریب ہونے کی بشارت دیتا ہے۔ آوارگی میں کوئی متعین منزل نہیں ہوتی۔ قدم اس میں بھی اُٹھتے ہیں جسم تھکن سے چور بھی ہوتا ہے مگر حاصل کچھ نہیں ہوتا'' (۲۱)

مجموعی طور پر سفر نامہ تاریخی، جغرافیائی، سیاسی، سماجی، تہذیبی ادبی اور لسانی اعتبار سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ قاری کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے، اسے مختلف ممالک کے سیر و تفریح کا سامان کرتا ہے۔ لہٰذا سفر نامہ اردو ادب کی غیر افسانوی نثر میں موضوعاتی تنوع کی وجہ سے بہت مقبول صنف ہے جس کی قدر و منزلت میں زمانے کے ساتھ ساتھ روز بروز اضافہ ممکن ہے۔

## اُردو سفر نامے کی اقسام:

سفر نامے کا شمار اردو ادب کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے جس میں بہت سی اصناف کو استعمال کیا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار اپنی ضروریات کے مطابق اپنے موضوعات اور جذبات کے اظہار کے لیے تاریخ، مکتوب نگاری، ڈائری، روزنامچہ اور خود نوشت کی تکنیک اور اسلوب سے مدد لے کر اپنی سفری روداد کو بیان کرتا ہے۔ تاہم سفر نامہ اپنے اندر دیگر ادبی اصناف رکھنے کے باوجود اپنی انفرادی حیثیت برقرار رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کا بیان بہت اہم ہے، وہ کہتے ہیں:

> **''فنی اعتبار سے سفر نامہ کی تکنیک شروع سے آج تک بیانیہ ہے جبکہ موضوعات کے حوالے سے اردو میں سیاسی، مذہبی، تاریخی، جغرافیائی اور تحقیقی نوعیت کے سفر نامے ملتے ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے روزنامچوں، خطوط اور روداد کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں''** (۲۲)

ابتدا میں سفر نامے معلوماتی کتاب کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں جغرافیائی خد و خال، تہذیبی آثار، مذہبی معلومات، حیوانات و نباتات، سبزیوں اور پھلوں کے ساتھ دیگر فصلوں کے حوالے سے معلومات قارئین کو فراہم کی جاتی تھیں لیکن اردو کے پہلے سفر نامہ نگار یوسف خان کمبل پوش نے سفر اس کی روایت سے نکل کر ذاتی تاثرات واحساسات کی آمیزش سفر نامے کی قدیم تکنیک کو ختم کر دیا اور داخلی کیفیات کو داخل کر کے سفر نامے کو ایک نیا اور الگ معیار دیا۔ اسی وجہ سے مختلف ناقدین اور محققین نے سفر نامے کو ہیئت کے ساتھ ساتھ موضوعاتی اعتبار سے تقسیم کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

۱۔ **مذہبی سفر نامے**
۲۔ **مقامی سفر نامے**
۳۔ **سیاسی سفر نامے**
۴۔ **یورپی سفر نامے**
۵۔ **مشرقی سفر نامے**
۶۔ **مزاحیہ سفر نامے**

## ۱۔ مذہبی سفر نامے:

جو سفر نامے مقدس مقامات اور زیارات پر لکھے جائیں، مذہبی سفر نامے کہلاتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں حج بیت اللہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، حرمین شریفین کے بارے میں تفصیلی معلومات موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً حاجی محمد منصب علی خان کا ''ماہ مغرب المعرف بہ کعبہ نما''، محمد عمر علی خان کا ''زادِ غریب''، وزیر حسن بریلوی کا سفر نامہ ''وکیل الغربا''، سید قاسم حسین شیفتہ کا سفر نامہ ''حرمین الشرقین''، مرزا عرفان علی بیگ کا ''سفر نامہ حجاز''، مرزا قاسم بیگ کا ''زادالزائرین''، حاجی

احمد حسین خان کا سفر نامہ ''حجاز و مصر''، خواجہ حسین نظامی کا ''مصر، شام و حجاز''، نسیم حجازی کا ''پاکستان سے دیارِ حرم تک''، کنیز محمد بیگم کا ''ارض مقدس''، شورش کاشمیری کا ''شب جائے کہ من بودم''، ماہر القادری کا ''کاروانِ حجاز''، ممتاز مفتی کا ''لبیک'' اور بشریٰ رحمان کا ''بھاولی بھکارن'' وغیرہ مذہبی سفر ناموں کے زمرے میں آتے ہیں۔

## ۲۔ مقامی سفر نامے:

وہ سفر نامے جن میں ملک کے اندر مختلف شہروں، علاقوں اور سیاحتی مقامات کے بارے میں بیان کیا گیا ہو، مقامی سفر نامے کہلاتے ہیں۔ مقامی سفر ناموں میں نادر کا ''مثنوی نادر''، پنڈت کنھیا لال کا ''سیر کشمیر''، سید کریم علی کا ''باغ نو بہار''، نواب غور محمد خاں ''سیر المحتشم''، منشی امین چند کا ''سفر نامہ امی چند''، شفیع محمد ریاض الدین کا ''سرور ریاض''، مرزا عوض علی بیگ کا ''آئینہ حسرت''، نواب کلب علی خاں کا ''ضمیمہ اودھ اخبار''، کنھیا لال کا ''سفر نامہ کشمیر''، مستنصر حسین تارڑ کے سفر نامے ''رتی گلی''، ''چترال داستان''، ''ہنزہ داستان''، اعجاز حسین کا سفر نامہ ''بلوچستان''، مبارک حسین عاجز کا ''کہساروں کی زمین میں چند روز'' اور اشفاق احمد کا ''سفر در سفر'' وغیرہ شامل ہیں۔

## ۳۔ سیاسی سفر نامے:

جب کوئی سیاح حکومت کی طرف سے بیرونِ ملک سفر کرتا ہے اور اپنے سفر کی داستان کو تحریری انداز میں بیان کرتا ہے تو وہ سیاسی سفر نامے کہلاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا ادیب کا ''ہمالیہ کا اُستاد''، شریف فاروق کا ''دیارِ دوست''، ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کا سفر نامہ ''چین بحسین''، قاضی عبدالغفار کا سفر نامہ ''نقش فرہنگ''، جعفر تھانیسری کا ''کالا پانی''، مولانا عبید اللہ سندھی کا سفر نامے ''کابل میں سات برس'' اور ''ذاتی ڈائری''، ابن فضلان کا سفر نامہ ''سیاحت ناہ اوس''، ابو عبید اللہ کے سفر نامے ''احسن التقاسیم'' اور خالدہ ادیب خانم کا سفر نامہ ''اندرون ہند'' وغیرہ اس زمرے میں آتے ہیں۔

## ۴۔ یورپی سفر نامے:

ایسے سفر نامے جو مغربی ممالک پر لکھے جائیں اس میں لندن، روس، جاپان، امریکا، پیرس اور افریقہ وغیرہ کے سفر نامے شامل ہیں، یورپی سفر نامے کہلاتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں یوسف حسین خاں کمبل پوش کا ''عجائباتِ فرنگ''، منشی برج بھوش لال کا ''وقائع کیپ''، مظفر حسین حیدر کا ''سیرِ فرنگستان''، سر سید احمد خاں کا ''مسافران لندن''، کرشن داس جی کا ''سیر ستان انگلینڈ''، ناصر الدین شاہ کا ''سفر نامہ یورپ'' (حصہ اول)، مولوی سمیع الدین خاں کا ''سفر نامہ لندن''، بابو ماشنکر کا ''آئینہ سکندری''، مہدی حسن خان کا ''گلشت فرنگ''، مرزا نثار علی بیگ کا ''سفر نامہ یورپ''، نواب حامد علی خاں ''سیر حامدی''، منشی اللہ دتہ کا ''عجائباتِ امریکا''، لال بیجناتھ کا ''انگلینڈ اینڈ انڈیا''، جنرل ٹامس ایڈورڈ کا ''سفر نامہ ایران''،

لالہ بیج ناتھ کا سفر نامہ ''انگلینڈ اینڈ انڈیا''، اعتصام الدین شاہ کا سفر نامہ ''شگرف نامہ ولایت''، ابو طالب اصفہانی کا سفر نامہ ''سفر نامہ فرنگ'' وغیرہ شامل ہیں۔

## ۵۔مشرقی سفر نامے:

وہ سفر نامے جن میں مشرقی ممالک کی مذہبی عقیدت کے ساتھ ساتھ وہاں کے علمی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تاریخی تفصیلات کا علم ہو، مشرقی سفر نامے کہلاتے ہیں۔ اس حوالے سے مرزا کاظم برلاس کا ''سیرِ دنیا''، محمد حسین آزاد کا ''سیرِ ایران''، نواب محمد عمر علی خان کے ''سفر نامہ رئیس''، ''فرہنگ فرہنگ'' اور ''ارژنگ چین''، شبلی نعمانی کا ''سفر نامہ روم و مصر و شام''، عبدالخالق کا ''سیرِ برہما''، جنرل سر ٹامس ایڈورڈ گارڈن کا ''سفر نامہ ایران''، حافظ احمد علی خاں شوق کا ''شہنشاہ جرمنی کا سفر قسطنطنیہ''، نواب محمود علی خاں کا ''موجودہ حالات مصر موسوم بہ خیابان''، سید سلیمان ندوی کا سفر نامہ ''اسیرِ افغانستان''، محمد علی مقصودی کا ''مشاہداتِ کابل و یاغستان'' اور حسرت موہانی کا سفر نامہ ''عراق'' وغیرہ مشرقی سفر نامے ہیں۔

## ۶۔مزاحیہ سفر نامے:

سفر نامے بنیادی طور پر سنجیدہ تخلیقی عمل ہے لیکن سفر کے حالات اور واقعات سے بعض دفعہ ایسے شگوفے پھوٹتے ہیں کہ قارئین بے حد لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اُردو اَدب میں ایسے سفر نامے جو مزاحیہ انداز میں بیان کیے گئے ہوں، مزاحیہ سفر نامے کہلاتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں ابنِ انشا کے سفر نامے ''چلتے ہو تو چین کو چلیے''، ''دنیا گول ہے''، ''ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں''، شفیق الرحمٰن کا ''ڈینیوب''، کرنل محمد خاں کا ''جنگ آمد''، ''بجنگ آمد'' اور ''بسلامت روی''، صدیق سالک کا ''تادم تحریر''، اے حمید کا ''دیہات کی بہاریں'' اور عطاء الحق قاسمی کا ''خندہ مکرر'' وغیرہ مزاحیہ سفر نامے ہیں۔

## سفر نامے کی روایت:

سفر نامہ وہ بیانیہ صنف ادب ہے جس میں سفر نامہ نگار دورانِ سفر جن چیزوں کو دیکھتا ہے اور مشاہدات کے زیرِ اثر اُس کے اندر جو احساسات و تاثرات پیدا ہوتے ہیں، انہیں وہ صفحہ قرطاس پر پیش کرتا ہے۔ اس سے سفر نامہ وجود میں آتا ہے۔ انسانی زندگی میں سفر کی اہمیت ہر زمانے میں مسلمہ رہی ہے۔ سفر انسانی زندگی کی ناگزیر حقیقت ہے۔ اگر سفر نامے کی روایت دیکھی جائے۔ قرآن پاک میں سات مقامات پر ''سیر وفی الارض'' کا ذکر آیا ہے۔ کہ **''اللہ کی زمین کی سیر کرو۔''**

سورۃ نوح میں فرمایا گیا ہے کہ:

> **''حالانکہ اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے۔ کیا دیکھتے نہیں کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا اور**

**اللہ نے تم کو زمین سے عجیب طرح لگایا۔ پھر وہ تمہیں اسی زمین میں واپس لے جائے گا اور اس سے یکایک تمہیں نکال کھڑا کرے گا اور اللہ نے زمین کو تمہارے لیے فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ تم اس کے اندر کھلے راستوں میں چلو۔"**(۲۳)

اور پھر حدیث کی تدوین کے سلسلے میں صحابہ کرام کے دور میں دور دراز سفر کیے گئے اور حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ :

**"علم حاصل کرو چاہے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔"**

تب بہت سے علما نے تدوینِ حدیث کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں سفر کیے اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ اگر تاریخ اور اسلام کو دیکھا جائے تو بری اور بحری سفر سب سے زیادہ مسلمانوں نے کیے۔ بہت بعد میں یورپ والے سفر نامے سامنے آئے۔

اگر جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہیروڈوٹس (Herodotus) وہ پہلا شخص تھا، جس نے دنیا اور زمین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے سفر کیا۔ اس کا سفر بحر اسود پھر یونان اور جنوب اٹلی تک کا تھا۔ جس میں لوگوں کی رہائش، احساسات، طبائع اور بودو باش کے بارے میں لوگوں کو معلومات دی۔ اس کے بعد جغرافیہ جیسی اہم کتابیں "بطلیوس" (Ptolemy) اور رومن جرنیل اگریپا نے (Agrippa) نے لکھیں اور انسانی تاریخ اور تمدن کے بارے میں بے حد مفید معلومات فراہم کیں۔

محققین نے یونانی مورخ لیپر وڈسن (Labor Herodan) کو اولین سفر نامہ نگار مانا ہے لیکن عرب کا ہیروڈوٹس (Herodotus) المسودی کو کہا جاتا ہے۔ اس نے ایران، ارمینیا، وادی سندھ سیون، افریقہ، رنجبار اور مڈغاسکر تک سفر کیا۔ تیس جلدوں پر مشتمل کتاب "اخبار الزمان"، لکھی۔

ہیروڈوٹس (Herodotus) نے تاریخ اور سفر نامے کی عمارت کی بنیاد ۲۸۰ قبل از مسیح انجام دی۔ ان کو بابائے تاریخ بھی کہا جاتا ہے۔ شبلی مطابق :

**"ہیروڈوٹس (۲۲۵ Herodotus ق۔م) بابائے تاریخ کہلاتا ہے۔ اسے بابائے سفر نامہ کی بھی حیثیت حاصل ہے وہ اپنے تجربوں پر سفر ناموں کی عمارت تعمیر کرتا ہے اور ان ملکوں کا حال بیان کرتا ہے جو اس وقت یونان کے علم میں تھے۔ اس طرح سب سے پہلے ہمیں تاریخ کے عظیم شعور سے آشنا کراتا ہے۔ وہ سفر کے حالات نہیں بلکہ ایسے نتائج بیان کرتا ہے جو جغرافیہ کی نشان دہی کرتے ہیں"**(۲۴)

یونانی مورخ زینوفون (Xenophon) کی کتاب "Anabasis" میں سفر کے لوازمات موجود ہیں۔ سفر کی مشکلات کا ذکر روم میں "Aelivs" اور "Horace" نے کیا ہے۔ "ابن جبیر" (Ibnjubayr) اندلس کے

مشہور سفر نامہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ بغداد عرب ممالک کا ایسا علاقہ تھا، جس کا ذکر تمام قدیم داستانوں شان و شوکت کے ساتھ شہزادوں اور شہزادیوں کے حسن و عشق کی داستانوں کا طلسم لیے ہر خاص و عام کے دل پر نقش تھا۔ وہ اس سحر انگیز ماحول اور خوب صورتی کو جاننا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر تاراچند نے لکھا ہے:

**''چھٹی صدی قبل مسیح تاریخ عالم کے حیرت ناک ادوار میں شمار ہوتی ہے۔ اس صدی میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں خیالات کی ترسیل کا سلسلہ براہِ راست جاری تھا اور چین سے لے کر مصر اور یونان تک اثرات پہنچتے تھے۔ ان خیالات کا مرکز تمدن کا گہوارہ بغداد تھا۔''** (۵۲)

ابن بطوطہ (IbnBattuta) کے سفر نامے ہندوستان کی تاریخ کے لحاظ سے سب سے اہم ترین اور یادگار سفر نامے ہیں۔ ابن بطوطہ نے پچیس سال کا طویل عرصہ سیاحت میں گزارا اور محمد بن تغلق کے عہد میں نو برس ہندوستان میں رہا اور بہت سے سفر نامے لکھے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں:

**''ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری کا مشہور مسلمان سیاح ہے جس نے اپنی عمر کے چھبیس سال مشرق و مغرب کی سیاحت میں بسر کیے۔ وہ مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ نگاہ دوربین رکھتا تھا۔ اسی لیے وہ جہاں بھی کہیں گیا، وہاں کے سیاسی، سماجی، علمی اور ادبی حالات کا مطالعہ بھی بڑی دقیقہ رسی کے ساتھ کیا۔ وہ کسی بادشاہوں کے دربار میں اعزاز و اکرام کی کسی بڑی کرسی پر نظر آتا ہے تو کبھی صوفیائے کرام کی مجلس رجال میں شریک دیکھا جاتا ہے۔ اس بناپر اس کا سفر نامہ جہاں بے حد دلچسپ اور دل آویز ہے وہاں پر نایاب اور بیش قیمت معلومات کا گنجینہ بھی ہے''** (۲۶)

اہلِ مغرب کے لیے سرزمین برصغیر ایک ایسا خطہ اراضی تھا جو اپنے اندر بہت ہی کشش اور سحر رکھتا تھا۔ انگریزوں کو ہندوستان کی سیاحت پر اس سحر نے مجبور کیا اور پھر ہندوستان مغلوں کے اقتدار سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار میں چلا گیا۔ اس طرح انگریزوں کے وارد ہونے مشرق کے مکینوں کے لیے بھی یورپ کی کشش اور اضافہ ہوا۔ اس سے پہلے ہندوستان سے باہر کے سفر کے اشارے قدیم آریا تہذیب اور رامائن سے ملتے ہیں۔

ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں:

> ''مہابھارت میں جو نام ملتے ہیں وہ دور دراز ممالک کے نام ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ دور دراز ملکوں کا سفر کرتے تھے۔ ویدوں، پرانوں، رامائن اور مہابھارت کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی سفر کا ذکر ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر کرنے کی خواہش قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔''(۲۷)

سفر ناموں کے ابتدائی نقوش ہندوستان میں ہمیں گستاولی بان کی کتاب سے ملتے ہیں۔ جس کے مطابق ہندوستان کا پہلا سیاح ''میگستھینز'' ہے جو سلیوکس کے سفیر کی حیثیت سے سور یہ سلطنت کے عہد میں ہندوستان آیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں ڈاکٹر برنیر فرانسیسی سیاح ۱۶۵۵ء میں آیا۔ اس نے مغل بادشاہوں کے مذہبی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، علمی، فنی غرض کے محل کے حالات و واقعات اور امورِ سلطنت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

میگسھتینز (Megasthnes) نے ہندوستان کی تہذیب اور طرز و معاشرت کا بہ غور مطالعہ کیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے احوال سفر پر دنیا کا اولین دریافت شدہ سفر نامہ Indica (سفر نامہ ہند) لکھا۔ یہ سفر نامہ چوتھی صدی قبل مسیح کا ایک معاشی، معاشرتی، تہذیبی، علمی اور اقتصادی حالات کے نقوش صاف نظر آتے ہیں۔ تمام مورخین نے اس کتاب کو بے حد معلوماتی سفر نامہ قرار دیا ہے۔ سی۔ کھنہ کے مطابق:

> ''ہندوستان میں آنے والا پہلا سیاح میگستھنز ہے اور یہاں کئی سال رہا اس نے اپنی کتاب (انڈیکا) میں ہمارے ملک اور لوگوں کے بارے میں تفصیلی حالات تحریر کیے ہیں یہ کتاب اگرچہ اب موجود نہیں ہے؛ لیکن اس میں درج واقعات کو بعد کے زمانوں کے ادیبوں نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے''(۲۸)

میگسھتینز کا ''سفر نامہ ہند'' سب سے قدیم سفر نامہ ہے۔ بیرونی ممالک سے مسلمانوں کے دورِ حکومت میں کئی سیاح ہندوستان آئے اور انھوں نے سفر نامے تحریر کیے۔ مغل بادشاہ بھی سیر و سیاحت کا بہت شوق رکھتے تھے۔ ان کے تزک جامع اور مکمل طور پر سفر نامے تو نہیں؛ لیکن سفر نامے کی روایت کا حصہ ضرور ہیں۔ کچھ بزرگانِ دین نے فارسی اور عربی زبان میں حج کے سفر نامے لکھے ہیں۔ لیکن اردو کا پہلا باقاعدہ اور مکمل سفر نامہ یوسف کمبل پوش کا سفر نامہ ''عجائباتِ فرنگ'' ہے۔ جسے یوسف کمبل پوش نے خود ''تاریخِ یوسفی'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔

یوسف خان لکھتے ہیں:

> ''چوں کہ اس کتاب میں سب اپنا حال گزر بیان تھا، اس لیے اس کا نام تاریخ یوسفی رکھا''(۲۹)

یوسف کمبل پوش کا یہ سفر نامہ اپنے بہترین اندازِ بیان، جدید اُسلوب، منظر نگاری، حقیقت نگاری کے باعث انیسویں صدی کی نثر کا ایک اچھا اور کامیاب نمونہ کے طور پر یہ سامنے آیا۔

ڈاکٹر عصمت ناز لکھتی ہیں:

**''اردو کے سفر ناموں میں یوسف کمبل پوش کا سفر نامہ ''عجائبات فرنگ'' کو قدیم ترین کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ فطری طور پر سفر کی پر خطر راہوں اور نت نئے تجربوں کو پسند کرتے تھے اور سفر کے لیے جو بھی مراحل تھے ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔ آپ نے اس ضمن میں انگریزی زبان بھی سیکھی تھی۔ تاریخی کتب سے معلومات بھی حاصل کی تھیں اور دوران سفر آپ پر مذہب، روایات، تہذیب وغیرہ کا اتنا رنگ نظر نہیں آتا بلکہ آپ نے کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ سفر کیا''**(۳۰)

اردو کے قدیم سفر ناموں میں نواب کریم خان کا سفر نامہ ''سیاحت نامہ'' بھی شامل ہے۔ یہ سفر نامہ لندن کی زندگی کے بارے میں ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ''سیاحت نامہ'' کا قلمی نسخہ دریافت کیا۔ ۱۸۵۳ء میں فدا حسین کا سفر نامہ ''تاریخِ افغانستان'' لکھا گیا۔ یہ اَدب میں کسی خاص اضافے کا باعث نہ بن سکا۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

**''میری رائے میں اس سفر نامے کا کینوس محدود ہے۔ اور یہ جنگی مکالمہ نگاری کا ایک غیر مرصع نمونہ نظر آتا ہے''**(۳۱)

نواب فتح علی خان قزلباش ۱۸۸۶ء میں فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے ارض حجاز میں گئے۔ اس کے بعد فرانس، اٹلی، انگلستان، سسلی اور بلغاریہ کی سیاحت کی اس کے بعد لندن گئے۔ متفرق ملکوں کی سیاحت کے بعد نواب فتح علی خان قزلباش نے سفر نامہ ''سیاحت فتح خانی'' لکھا۔ اس سفر نامے میں لندن کی عمارات، عجائب خانوں، چڑیا گھروں، نیشنل گیلریوں اور کتب خانوں کا تذکرہ موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

**''سفر نامہ سیاحت فتح خانی'' مجموعی طور پر اس ذہن کو سامنے لاتا ہے جو بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی والیان ریاست میں فروغ پا رہا تھا اور انگریزی اقتدار کو مضبوط کرنے میں معاون تھا''**(۳۲)

اس کے بعد مولوی عبد الخالق نے اپنے سفر نامے ''سیر برہما'' میں برما کے دینی و دنیوی اعتقادات اور مذہبی رسوم پر زیادہ روشنی ڈالی ہے۔ مولانا شبلی نے ۱۸۹۲ء کے وسط میں قسطنطنیہ، قاہرہ، بیروت اور بیت المقدس کی سیر کی اور پھر مولانا شبلی نے سفر نامہ ''روم و مصر و شام'' لکھا اور اس سفر نامے میں مولانا نے تاریخی مقامات، قدیم و جدید درس گاہوں کی حالت،

درس گاہوں میں طلبا کی تعداد اور کلاسوں میں پڑھائے جانے والے مضامین کے بارے میں لکھا۔ ۱۸۹۳ء میں نواب حامد علی خان نے جاپان، امریکا، انگلستان اور مصر کا سفر کیا۔ ان ممالک کی سیاحت کے بعد حامد علی نے ''سیر حامدی'' کے نام سے ایک اہم سفر نامہ لکھا۔

ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> **''سیرِ حامدی'' نواب محمد حامد علی خان کا ۱۸۹۳ء میں لکھا ہوا سفر نامہ ہے۔ اس میں سیلون، ہانگ کانگ، جاپان، امریکا و انگلستان، فرانس، جرمنی، یونان اور مصر کے بارے میں لکھا گیا ہے اور مشاہدہ اور مطالعہ دونوں لحاظ سے اچھا سفر نامہ ہے'' (۳۳)**

مولوی عبدالرحمان امرتسری نے ۱۸۴۸ء کو مصر، شام روم اور ترکی کی سیاحت کی۔ سیاحت کے بعد سفر نامہ ''بلاد اسلامیہ'' لکھا۔ اس سفر نامے میں ان ممالک کی تہذیب و ثقافت اور عوامی زندگی کی ایک جھلک دکھائی۔

''عجائباتِ فرنگ'' کے بعد اہم سفر نامہ ''سفیر اودھ'' مولوی محمد مسیح الدین نے لکھا۔ اس سفر نامے نے برطانیہ کے تمام حالات و واقعات اور پیش آنے والے معاملات کے بارے میں بیان کیا ہے۔ انگلستان میں پیش آنے والے معاملات اور برطانیہ کیطرف سے ہمدردی و خیر سگالی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

''مسافران لندن'' سر سید احمد خان کے سب سے اہم سفر نامے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ سر سید نے لندن کا سفر کیا، وہاں جا کر مرعوب ہونے کے بجائے اپنی قوم کی پستی اور ان کی برتری کا مشاہدہ کھلی آنکھ سے کیا پھر اپنے ہم وطنوں کے لیے ایسا لائحہ عمل تیار کیا جس سے مطلق العنان حکمرانوں سے نجات دلائی جا سکے۔ سر سید احمد خاں نے لندن کے مناظر کو ہمیشہ مقصد کی آنکھ سے دیکھا۔ چناں چہ ''مسافران لندن'' سر سید کا سفر نامہ بھی ہے اور قوم کو نوحہ بھی ہے۔ اس سلسلے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> **''بلاشبہ اس مشاہدے میں ان پر کبھی کبھی حیرت کی کیفیت بھی طاری ہوئی اور انہوں نے یورپ کے عجائبات اور تہذیبی خوبیوں کی تحسین بھی کی لیکن ایسا لمحہ جب بھی آتا سر سید کو اپنی زوال آمادہ قوم کے ذہنی افلاس تہذیبی پسماندگی اور علمی کم مائیگی کا خیال آ جاتا۔ ان کی مسرت گہری افسردگی میں تبدیل ہو جاتی۔ اس زاویے سے دیکھئے تو سر سید کا سفر نامہ قوم کا نوحہ ہے اور وہ لندن میں بھی آنسو بہاتے ہوئے نظر آتے ہیں'' (۳۴)**

سر سید احمد خان نے ''مسافران لندن'' کا مسودہ لندن میں ہی مرتب کر لیا تھا۔ وطن واپسی پر رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے اجرا کے بعد اس رسالے میں شائع کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف "سیرِ ایران" اردو ادب میں ایک خاص

مقام رکھتی ہے۔ یہ سفر نامہ اُنھوں نے سفرِ ایران کے دوران لکھا اور یہ ان کے ایک لیکچر اور کچھ وضاحتوں پر مشتمل تھا۔ موصوف نے سفر سے واپسی کے بعد لاہور میں ایک اجلاس میں اسے بطور لیکچر پیش کیا۔ آغا محمد طاہر مولانا کے پوتے نے یہ سفر نامہ مرتب کر کے شائع کروایا۔ محمد حسین آزاد کا دوسرا سفر نامہ ''انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت'' ان کی متفرق تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے۔ نواب محمد عمر خان نے عمر کا زیادہ حصہ سیر و سیاحت میں ہی گزارا اور انہوں نے "آئینہ فرنگ زاد غریب"، "ارژنگ حسین" اور سفر نامہ "رئیس" لکھے۔ اس کے بعد بابو اما شنکر کا ۱۸۸۶ء کے ایام اور برطانیہ کے سماجی حالات پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سفر نامے میں بابو اما شنکر نے معاشرتی لین دین اور چوری چکاری کے واقعہ بیان کیے۔

انیسویں صدی میں مولانا جعفر تھانیسری کا سفر نامہ ''کالا پانی'' بھی ایک اہم سفر نامہ ہے۔ یہ خود نوشت سوانح ہے۔ ۱۸۹۹ء میں ڈاکٹر شاہ علی سبز واری نے براعظم افریقہ کا سفر کیا اور اس سفر کے دوران انہوں نے ''خوف ناک دنیا'' کے نام سے سفر نامہ لکھا جو مختلف حیرت انگیز واقعات پر ہے۔

مجموعی طور پر انیسویں صدی کے اُردو سفر ناموں کا جائزہ لیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو سفر ناموں میں یک بیک اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جس کی اہم وجہ یہ تھی عہدِ سرسید میں انسانوں کی فکر میں تبدیلی آئی۔ جدید ایجادات اور ٹیکنالوجی نے سفر کو بہت آسان بنا دیا۔ دوسری اہم وجہ یہ تھی کہ لوگوں میں سفر کرنے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ دوسرے ملکوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔ ابتدائی دور کے اُردو سفر نامے داستانوی رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں کیوں کہ اُردو زبان پر فارسیت کا غلبہ تھا اور اس دور میں اُردو نثر کا رجحان مشکل پسندی کی طرف تھا۔ انیسویں صدی میں لکھے جانے والے سفر ناموں کا اگر ہم تقابلی جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ سفر ناموں میں بنیادی فرق جو آیا ہے وہ ان کی زبان و بیان اور اُسلوب کا فرق ہے۔ پہلے پہل سفر ناموں کی زبان مسجع اور مقفیٰ تھی۔ زیادہ تر عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ جدید اُردو میں ان الفاظ کا تلفظ بدل گیا ہے۔ مثلاً کبھو (کبھی)، کسو (کسی)، سو (سے) وغیرہ اور بہت سے ایسے الفاظ تھے جو عام طور پر انیسویں صدی میں استعمال ہوتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اُردو میں آسان اور سادہ نثر لکھی جانے لگی۔ اس نثر کا اثر سفر ناموں میں بھی صاف نظر آنے لگا۔ اگر اس وقت کے سفر ناموں کی نثر اور عام نثر کو دیکھا جائے تو عام نثر کی نسبت سفر ناموں کی نثر زیادہ آسان تھی۔ اسلوب کی اہم خاصیت مقفیٰ و مسجع نثر لکھنا سمجھی جاتی تھی۔ اس لیے اس دور کے سفر نامے اسی اسلوب میں نظر آتے ہیں۔ مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں اردو زبان کو ارتقائی منزل کی طرف گامزن کرنے میں ان سفر ناموں کا اہم کردار رہا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرسید احمد خان، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی نے اردو سفر نامے کی بنیاد کو مستحکم کر دیا تھا۔

بیسویں صدی کے سفر ناموں کے فن میں بہت سی تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ ان سفر ناموں میں یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں آزادی کی کوشش شروع ہو چکی تھی۔ لوگ مغربی علوم سے دور بھاگتے تھے اور مغربی

تہذیب کو نفرت کی نظر سے دیکھے تھے؛ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں انگریزی ادب کی راہ ہموار ہونا شروع ہوئی۔ سیاسی، راہ نماؤں اور ادیبوں و شعرا وغیرہ کو اس بات کو علم ہو گیا کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ صرف نفرت سے حل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے بیسویں صدی کے سفر ناموں میں سیاسی، تعلیمی، فضا قائم کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ جس سے لوگوں میں مثبت تبدیلی آئیں۔ اس دور میں بہت سی تعداد میں سفر نامے لکھے گئے اور سفر ناموں میں نکھار پیدا ہوا۔ لیکن بہت سے ایسے سفر نامے بھی ہیں جو ادب میں اپنی جگہ نہ بنا سکے اور ادب میں جو سفر نامے جگہ نہ بنا سکے، انھوں نے قوم و ملک کی آزادی اور ترقی کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد سیر و سیاحت میں تیزی آئی اور اس دور کے سفر نامہ نگاروں نے دنیا کے ہر زاویے سے مشاہدہ حاصل کیا۔ آزادی کے بعد ابتدائی دور کے سفر ناموں میں مغرب کی چکا چوند ترقی نے انھیں بہت پیچھے چھوڑ دیا اور مشرقی سیاحت حاوی رہی۔ اس دور میں سفر ناموں کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں؛ کہیں ڈائری کی شکل میں، کہیں روزنامچے کی شکل میں، کہیں خطوط کی شکل میں، کہیں رپورتاژ سے نظر ملاتا ہے اور کہیں مزاحیہ انداز لیے ہوئے ہے۔

بیسویں صدی میں جب آمد و رفت کے وسائل میں اضافہ ہوا اور کم سے کم وقت میں مختلف مقامات کا ہوائی سفر ہو گیا تو سفر نامے بھی خوب لکھے جانے لگے۔ اس دوران مذہبی، ادبی، سیاسی، جغرافیائی، تاریخی اور سوانحی سفر نامے کثرت سے لکھے گئے۔ بیسویں صدی میں سفر نامے نے بہت ترقی کی ہے۔

اس صدی میں لکھے جانے الے اہم سفر ناموں میں محبوب عالم کے سفر نامے بھی شامل ہیں۔ منشی محبوب عالم نے بھی اس دور میں دو سفر نامے لکھے۔ انہوں نے فرانس، انگلستان، روم، مصر اور شام کی سیاحت کی اور اس سفر کے تمام حالات، واقعات اور مشاہدات کو ''سفر نامہ یورپ'' میں بیان کیا۔ ان کا دوسرا سفر نامہ ''سفر نامہ بغداد'' ہے۔ جو ایک سرکاری دورے کی یادگار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ طویل ترین سفر ناموں میں ''سفر نامہ یورپ'' کا بھی شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسین نے جاپان کی معاشرتی زندگی کی جھلک اپنے سفر نامے ''۱۹۰۷ کا جاپان'' میں دکھائی۔ جو قاری کے لیے دل چسپی کا وافر سامان مہیا کرتی ہے۔ نازلی رفیعہ سلطان بیگم نے سفر یورپ کے دوران اپنے بزرگوں کو بہت سے خطوط ہندوستان میں لکھے۔ موصوفہ یورپ کی ترقی سے بے حد متاثر تھیں اور نازلی رفعیہ سلطان بیگم کا سفر نامہ ''سیر یورپ'' اُن خطوط پر مشتمل ہے۔ محمد حمید اللہ خان سر بلند جنگ کا ''سفر نامہ قسطنطنیہ'' زندگی کے متفرق رنگوں کا حل پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ خواجہ غلام الثقلین نے روس، قسطنطنیہ، عراق، عرب، ایران اور مکہ مدینہ کا سفر کیا اور سفر نامہ ''روزنامچہ سیاحت'' پر سفر کی روداد بیان کی۔ بیسویں صدی میں جدید علوم کو پھیلانے میں شیخ عبد القادر نے ''مخزن'' کے ذریعے اہم کردار ادا کیا۔ موصوف کے دو سفر نامے منظرِ عام پر آئے۔ ایک ترکی کی سیاحت پر مبنی سفر نامہ ''مقامِ خلافت'' ہے اور دوسرا ''سیاحت نامہ یورپ'' ہے۔ ۱۹۰۲ء میں محمد الدین فوق نے اپنا پہلا سفر نامہ ''سفر نامہ کشمیر'' کے نام سے رقم کیا۔ جس میں کشمیر کے فرحت بخش نظاروں کا نقشہ کھینچا گیا

ہے۔ ۱۹۱۷ء میں ان کا دوسرا سفر نامہ ''سفر نامہ ڈھاکہ'' منظر عام پر آیا جو کشمیری میگزین لاہور میں طبع ہوا۔ ان سفر ناموں کے علاوہ ''راہنمائے کشمیر'' ۱۹۳۳ء اور ''شاہی سیر کشمیر'' (طبع دوم: ۱۹۳۰ء) بھی سفر ناموں کی ذیل میں آتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے بڑا معتبر نام خواجہ حسن نظامی کا ہے۔ ان کا سفر نامہ ''سفر نامہ مصر فلسطین و شام'' ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۹۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کا ایک اور سفر نامہ ''سفر نامہ پاکستان'' ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ مولانا عبداللہ سندھی کا سفر نامہ ''کابل میں سات سال'' انگریزی دور میں اپنے علماء اکرام اور دانش وروں کی مجبوریوں کی کہانیاں سناتا نظر آتا ہے۔ ایم شجاع منعمی نے ۱۹۳۰ء میں مقدس مقامات کے ساتھ ساتھ شیراز، تہران، اصفہان، قم اور بندر پہلو کا سفر کیا اور مصنف کا سفر نامہ ایران جو کہ ''کتابِ ایران'' کے نام سے شائع ہوا جو ایران کی مجلسی اور تہذیبی زندگی کا عکس ہے۔ یعقوب علی عرفانی نے اپنے سفر نامے ''مشاہدات عرفانی'' میں بلادِ اسلامیہ اور یورپ کی جھلک دکھائی ہے۔ سید سلیمان ندوی کا سفر نامہ ''سیر افغانستان'' تعلیمی نوعیت کے ایک سفر کی روئیداد ہے جو نادر شاہ کی دعوت پر مصنف نے کیا۔

اس سفر نامے کی خوبیاں گنواتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> **''سلیمان ندوی نے افغانستان کے کوچہ و بازار کی سیر نہیں کی؛ لیکن اُن کے سامنے افغانستان کے جغرافیے کی کھلی کتاب پڑی ہے اور وہ قاری کی انگلی پکڑ کر اسے ایک اہم مقام سے یوں گزارتے ہیں۔ جیسے وہ اور خود ی سفری راہنما ہوں اور قاری کو اپنے ساتھ ہی سفر کرا رہے ہوں''** (۳۵)

۱۹۶۹ء میں سید سلیمان نے مختلف شخصیات کو خط لکھے تھے اور اُن ہی خطوط سے مرتب کیا گیا سید صاحب کا دوسرا سفر نامہ بہ عنوان ''سفر نامہ یورپ'' ہے۔ ۱۹۷۴ء میں قاضی عبدالغفار کا سفر نامہ ''نقش فرنگ'' شائع ہوا یہ رومانی قسم کا سفر نامہ ہے۔ محمد علی قصوری نے ایک لمبا عرصہ افغانستان میں قیام کیا۔ وہاں پرنسپل کی خدمات انجام دی اور پھر لمبا عرصہ کابل میں قیام کرتے ہوئے مصنف نے اپنے مشاہدات کو اپنے سفر نامے ''مشاہدات کابل دیاغستان'' میں قلمبند کیا جو آپ بیتی کی طرز میں لکھا گیا۔ سفر نامہ کئی برسوں پر محیط ہے اور ایسے اختتام سفر کے بعد یادداشتوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفر نامہ ''سفرِ حجاز'' شائع ہوا۔ اس سفر نامے کے علاوہ ماجد کے سفر ناموں میں ''ڈھائی ہفتے پاکستان یا مبارک سفر''، ''سیاحت ماجدی یا گیارہ سفر'' اور ''تاثراتِ دکن'' بھی شامل ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے سفر یادگار میں مولانا غلام رسول مہر نے ''سفرِ حجاز'' لکھا۔ مولانا کا دوسرا سفر نامہ "سفر نامہ یورپ" ہے جس میں مصنف یورپ کی تہذیب و ثقافت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے تین سفر نامے ''ہندیاترا''، ''لبیک'' اور ''شاہراہ ریشم'' سامنے آئے۔ مفتی صاحب کا سفر نامہ ''ہندیاترا'' کی بڑی خوبی فلیش بیک کی تکنیک ہے۔ ماہر القادری نے مختلف ممالک کی سیاحت کی اور مشاہدات و تاثرات کو خطوط یا مضامین کی صورت اپنے ماہنامہ ''فاران'' میں چھاپتے رہے۔ محقق طالب ہاشمی جو ماہر القادری کے دوست تھے انھوں

نے سب تقریر کو کتابی صورت میں ''سیاحت نامہ'' کے نام سے شائع کروائی۔ اس سے پہلے ۱۹۵۴ء میں حج کے مقدس سفر کی تفصیلات مصنف نے ''کاروانِ حجاز'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیں۔ ''کاروانِ حجاز'' میں جذباتیت اور عقیدت کا عنصر بہت نمایاں ہے۔

۱۹۵۸ء میں پہلی بار محمود نظامی کا سفر نامہ ''نظر نامہ'' طبع ہوا۔ یہ سفر نامہ اردو سفر نامہ نگاری میں ایک منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ شگفتہ اسلوب اور واضح لفظ نظر قاری کو ایک نئے لطف سے آشنا کرتا ہے۔ آغا محمد اشرف کا سفر نامہ ''دیس سے باہر'' بھی اسی دور میں لکھا گیا سفر نامہ ہے۔ قدرت اللہ شہاب کے دو سفر نامے ''بنی اسرائیل'' (۱۹۴۰ء) اور ''تو ابھی راہ گزر میں ہے'' ۱۹۲۴ء کو منظرِ عام پر آئے۔ حکیم محمد سعید بھی بہت سے سفر نامے لکھ چکے ہیں۔ ''یورپ نامہ''، ''جرمنی نامہ''، ''ماہ و روز چار ملک ایک کہانی''، ''شب و روز''، ''کوریا کی کہانی''، ''ریگ رواں''، ''سوئٹزر لینڈ میں چند روز'' اور ''ایک مسافر چند ملک'' مشہور سفر نامے ہیں۔ ان کے تمام سفر ناموں میں معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔ ۱۹۷۴ء میں حافظ لدھیانوی کا سفر نامہ ''جمال حرمین'' چھپا ہے۔ محمد خالد اختر کے تین سفر نامے ''سواتی مہم''، ''کاغائی مہم'' اور ''دو سفر'' کے عنوانات سے سامنے آئے۔ محمد خالد اختر اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے اردو ادب میں اہمیت کے حامل ہیں۔ سفر نامہ ''نئی دیوار چین'' ابراہیم جلیس نے اس دور میں لکھا۔ اس سفر نامے میں مصنف نے چینی انقلاب کو ستایش کی نظروں سے دیکھا ہے۔

اے۔ حمید کے سفر نامہ جسکا پہلا عنوان ''امریکا میں پانچ سال'' اور دوسرا عنوان ''امریکا نو امریکا نو'' ہے۔ اس سفر نامے میں مصنف کی یہ خوبی وہ تلخ بات کو بھی قاری کے دل میں خوش اسلوبی اتار دیتے ہیں۔ اشفاق احمد افسانہ نگار کے ساتھ سفر نامہ نگار بھی ہیں۔ اشفاق احمد کے سفر ناموں میں ''سفرِ مینا''، ''خوابوں کا جزیرہ''، ''عرش مینار''، ''چمن کو دیا چیستان'' اور ''چچا سام کے ساتھ'' شامل ہیں۔ انتظار حسین کے سفر نامے ''نئے شہر پرانی بستیاں'' اور ''زمین اور فلک'' منظر عام پر آئے۔ جمیل الدین عالی نے بھی مختلف ممالک کی سیاحت کے بعد ''دنیا مرے آگے'' اور ''تماشا مرے آگے'' سفر نامے لکھے۔

اس دور کے لکھے ہوئے سفر ناموں میں بیگم اختر ریاض الدین کے دو سفر نامے ''سمندر پار'' اور ''پر دھنک پر قدم'' ذہانت و دانشمندی کی عمدہ مثال ہیں۔ ''سات سمندر'' دنیا کے چھ بڑے شہروں کا سفر نامہ ہے۔ ''حدیث دل'' عبداللہ ملک کا ایسا سفر نامہ ہے جیسے دل میں پڑھ کر دل میں محسوس کیا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا سفر نامہ ''جہاں دیگر''، افصل علوی کا سفر نامہ ''دیکھ لیا ایران''، رضا علی عابدی کے سفر نامے ''جرنیلی سڑک''، ''شیر دریا''، ''جہازی بھائی'' بھی اسی دور کے لکھے جانے والے سفر نامے ہیں۔ ممتاز احمد کا ''جہاں نما''، طفیل احمد جمالی کا سفر نامہ ''ماسکو''، الخیری کا ''مشرقی وسطی''، کوثر نیازی کا سفر نامہ ''ایک ہفتہ چین میں''، سید عبدالحسن ندوی کا ''کابل سے یرموک تک''، تاج محمد گنگاہ کا ''چین ہے تو چین

میں''، محمود شام کا سفر نامہ ''کتنا فریب کتنا دور''،اشفاق نقوی کا''الریاض کی سیر''، شفیع عقیل کا''سیر و سفر''،پرویز پرواز ی کا''سورج کے ساتھ ساتھ'' بھی موجودہ دور میں لکھے جانے والے سفر نامے ہیں۔

بیسویں صدی میں اسلم کمال کا''سو کر وڑ''،ڈاکٹر محمد اجمل کا سفر نامہ ''چند روز فرانس میں''،اسعد گیلانی کا''سفر نامہ ایران''، محمد اختر ممو نکا''سفر نامہ پیرس ۲۰۵ کلومیٹر''، محمد کاظم کا سفر نامہ ''مغربی ایک برس''،ڈاکٹر اعجاز راہی ''راستے میں شام''، ذوالفقار احمد تابش کا سفر نامہ ''جوار بھاٹا''،ابو سعید قریشی کا سفر نامہ '' کینگر و کے دیس میں''، قمر عباسی کا سفر نامہ ''لندن لندن'' اور جمیل یوسف کا سفر نامہ ''جل پری کے دیس میں'' سفر نامے لکھے گئے ہیں۔ بیسویں صدی میں سفر نامے اتنی تعداد میں لکھے گئے ہیں ان کی مکمل صراحت یہاں ممکن نہیں ہے۔

بیسویں صدی کے بعد جب ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوتے ہیں تو جدید انقلابات نئی دنیا کے چیلنجز اور بہت سے ایسے انقلابی رویے جو ادب میں سیاسی، معاشی،ادبی اور تعلیمی حوالے سے ہیں نئے مسائل اور نئے امکانات کی طرف ہم نگاہ دوڑاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں منظر نامے تبدیل ہوئے وہاں ادب کا منظر نامہ بھی ہمیں جدت کے ساتھ مزین دکھائی دیتا ہے۔اس میں ادبی حوالے سے جہاں تکنیکی،اُسلوبیاتی حوالے سے تبدیلیاں آئیں اور مختلف نئے منظر ہمارے سامنے واضح ہوئے۔ وہاں ہم سفر نامے کی صنف میں بھی دیکھتے ہیں کہ گزشتہ صدیوں میں لکھے گئے سفر ناموں کے مقابلے میں اکیسویں صدی میں جو بنیادی تبدیلی دکھائی دیتی ہے وہ جدت کے حوالے سے تھی۔ جدید دنیا اور عصرِ حاضر کے جدید تقاضوں کے مطابق سفر نامے میں بھی ٹیکنالوجی سے منسلک دیگر چیزوں اور نئے دنیاؤں کی سیر اور نئے دنیاؤں میں ہونے والے بڑے انقلابات، مثبت اور منفی تبدیلیاں دونوں حوالوں سے ہمارے سامنے دکھائی دیتی ہیں۔ گزشتہ بیسویں صدی کا سفر نامہ،سفر نامے کے منظر نامے پر بڑا مضبوط اور متنوع اہمیت کا حامل ہے۔اس سے بھی ہمیں ایک قدم آگے دکھائی دے رہا ہے۔

بیسویں صدی کے سفر ناموں میں تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی پس منظر کا بیان زیادہ دکھائی دیتا ہے تو اکیسویں صدی میں ہمیں موضوعات اس سے بھی زیادہ پھیلے ہوئے اور متنوع دکھائی دیتے ہیں جن میں ہمیں جدت کا احساس ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سیاح جو خارجی شواہد سے ایک مختلف طریقے سے تجربہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔اکیسویں صدی میں موضوعاتی حوالے سے مزید جدت آ گئی ہے۔ اس صدی میں سفر نامہ نگاری میں تخلیقیت کے عناصر مزید در آئے ہیں۔ اکیسویں صدی میں جو اہم سفر نامے لکھے گئے ہیں،اُن میں سے اُردو اَدب کا معتبر نام امجد ثاقب ہے۔انکا سفر نامہ ''گوتم کے دیس میں'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ جس کی وضاحت مشہور ادیب مستنصر حسین تارڑ نے کتاب کے دیباچے میں یوں کی ہے:

**''امجد ثاقب بدھ کی سر زمین گندھار سے نکلے اور اس کی جنم بھومی تک پہنچے تو گویا سچ سے سچ کی جانب سفر کیا''**(۶۳)

دورِ جدید میں سفر نامہ نگاروں میں عطاالحق قاسمی کا نام بہت نمایاں ہے۔ ''شوق آوارگی''، ''دنیا خوبصورت ہے''، ''دلی دور است'' ان کے مقبول سفر نامے ہیں۔ جمیل الدین عالی نے اپنے سفر ناموں ''دنیا میرے آگے''، ''تماشہ میرے آگے'' اور ''آئی لینڈ'' میں مختلف ممالک کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اُردو ادب میں ایک معتبر نام ہے۔ سفر نامے لکھنے میں آپ کا خاصہ میلان ہے بلکہ یہ صنف آپ کی پہچان بن گئی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے بہت سے سفر نامے لکھے۔ ان کے سفر ناموں میں ''برفیلی بلندیاں''، ''تتلی پیکنگ کی''، ''چترال داستان''، ''خانہ بدوش''، ''دیوسائی''، ''رتی گلی''، ''سفر شمال کے''، ''سنو لیک''، ''سنہری اُلو کا شہر''، ''شمشال بے مثل''، ''کالاش''، ''کے ٹو کہانی''، ''نانگا پربت''، ''نکلے تری تلاش میں''، ''نیپال نگری''، ''ہنزہ داستان'' اور ''یاک سرائے''۔ آصف اقبال کا سفر نامہ ''بحیرہ روم کے کنارے'' اٹلی، سپین اور فرانس کی سیاحت پر مشتمل ہے۔ امیر النساء سفر نامہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ مغربی ایشیا کے ممالک اور مقدس مقامات کی سیاحت کے بعد سفر نامہ بہ عنوان ''ارض مقدس میں چند روز'' لکھا۔ زہرہ بتول نے اپنے شوہر کے ساتھ حجاز وایران کا سفر کیا تھا اور پھر سفر نامہ ''حجاز وایران'' لکھا؛ لیکن اس سفر نامے کی اشاعت سے قبل ہی جہانِ فانی کو الوداع کہہ دیا۔ صغریٰ مہدی کا سفر نامہ ''سیر کر دنیا کی غافل'' میں انگلستان کے سفر کے احوال بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر احمد نصیر کا سفر نامہ ''سفر پارے'' سید اختر جعفری کا سفر نامہ ''ترکی''، امجد اسلام امجد کے سفر نامے ''چلو جاپان چلتے ہیں''، ''جس دیس میں گنگا بہتی ہے''، ''سات دن''، انور زاہدی کا سفر نامہ ''دنیا کہیں جسے''، ڈاکٹر آصف محمود کا ''سنگاپور سے جاپان''، تابندہ ضیاء کا ''شوقِ سیاحت''، ثریا حفیظ الرحمن کا ''صنم کدہ ہند''، ''وادی لفگاراں''، جمیل یوسف کا ''جل پری کے دیس میں''، ذبیح اللہ بلگن کا ''کوہ قاف کی وادیوں میں''، رفعت علی سید کا ''امریکا کتنا دور کتنا پاس''، سبوحہ خان کا سفر نامہ ''اپنا دیس اپنے لوگ''، آغا سلمان باقر کا سفر نامہ ''دھاکا لیک، سوات''، سلمیٰ اعوان کا سفر نامہ ''اٹلی ہے دیکھنے کی چیز''، ''استنبول کہ عالم میں منتخب''، ''روس کی ایک جھلک''، ''سندر چترال''، ''سیون کے ساحل اور ہند کے میدان'' اور ''شام امن سے جنگ تک''، ''عراق اشک بار ہیں ہم'' اور ''میرا گلگت وہنزہ'' اور ''یہ میرا بلتستان''، شاہ محمد مسری کا سفر نامہ ''چین آشنائی'' اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے بہترین سفر نامے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شگفتہ فراز ''ستارے سفر کے''، سید ضمیر جعفری ''کنگرو دیس میں''، الطاف شیخ ''ایران کے دن''، ''جاپان کے دن''، ''جہاز چلانے کے دن''، ''چلو ہندوستان'' اور ''میں چلا ممباسا''، عامر بن علی کے سفر نامے "جہاں گردی"، "نگر نگر اک نظر"، "آج کا جاپان" اور "مشرق کی طرف دیکھ"، عبدالمجید خاں کا ''بستی بستی پھرا مسافر''، عرفان الحق کا ''کے۔ ٹو کہوں کہ چھگوڑی''، سردار عظیم اللہ خاں میو ''دیس سفر نامہ انڈیا''، عمران الحق چوہان کا ''بستی بستی پربت پربت''، قمر علی عباسی ''عمان کے مہمان''، کاشف مصطفیٰ کا ''دیوار گریہ کے آس پاس''، محمد احسن کا ''دیوسائی میں ایک رات''، ڈاکٹر محمد اقبال ہما کا ''سکردو میں پونم''، ''قدم قدم بہار ہے''، ''نانگا پربت کے جھرنوں میں''، محمد اکبر خان کا ''نیشیاپور سے کوالالمپور''، محمد زوہیب

صدیقی (بوسنیا) کا ''ایک آوارہ گرد کی نظر سے''، محمد سعید جاوید کا ''مصریات''، جسٹس خواجہ محمد شریف کا ''زبان یار من ترکی''، ''سفر بذریعہ دوستی بس''، ''شاخِ نازک کے آشیانے''، ''کچھ رعنائیاں''، ''گراں خواب چینی'' اور ''وادی جنت نظر کشمیر''، ڈاکٹر محمد منیر مرزا کا ''لداخ سے وادی مہران تک''، ڈاکٹر محمد منیر مرزا کا ''پھول دیو سائی کے''، محمود شام کا ''ترقی کرتا دشمن'' اور ''چند سفر ہندوستان کے''، ڈاکٹر مرزا مد ثر بیگ کا ''سورج، ساحل اور سمندر''، ملک اشفاق کا ''تا بخاک کاشغر''، ''سند باد کے تعاقب میں''، وحید قصیر کا سفر نامہ ''جزائر ہوائی اور گناہوں کے شہر کی رنگینیاں''، یعقوب نظامی کا ''اندلس منظر بہ منظر''، ''پیغمبروں کی سرزمین''، ''مغرب کی وادیوں میں''، مقدس سرزمین اور ''یورپ یورپ ہے'' اس دور کے بہترین لکھے جانے والے سفر نامے ہیں۔

اکیسویں صدی میں متعدد خوب صورت اور معیاری سفر نامے شائع ہوئے ہیں۔ قاضی مشتاق احمد کا ''آٹھ سفر نامے''، نگار عظیم کا ''گرد آوار گی''، علی احمد فاطمی کا ''جرمنی میں دس روز''، ڈاکٹر نذیر فتح پوری کا ''پونے سے رانچی کا سفر''، اسلم بدر کا ''آثارِ وانوار''، ڈاکٹر رفعیہ سلیم کا ''لالی چودھری کے سفر نامے''، فاروق سید کا ''ہم بھی ہو آئے کراچی''، عارف نقوی کا ''راہِ الفت میں گامزن'' بھی اسی دور میں لکھے گئے سفر نامے ہیں۔ اکیسویں صدی کے سفر ناموں کی زبان میں تخلیقیت کا رنگ زیادہ ہے۔ سفر ناموں میں واضح تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اب سفر ناموں میں افسانے جیسا لطف بھی آنے لگا ہے۔ تحیر اور تجسس تو سفر نامے کی خوبی رہی ہے؛ لیکن اب یہ خوبی تخلیقیت کے رنگ میں ہمارے سامنے آرہی ہے۔ اس سے سفر نامہ، سفر نامہ بھی رہتا ہے اور افسانہ بھی لگتا ہے۔

دورِ جدید میں بہت سے سیاحوں اور ادیبوں نے سفری اَدب کا ایک نیا رنگ و آہنگ دیا اور سفر نامے کے بیان کو تخلیقی اُسلوب میں پیش کیا اور سفر نامے کی زبان کو اَدب کی زبان بنایا۔ اکیسویں صدی کے ان ادیبوں کے سفر نامے تشبیہات و استعارات اور اشعار کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ دورِ جدید میں سفر نامے کے معنی پر کم اور الفاظ پر زیادہ زور دیا گیا ہے تا کہ قاری لفظوں کو محسوس کر کے نئی اَدبی لذتوں سے محفوظ ہو سکیں۔ سفر نامہ اُردو اَدب میں ایک اہم مقام حاصل کر چکا ہے اور بہت کم وقت میں اُردو سفر نامے نے بہت سی منزلیں طے کر لی ہیں۔

جب دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کے باعث سکڑ کر ایک عالمی گاؤں میں بدل چکی ہے اور ذرائع کی ترقی کے باعث دنیا میں کسی جگہ کے بارے میں معلومات کا حصول آسان ہے جس کی وجہ سے اکیسویں صدی کے سفر نامے متنوع دکھائی دیتے ہیں۔ جدید سفر نامے کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ خارجی حقائق اور مشاہدات کی نسبت تجربات اور داخلی تاثرات سے زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ جدید سفر نامے بلحاظ اسلوب، طنز و مزاح، افسانوی طرز، زبان و بیان کی چاشنی اور سفر نامہ نگار کی قوتِ باصرہ سے عبارت ہے۔ جدید سفر نامہ نگار حقائق کو اس طرح خوشگوار پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ قارئین سفر نامے کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو میں سفر نامہ نگاری کی جو روایت شروع ہوئی تھی آج اس نے ایک طویل سفر طے کر لیا ہے۔اُردو اَدب کے سفر ناموں میں وہ تمام فنی خصوصیات موجود ہیں جو دوسری زبانوں کے سفر ناموں میں پائی جاتی ہیں۔اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ سفر نامہ جس راہ پر گامزن ہے آنے والے دنوں میں سفر نامہ نگاری کے فن میں مزید ترقی اور عروج کے امکانات روشن ہیں۔ ہمارے دورِ جدید کے ادیبوں اور سیاحوں نے اس صنف اَدب کو نئی زندگی عطا کی ہے اور اپنی محنتوں،مشاہدوں اور تجربوں سے سفر ناموں کی راہوں کو جگمگا دیا ہے۔سفر ناموں کے مطالعہ سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اُردو میں جو سفر نامے لکھے گئے وہ اپنے مواد اور معلومات کے اعتبار سے بہت اہم ہیں۔اس سے یہ بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سفر ناموں کا مقصد علمی،تاریخی، مذہبی تھا۔ یہ صرف شوق میں نہیں لکھے گئے حالانکہ آج ملکوں کے حالات میں بہت زیادہ فرق کے باوجود یہ سفر نامے آج بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں اور آنے والے وقت میں بھی ان سے تاریخ تہذیب و تمدن اور جغرافیہ وغیرہ کے مطالعہ میں مدد ملتی رہے گی۔

# حوالہ جات


۱۔انور سدید،اردو ادب میں سفر نامہ،لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۸۷ء، ص ۸۴

۲۔القرآن :البقرہ،تاج کمپنی لمیٹڈ،لاہور: ص ۲۸

۳۔القرآن القریم،سورۃ العنکوبت،آیت ۲۰

۴۔وارث سرہندی، علمی اردو لغت،لاہور: علمی کتب خانہ،س۔ن،ص ۲۱۹

۵۔سید شہاب الدین دسنوی،جامع اُردو لغت،مرتب: فہمیدہ بیگم،جہلم: بک کارنر شوروم،س۔ن،ص ۹۸۵

۶۔سید احمد دہلوی، مولوی،فرہنگِ آصفیہ، جلد سوم،لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۲ء،ص ۸۰

۷۔فیروز الدین،الحاج،فیروز اللغات اُردو جامع،لاہور: فیروز سنز، بارِ اول ۲۰۰۵ء،ص ۶۴۲

۸۔قبول بیگ بدخشانی (مرتب)،فیروز اللغات،فارسی—اُردو،لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ،۲۰۰۴ء،ص ۴۶۵

9- Oxford Advanced Learner Dictionary P: 64

10-Encyclopedia Word Dictionary larnlyn Vol: 23, P: 1169

11-Encyclopedia Word Dictionary larnlyn Vol: 23, P: 1169

۱۲۔انور سدید،ڈاکٹر،اُردو میں سفر نامہ،لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکادمی،س۔ن،ص ۴۷

۱۳۔مرزا حامد بیگ،ڈاکٹر،اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ،س۔ن،ص ۱۰ تا ۱۱

۱۴۔قدسیہ قریشی،ڈاکٹر،اُردو سفر نامے انیسویں صدی میں،دہلی: مکتبہ جامع لمیٹڈ،۱۹۷۸ء،ص ۴۲

۱۵۔اَدبی پروگرام رات گئے،میزان وصی شاہ،پی ٹی وی،لاہور: ۱۲/اپریل ۲۰۰۴ء

۱۶۔خالد محمود،اُردو اَدب میں سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۲۰۱۱ء،ص ۶۳

۱۷۔خالد محمود،ڈاکٹر،اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی: دریا گنج ۱۹۹۵ء،ص ۲۲

۱۸۔رفیع الدین ہاشمی،اصنافِ اَدب،لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء،ص ۸۸۱

۱۹۔نفیسہ حق،سفر نامہ فن اور جواز، مشمولہ،ساماہی الذبیر،سفر نامہ نمبر،شمارہ ۳۶ تا ۳۷ بہاول پور: اُردو اکادمی، ۱۹۹۸ء ص ۶۶

۲۰۔آغا سہیل،ڈاکٹر،نئے ہندوستان کا بڑھا ہاتھ، مشمولہ،زرد پتوں کی بہار، لکھنو: اکادمی،۱۹۸۲ء،ص ۷

۲۱۔غلام عباس وڑائچ،پروفیسر، مشرق میں مغرب،اسلام آباد: بزمِ اکبر،۱۹۹۸ء،ص ۷

۲۲۔غفور شاہ قاسم،پاکستانی شناخت کی نصب صدی،راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز،۲۰۰۰ء،ص ۵۲۷

۲۳۔ رحمٰن مذنب، مقدمہ، مشمولہ، اُردو اَدب میں سفر نامہ، ص ۴۱

۲۴۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، ج ۴، سورۃ نوح، پارہ ۹۲، لاہور: ترجمان القرآن، ص ۱۰۱ تا ۱۰۲

۲۵۔ خالد محمود، اُردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص ۶۸

۲۶۔ تاراچند، ڈاکٹر، تمدن سندھ پر اسلامی اثرات، الہ آباد: ۱۹۴۶ء، ص ۴

۲۷۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اُردو سفر نامے انیسویں صدی میں، نئی دہلی: جامعہ نگر، فروری ۱۹۸۷ء، ص ۸۳

۲۸۔ ایضاً، ص ۳۷

۲۹۔ سعید احمد، آزادی کے بعد اُردو سفر نامہ، دہلی: مرثیہ پبلی کیشنز، ۱۹۷۲ء، ص ۴

۳۰۔ یوسف خان کمبل پوش، عجائباتِ فرنگ (تاریخِ یوسفی)، لکھنو: مطبع نول کشور، ۱۸۳۷ء، ص ۷

۳۱۔ عصمت ناز، ڈاکٹر، سفر ناموں کی تاریخ و تدوین، سہ ماہی معاصر، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۰ء، شمارہ ۳۰۴، ص ۳۷۲

۳۲۔ انور سدید، اُردو اَدب میں سفر نامہ، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء، ص ۶۱۱

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۳۴۔ ایضاً، ص، ۱۹۰ تا ۱۹۱

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۵۵

۳۷۔ امجد ثاقب، گوتم کے دیس میں، دیباچہ، سچ کی تلاش، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء، ص ۲۰

باب دوم:

# عامر بن علی: احوال و آثار

عامر بن علی اردو ادب میں معتبر مقام رکھتے ہیں۔ اردو ادب کے حوالے سے ان کی خدمات لائقِ تحسین ہیں۔ عامر بن علی یکم جنوری ۱۹۸۷ء کو جنوبی پنجاب کی تحصیل میاں چنوں میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام رانا عامر حسین ہے اور قلمی نام عامر بن علی ہے۔ یہ نام انہوں نے اس وقت اختیار کیا جب کالج کے فرسٹ ائیر میں ادبی میگزین کے سب ایڈیٹر مقرر کیے گئے تھے۔ آپ کے والد کا نام چودھری محمد علی ہے۔ آپ کی والدہ ایک نیک صفت اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ انہوں نے گلی محلے کے بچے بچیوں کو فی سبیل اللہ قرآن پاک کی تعلیم دی۔ آپ کی والدہ محترمہ ۱۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو وفات پا گئیں۔ ان کی وفات کے بعد بھی قرآنی درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ عامر بن علی اس حوالے سے بتاتے ہیں:

> **''میری والدہ محترمہ کی وفات ۱۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ہوئی۔ ان کے بعد بھی ہم نے ان کے مشن کو جاری رکھتے ہوئے ''راوی اسلامک سنٹر'' کے نام سے ادارہ چلا رہے ہیں''**(۱)

عامر بن علی چار بھائی اور پانچ بہنیں ہیں۔ آپ بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ آپ کے گھرانے کا سیاست کے ساتھ گہرا رشتہ رہا۔ عامر بن علی کے بڑے بھائی مسلسل تین بار میاں چنوں پارلیمان کے رکن منتخب ہوئے۔ عامر بن علی ۲۰۰۰ء میں اپنی والدہ محترمہ کی مرضی سے خالہ کی بیٹی کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ خدا نے انہیں تین بیٹوں سے نوازا جن کے نام حسنین علی، محمد سلیمان علی اور عمار علی ہیں۔

عامر بن علی نے ابتدائی تعلیم میاں چنوں سے حاصل کی۔ آپ نے میٹرک کا امتحان ملتان بورڈ سے امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ جس کی بنیاد پر گھر والوں نے انہیں ڈاکٹر بنانے کا فیصلہ کیا۔ آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے میاں چنوں سے لاہور آ گئے اور گورنمنٹ کالج آف سائنس F.Sc میں داخلہ لیا۔ فرسٹ ائیر میں داخلے کے چند ہی دنوں بعد گورنمنٹ کالج آف سائنس لاہور کے ادبی پرچے ''دبستان'' کے نائب مدیر بنے۔ اس حوالے سے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

> **''میں سمجھتا ہوں کہ کالج کے میگزین کا نائب مدیر بننا، سے میرے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر علی محمد خان جو کہ بلند پایہ ادیب ہیں۔ ''دبستان'' کے انچارج تھے۔ ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ علاوہ ازیں ''مجلس اقبال'' کا جنرل سیکرٹری بھی منتخب ہوا۔ جب مجھے سرکاری میڈیکل کالج میں داخلے کے نمبر نہ ملے تو میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا گورنمنٹ کالج لاہور جو کہ اب یونیورسٹی ہے یہاں بہت سے سینئر ادیبوں سے سیکھنے کا موقع ملا''**(۲)

اس طرح عامر بن علی کا ادبی سفر تو انٹر سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ آپ نے مختلف ادبی میگزین کے ایڈیٹوریل بورڈز میں اپنی خدمات سرانجام دیں اور تعلیم کے دوران ہی کتابوں کی اشاعت ہونے لگی۔ عامر بن علی اس حوالے سے تفصیل کچھ یوں بتاتے ہیں:

> ''گریجویشن کا طالب علم تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور کے نیو ہاسٹل میں مقیم تھا۔ جن دنوں میں نے اپنا شعری مجموعہ ''یاد نہ آئے کوئی'' ترتیب دیا۔ اس کی اشاعت ۱۹۹۸ء میں ہوئی جب میں MBA بڑھ رہا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی اگلا شعری مجموعہ ''سرگوشیاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ اب تک چار شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ پڑھائی مکمل کرتے ہی ''ماہنامہ ارژنگ'' کے نام سے ایک ادبی پرچہ دوستوں کے ساتھ مل کر شائع کرنا شروع کیا جو کہ ۱۹ویں سال میں ہے۔ اسی سلسلے میں مختلف مشاہیر کے انٹرویو کیے وہ ''گفتگو'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ لاطینی امریکہ میں قیام کے سبب مجھے ہسپانوی زبان پر بھی دسترس حاصل ہوئی۔ میں نے نوبل انعام یافتہ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی شاعری کا ہسپانوی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جو کہ ''محبت کے دو رنگ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ دو سفر نامے ''آج کا جاپان'' اور ''جہاں گردی'' کے عنوان سے شائع ہوئے اور تیسرا ''گرد سفر'' زیر طبع ہے۔ اخباری کالموں کا مجموعہ ''مکتوبِ جاپان'' بھی زیر ترتیب ہے۔ باقی کچھ جاپانی شعراء کے تراجم کر رہا ہوں''(۳)

اس کے بعد عامر بن علی کا سفر نامہ ''نگر نگر اک نظر'' اور ''مشرق کی طرف دیکھ'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

عامر بن علی کے بڑے بھائی بیرون ملک میں مقیم تھے اور جاپانی گاڑیوں کی ایکسپورٹ کے کاروبار سے وابستہ تھے۔ عامر بن علی نے ایم۔بی۔اے مکمل کرنے کے بعد چند ماہ بعد ہی اپنے بھائی کا کاروبار جوائن کر لیا۔ کاروبار کے سلسلے میں سے سب پہلے لاطینی امریکہ گئے پھر چلی اور بعد میں امریکہ آ گئے۔ کاروبار کے سلسلے میں مختلف ممالک کا سفر کرتے رہے لیکن زیادہ وقت جاپان میں گزارا۔

# عامر بن علی کی مطبوعہ تصانیف

عامر بن علی کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

## شعری مجموعے:

۱۔ یاد نہ آئے کوئی　　　۱۹۹۸ء

۲۔ چلو اقرار کرتے ہیں　　　اشاعت دوم ۲۰۰۴ء

۳۔ سرگوشیاں　　　اشاعت پنجم ۲۰۱۰ء

۴۔ محبت چھو گئی دل کو　　　اشاعت سوم ۲۰۱۱ء

## انٹرویو:

۱۔ گفتگو　　　اشاعت اول ۲۰۱۲ء

۲۔ روبرو　　　اشاعت، جون ۲۰۱۹ء

## سفر نامے:

۱۔ آج کا جاپان　　　اشاعت دوم ۲۰۱۴ء

۲۔ جہاں گردی　　　۲۰۱۷ء

۳۔ نگر نگر اک نظر　　　۲۰۲۱ء

۴۔ مشرق کی طرف دیکھ　　　۲۰۲۴ء

آپ کی کل ۱۰ مطبوعہ تصانیف منظر عام پر آئی ہیں جن میں سے ۴ شعری مجموعے ہیں، دو انٹرویوز پر مشتمل کتب اور باقی ۴ سفر نامے ہیں۔

## ۱۔ یاد نہ آئے کوئی:

عامر بن علی کا شعری مجموعہ ''یاد نہ آئے کوئی'' ۲۰۱۵ء میں، نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔ اس کتاب پر شہرت بخاری اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> **''عامر بن علی ایک ہی نام ہے۔۔۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ نظم سے اپنی شعری زندگی کا آغاز کیا بلکہ اتنا کہا کہ یہ مجموعہ بن گیا۔ اس کم عمری میں مجموعہ بنا لینا بھی آسان کام نہیں تھا۔ ''یاد نہ آئے کوئی'' اس کے شوق کی فراوانی کی گواہی ہے۔**

سوچنے والی بات یہ ہے کہ اگر کوئی طالب علمی کے زمانے میں ہی مجموعہ تیار کر سکتا ہے تو میری عمر تک پہنچتے پہنچتے کتنے مجموعے تیار کر لے گا۔ یہ مجموعہ نئی نظموں کا نمونہ ہے۔ اس کی نظم جدید نظم کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو کہ ن۔ م راشد اور میرا جی سے علیحدہ رجحان کا پتہ دے رہی ہے۔ بعض اوقات چونکا بھی دے رہی ہے"(۴)

## ۲۔ محبت چھو گئی دل کو:

مصنف کا یہ شعری مجموعہ "محبت چھو گئی دل کو" ۲۰۰۹ء میں پہلی بار، نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔ اشاعت دوم ۲۰۱۰ء میں اور اشاعت سوم اگست ۲۰۱۱ء میں، نستعلیق مطبوعات لاہور ہی سے شائع ہوئی۔ اس تصنیف پر عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس شعری مجموعے کے حوالے سے امجد اسلام امجد یوں لکھتے ہیں:

"مجھے خوشی ہے کہ وہ میری باتوں کو دھیان سے سنتا اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور یوں اس کی شاعری نوجوان نسل کے ساتھ ساتھ ثقہ اور معتبر ادبی والوں سے بھی لائق توجہ اور پسندیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ اسے ملک گیر شہرت اس شعر سے ملی تھی کہ

ے حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے

زیر نظر مجموعے میں آپ کو اس جیسے کئی شعر ملیں گے جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس نے ہنگامی اور پائیدار کے درمیان فرق کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور اب اس راستے پر رواں دواں ہے جہاں "جاودانی" کے انتظار میں ہے"(۵)

عامر بن علی کی شاعری کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں:

"یہ نظمیں اور غزلیں اس نے وہاں راتوں کو جاگ جاگ کر لکھی ہوتی ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ جگراتے کبھی ضائع نہیں جایا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مقبولیت اور پذیرائی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ عامر بن علی بہت ملنسار، ہنس مکھ اور محبت بانٹنے والا شاعر ہے۔ نفرت اور منافقت سے آلودہ اور موجودہ ادبی فضا میں ایسے شاعروں کا وجود غنیمت ہے جو نہ صرف شاعری میں پیار اور محبت کی بات کرتے ہیں بلکہ خود اس کی عملی تصویر بھی ہیں۔ عامر بن علی کو شعر سے کمٹمنٹ بہت مبارک ہو۔ میں اس کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں"(۶)

## ۳۔ چلو اقرار کرتے ہیں:

ادیب کا شعری مجموعہ ''چلو اقرار کرتے ہیں''۲۰۰۳ء میں پہلی بار، المطبعتہ العربیہ لاہور سے شائع ہوا اور اشاعت دوم ۲۰۰۴ء میں المطبعتہ العربیہ لاہور ہی سے ہوئی۔ اس تصنیف پر اسلم کولسری ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

> ''عامر بن علی کی شاعری کومل جذبوں کے سادہ اظہار سے عبارت ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے باقی سب کھڑکیاں بند کر رکھی ہیں وہ کبھی کبھی باہر ہی جھانکتے ہیں، کڑھتے ہیں اور کہیں کہیں ایسا شعر بھی ان کے قلم سے جھلک جاتا ہے جو دنیا اور اہل دنیا پر ایک درد مند تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم ایسی صورت میں بھی ایک دبی دبی سسکی سی کیفیت ہوتی ہے دل خراش چیخ کی نہیں۔
>
> ؎ عدل پرور بجا ہے عدل تیرا
> کیوں یہ گلیوں میں خون بہتا ہے
> حسن اور حکومت سے کون جیت سکتا ہے
> یہ بتاؤ دونوں کی عمر کتنی ہوتی ہے
>
> بہر حال ان کا مجموعی رنگ محبت ''نرم و ترنم'' مگر شرمیلے پن سے اظہار ہی کا ہے جو قاری کو ایک خاص قسم کے لطف اور سرور سے آشنا کرتا ہے۔ میں عامر بن علی کے تیسرے مجموعہ کلام کی اشاعت پر انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ شاعری کی رم جھم جاری رہے گی''(۷)

## ۴۔ سرگوشیاں:

عامر بن علی کا شعری مجموعہ ''سرگوشیاں'' پہلی بار ۱۹۹۹ء میں نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔ ۲۰۰۰ء میں اشاعت دوم، جنوری ۲۰۰۳ء میں اشاعت سوم، دسمبر ۲۰۰۵ء میں اشاعت چہارم اور جولائی ۲۰۱۰ء میں اشاعت پنجم، نستعلیق مطبوعات لاہور ہی سے شائع ہوئی۔ اس شعری مجموعے پر احمد عقیل روبی اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

> ''سرگوشیاں'' میں بھی کچھ نظمیں اور غزلیں ایسی ہیں جہاں عامر بن علی کی آواز سرگوشیوں کی حد عبور کرکے باہر نکل کر گونجتی ہے مگر ان کا یہ انداز کانوں کو بھلا محسوس نہیں ہوتا۔ ''عامر بن علی'' کی ''سرگوشیاں'' سے چند سرگوشیاں جو میں نے پیش کیں۔ اس سے اندازہ لگانا قطعاً دشوار نہیں کہ اس نوجوان نے براہ راست اپنے اندر کے احساس کو کتنے خوبصورت پیرائے میں لفظوں کو زبان دی ہے اور

**کتنے سادہ و سہل مگر دلکش اور واضح طرز اظہار میں اپنی سرگوشیوں کو مکالماتی جرات بخشی ہے"(۸)**

## ۵۔ گفتگو:

"گفتگو" ۲۰۱۴ء میں پہلی بار نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوئی۔ اس تصنیف کے 'پیش لفظ' کے عنوان پر ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عامر بن علی نے اس تصنیف کا انتساب "بابا جی اشفاق احمد" کے نام کیا ہے۔

اس تصنیف میں ۵۱ نامور شخصیات کے انٹرویوز جن میں احمد ندیم قاسمی، احمد عقیل روبی، اشفاق احمد، ڈاکٹر انور سجاد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، اسلم کولسری، اعزاز احمد آذر، اعجاز رضوی، اظہر رضوی، اصغر شامی، احمد جلیل، اے۔ جی جوش، انور مسعود، بیدل حیدری، بشریٰ اعجاز، جاوید شاہین، جواز جعفری، جمشید مسرور، حسن عباسی، خالد علیم، خالد مسعود خاں، خورشید مستانہ، راجہ رسالو، ریاض مجید، ریحانہ قمر، ڈاکٹر سلیم اختر، سیف اللہ خالد، سلیم طاہر، سلیمان جاذب، شہرت بخاری، شہزاد احمد، ڈاکٹر صغریٰ صدف، ڈاکٹر طاہر تونسوی، ظفر اقبال، عطاء الحق قاسمی، علیم ناصری، علی چوہدری، عامر بن علی، علی چوہدری، فخر زمان، فرحت عباس شاہ، فرحت زاہد، قمر رضا شہزاد، منیر نیازی، منو بھائی، مشتاق احمد یوسفی، محمد اکرم اعوان، محسن بھوپالی، ممتاز راشد، نوشی گیلانی، وصی شاہ اور ڈاکٹر یونس احقر شامل ہیں۔ ان نابغہ روزگار شخصیات کے انٹرویوز کے ذریعے قارئین کو ان کے بارے میں بھرپور اور حیرت انگیز معلومات ملیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی رائے کا اظہار عامر بن علی کی کتاب "گفتگو" کے بارے میں کچھ یوں کیا ہے:

> **"یہ تو میں نے گفتگو کی دیگ میں سے چاول کے دانے نکالے لیکن کتاب کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ساری دیگ ہی ایسی ہے یعنی قاری اس دیگ کے چاولوں سے بقدر ظفر لذت یاب ہو سکتا ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں ادبی شخصیات کے انٹرویوز پر مبنی متعدد کتابیں طبع ہوئیں اور فروخت ہوئیں اور حوالے کی چیز بھی ثابت ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ عامر اور ابرار کی گفتگو ایسی ہی کتاب ثابت ہو گی"(۹)**

## ۶۔ روبرو:

روبرو جون ۲۰۱۹ء میں نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوئی۔ عامر بن علی نے اس کتاب کا انتساب اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، مشتاق احمد یوسفی، منیر نیازی، منو بھائی مشکور حسین یاد، شہزاد احمد، شہرت بخاری اور اسلم کولسری کے نام کیا ہے۔ تصنیف کے انتساب میں محسن احسان کا خوب صورت شعر رقم کیا ہے:

**ایک ایک کر کے ستاروں کی طرح ڈوب گئے**

ہائے کیا لوگ مرے حلقۂ احباب میں تھے(۱۰)

کتاب میں ستاون نامور شخصیات کے انٹرویوز شامل کیے گئے ہیں۔ جن میں سے کچھ انٹرویوز ان کی پہلی تصنیف ''گفتگو'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ عامر بن علی کی یہ تصنیف حسن عباسی، لبنیٰ صفدر ور عامر بن علی کے کیے گئے انٹرویوز پر مبنی ہے۔ ان انٹرویوز دینے والوں میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لوگ شامل ہیں۔ یہ کتاب ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں نامور لوگ شامل ہیں اور مصنف نے ان انٹرویوز کے ذریعے ان شخصیات کے ذہن کے دریچوں میں جھانک کر ان کے خوب صورت خیالات واحساسات جان کر قارئین تک پہنچائے ہیں۔

## ۷۔عامر بن علی کی ادبی خدمات ماہنامہ ارژنگ کے تناظر میں:

عامر بن علی کے ادبی کارناموں میں ایک اہم کارنامہ ''ارژنگ'' بھی ہے۔ اردو زبان میں ارژنگ کا مطلب تصویری البم ہے۔ عامر بن علی نے ۱۹۹۹ء میں اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اس ادبی پرچہ کا آغاز کیا اور ۲۰۰۰ء میں ارژنگ کا ڈیکلیریشن ملا۔ آغاز میں ارژنگ اخبار کی شکل شائع ہوتا تھا جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انٹرنیٹ اپنی ابتدائی شکل میں تھا اور سوشل میڈیا کا نام ونشان نہیں تھا۔ بلاشبہ اس وقت ماہنامہ ارژنگ قارئین کے لیے خوبصورت تحفہ تھا۔ جب ملک کے تمام اردو اور انگریزی اخبارات ادب اور ادیبوں کو بہت کم جگہ دیتے تھے۔ دنیا سے بڑے بڑے ادیب رخصت ہو جاتے اور لوگوں کو مہینوں مہینوں خبر نہ ہوتی تھی ایسے عالم میں ماہنامہ ارژنگ کا شائع ہونا کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ جس میں تازہ ادبی تخلیقات اور شاعری کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اہم ادبی خبروں کو بھی شائع کیا جاتا ہے۔ ماہنامہ ارژنگ گزشتہ ۲۵ سال لاہور سے شائع ہوتا رہا ہے۔ ان ۲۵ برسوں میں دو اہم تبدیلیاں آئیں پہلی تبدیلی اخبار کی شکل سے ارژنگ کا کتابی صورت اختیار کرنا ہے اور دوسری بڑی تبدیلی ادارت کی ہے۔ ارژنگ کے پہلے بانی مدیر ابرار ندیم تھے جو کہ ریڈیو کے پروفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ براڈکاسٹنگ کے لیے تخلیقی کام بھی کرتے تھے۔ ان کے بعد صغریٰ صدف نے چند سال ارژنگ کو شائع کیا اور اب گزشتہ کئی سال سے لبنیٰ صفدر اور شاعر حسن عباسی ماہنامہ ارژنگ کو لاہور سے شائع کر رہے ہیں اور پرانے مدیر بھی اس پرچے کی اشاعت میں بھرپور حصہ ڈالتے ہیں۔ عامر بن علی نے پاکستانی شعر و شاعری اور افسانے کو ماہنامہ ارژنگ کے ذریعے جس تواتر سے دنیا بھر میں قارئین تک پہنچایا ہے اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔

## ۸۔آج کا جاپان:

عامر بن علی کا سفر نامہ ''آج کا جاپان'' پہلی بار ۲۰۱۳ء میں نستعلیق مطبوعات سے شائع ہوا۔ عامر بن علی نے اس سفر نامے کا انتساب ''اپنی بیٹی فاطمہ'' کے نام کیا جس سے ان کی اپنی بیٹی سے محبت ظاہر ہوتی ہے:

**''انتساب**

**پیاری بیٹی فاطمہ کے نام!**

**جو گھر کے تمام بچوں کے لیے ''عینی بجی''ہیں''(۱۱)**

پروفیسر سویامانے اس سفر نامے کے فلیپ پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

> **''اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کتاب کے مصنف عامر بن علی صاحب زیادہ وقت جاپان کے ایک ایسے شہر میں رہتے ہیں جہاں ٹوکیو، اوساکا کی طرح غیر ملکی لوگ زیادہ نہیں رہتے اور سردیوں میں خوب برف باری ہوتی ہے۔ایسے شہر میں رہنے سے جاپان کے روایتی معاشرے کو دیکھنے کا موقع بھی یقیناً انھیں ملا ہوگا۔طرح طرح کی باتیں عامر صاحب وقتاً فوقتاً لکھتے آئے ہیں اور اب ''آج کا جاپان'' کتابی شکل میں آئی ہے۔مجھے پوری طرح یقین ہے کہ آپ اسے پڑھ کر لطف اندوز ہو جائیں گے اور پڑھنے کے بعد آپ کو جاپانی معاشرے کا اندازہ تو ضرور ہوگا۔''(۱۲)**

بیک ٹائٹل کے فلیپ پر خواجہ محمد زکریا کے مضمون سے اقتباس نقل کیا گیا ہے۔عامر بن علی اور ''آج کا جاپان'' کے بارے میں خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

> **''عامر بن علی جاپانی معاشرے کے بارے میں اپنے تجربات، مشاہدات اور احساسات اخباری کالموں کی شکل میں لکھتے رہتے ہیں۔وہ جاپانی زندگی کی مختلف جہتیں ان مکتوبات جاپان میں نہایت اچھے انداز میں قلمبند کرتے ہیں اور اخبار کے قارئین ان سے متمتع اور مستفید ہوتے رہتے ہیں مگر جیسا کہ مشہور ہے کہ اخبار کی تحریک ایک دن زندہ رہتی ہے۔دوسرے دن بہت سا نیا مواد چھپ جاتا ہے اور اپنی کشش کے باعث گزرے ہوئے دن کی تحریروں کو فراموش کرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔مگر کتابی شکل میں یکجا ہو کر مستقل اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔اس لیے ان کالموں کو کتاب کا روپ دینے کا فیصلہ صائب ہے''(۱۳)**

''آج کا جاپان'' کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔جس میں جاپان کے عمومی موضوعات جیسے پھول، کافی وغیرہ کے ساتھ ساتھ بنیادی موضوعات جیسے دوسری جنگ عظیم (ہیروشیما اور ناگاساکی)، سونامی سے ہونے والے ماضی میں نقصانات، ترقی کا سفر (جدید سائنس اور ٹیکنالوجی) اور سیاست و صحافت پر پر تفصیلی بات کی گئی ہے۔

## ۹۔جہاں گردی:

عامر بن علی کا سفر نامہ ''جہاں گردی''۲۰۱۷ءمیں نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔اس سفر نامہ کے فلیپ پر ڈاکٹر امجد پرویز نے انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔بیک ٹائٹل کے فلیپ پر ڈیلی ٹائمز ریویو "Daily Times Review" سے اقتباس نقل کیا گیا ہے۔اس سفر نامے کا انتساب عامر بن علی کی وطن سے محبت ظاہر کرتی ہے۔انتساب کچھ یوں ہے:

**''انتساب**
**پاکستان کی مٹی**
**کے نام!**
**بارش کے بعد جس میں سے**
**ایسی سوندھی خوشبو اٹھتی ہے**
**جس کی پوری دنیا میں کوئی مثال نہیں''**(۱۴)

عامر بن علی کا سفر نامہ ''جہاں گردی'' تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں آٹھ آٹھ ممالک کا سفری احوال بیان کیا گیا ہے۔ان تمام ممالک کی تاریخ، جغرافیہ اور تہذیب و ثقافت کو جامع انداز میں کیا گیا ہے۔ان آٹھ ممالک کی روداد کو اتنی خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔عامر بن علی نے ایک محقق کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے معلومات کا ایسا خزانہ اس کتاب میں سینچ دیا ہے کہ قاری کتاب کی سطروں سے صرف لطف اندوز نہیں ہو رہا بلکہ وہ ان لفظوں کے دوش پر سوار ہو کر ان ممالک کی سیر کرتا ہوا خود کو محسوس کرتا ہے۔سفر نامے کے کینوس پر عامر بن علی کی تصویر اس سیاح کی سی ہے جو مقصد کی دوڑ میں لپیٹے بغیر سفری تھیلے کو کاندھے پر ڈال کر جہاں گردی کرتے ہیں اور اپنے تجربات و مشاہدات کو خارجی لمس اور داخلی احساس کے ساتھ قاری تک پہنچاتے ہیں۔

## ۱۰۔نگر نگر اک نظر:

سفر نامہ نگار کا سفر نامہ ''نگر نگر اک نظر''۲۰۲۱ءمیں نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔عامر بن علی اس سفر نامہ کا انتساب اپنی 'والدہ مرحومہ کی یادوں کے نام' سے کرتے ہیں جو یوں ہے:

**''انتساب**
**امی کی خوبصورت یادوں کے نام''**(۱۵)

اسد اللہ غالب اس سفر نامے کے فلیپ پر اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ***''ان کا نیا سفر نامہ ''نگر نگر اک نظر'' بہت ہی دلچسپ واقعات پر مبنی اور طرز تحریر انتہائی سہل اور خوبصورت ہے۔ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ مصنف کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے۔ کہیں ادبی چاشنی تو کہیں صحافی رنگ غالب***

**نظر آتا ہے۔۔۔یہ سفر نامہ تحریر کر کے عامر بن علی نے پاکستان کی بلاشبہ خدمت کی ہے۔ جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں اور اس کتاب کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ایسی فقید المثال تخلیقی کاوش پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں"(۱۶)**

سفر نامہ ''نگر نگر اک نظر'' کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دو حصوں میں مختلف ممالک کے سفری احوال کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے جبکہ سوم میں اردو ادب کے نامور شعراء اور ادباء جو بچھڑ گئے ہیں ان کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔اس سفر نامے کو مختلف تحاریر کا گلدستہ بھی کہا جا سکتا ہے جس کے متفرق موضوعات سے قاری کے ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔

## ۱۱۔ مشرق کی طرف دیکھ:

مصنف کا سفر نامہ ''مشرق کی طرف دیکھ'' ۲۰۲۴ء میں نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع ہوا۔عامر بن علی کی یہ تازہ ترین تصنیف ہے۔اس کتاب کا انتساب 'خاندان کے نئے جوڑے' کے نام کیا گیا ہے۔جو کچھ یوں ہے:

**''انتساب**

**خاندان کے نئے جوڑے**

**مریم اور غماز حسنین**

**کے نام''**(۱۷)

اس کتاب کا دیباچہ آمنہ مفتی نے تحریر کیا ہے۔آمنہ مفتی عامر بن علی اور ان کی تصنیف ''مشرق کی طرف دیکھ'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

**''عامر کے پاس کمال کی بدیشی کہانیاں ہوتی تھیں۔ان کہانیوں کی خاصیت یہ ہے کہ کسی بھی جگہ ایک آدھ دن کے ہنگامی دورے کے بعد لکھی گئی پانچ سو صفحے کی کتاب کی بجائے سالہا سال سے ان ممالک میں رہنے، ان کی زبان سیکھنے اور ان کے ساتھ کاروبار کرنے کے بعد کہی جاتی ہیں۔ابھی ہم عامر کی کہانیوں کے طلسم میں ہی گم تھے کہ ان کی کتاب ''مشرق کی طرف دیکھ'' موصول ہوئی۔کتاب کا عنوان دیکھ کر یورپ میں جگہ جگہ لگے کولمبس کے مجسمے یاد آ گئے جس میں وہ مشرق کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہا ہے''**(۱۸)

عامر بن علی کا سفر نامہ ''مشرق کی طرف دیکھ'' تین حصوں پر مشتمل ہے۔یہ ایک منفرد رنگ کا سفر نامہ ہے۔اس سفر نامے میں پاکستان سمیت مختلف ممالک کا تذکرہ کیا گیا ہے اور آخری حصے میں ان نامور شعراء، ادباء اور دوستوں کی

یادیں تذکرہ کی گئی ہیں جو بچھڑ گئے ہیں۔ان تصانیف کے علاوہ عامر بن علی نے نوبل انعام یافتہ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی شاعری کا ہسپانوی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔عامر بن علی کو سات زبانوں پر عبور حاصل ہے جن میں جاپانی، ہسپانوی، سپینش، روسی، فارسی، انگریزی، اردو اور پنجابی شامل ہیں۔

بحیثیت مجموعی عامر بن علی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔انہوں نے یوں تو اردو ادب کے بارے میں کئی اصناف پر اپنے فن کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں مگر ان کی شہرت کی اصل وجہ سفر نامہ نگاری اور شاعری ہے۔عامر بن علی کا انداز تحریر اچھوتا ہونے کے ساتھ ساتھ متاثر کن بھی ہے کیونکہ وہ نامانوس الفاظ کو استعمال نہیں کرتے۔جس سے قاری اعلیٰ سے اعلیٰ تر مقصد کے بیان کو آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔عامر بن علی کی زبان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی سے متعلق کسی بھی واقعے کے بیان کو آسان و رواں طریقے سے پیش کرتے ہیں۔عامر بن علی کے قلم کی روانی و تیزی میں وسیع النظری اور زرک بینی سے عہد قدیم اور تاریخ کے واقعات کو بڑی عمدگی اور خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

شخصیت کی جامع تعریف بیان کرنا مشکل کام ہے۔ہم سادہ الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی فرد یا شخص کی شخصیت اس کی ظاہری، باطنی اور اکتسابی خصوصیات کا مجموعہ ہے۔ کسی بھی فرد کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ایک اس کا ظاہر اور دوسرا اس کا باطن۔ کسی بھی انسان کا ظاہر وہ ہوتا ہے جو دوسروں کو واضح طور پر نظر آتا ہے۔اس میں اس کے رویے اور ظاہری شباہت شامل ہے۔ انسان کے باطن میں عقل، علم، احساسات، جذبات اور رجحانات شامل ہیں۔ انسان کی اصل پہچان شخصیت ہی سے ہوتی ہے۔

عامر بن علی ایک پر کشش اور بارونق شخصیت کے مالک ہیں۔لوگوں سے ملتے وقت ان کے چہرے پر ہمیشہ ہلکی مسکراہٹ چہکتی رہتی ہے، یہ ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔عامر بن علی نے کم عمری میں ہی اپنی علمی سطح، بلند اخلاق کی بدولت معاشرے میں اپنا خاص مقام بنایا۔عامر بن علی درویش صفت اور عاجز انسان ہیں۔آپ ایسی شخصیت کے مالک ہیں جن کی محفل میں بیٹھ کر ہر عام و خاص شخص خود کو محترم سمجھنے لگتا ہے۔اسی سبب سب دوست، احباب آپ کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔عامر بن علی ایک اچھے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باکردار انسان بھی ہیں۔ وہ بیرون ملک قیام پذیر ہونے کے باوجود ایک اچھے پاکستانی کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی بخوبی سرانجام دیتے ہیں۔ آپ دوستوں کے ساتھ نہایت بے تکلفانہ رویہ رکھتے ہیں، تحریکوں اور محافل میں تشریف لے جاتے ہیں۔آپ حد درجہ انکساری پسند انسان ہیں۔ دنیاوی چیزوں کا حرص و لالچ نہیں کرتے۔عامر بن علی ایک ہمدرد اور ملنسار انسان ہیں جن سے پہلی بار بات کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیں بہت پہلے سے جانتے ہیں اور ہمارا بہت گہرا رشتہ ہے۔

اللہ تعالیٰ عامر بن علی کو علم وادب کی راہبری اور رہنمائی کے لیے ہمیشہ سلامت رکھیں (آمین)

## حوالہ جات


۱۔انٹرویو،عامر بن علی،روبینہ شہادت،رہائش گاہ:عامر بن علی،میاں چنوں: ۱۴/اپریل ۲۰۲۴ء،بوقت دو پہر ۲ بجے

۲۔ایضاً

۳۔ایضاً

۴۔شہرت بخاری، سر آغاز، مشمولہ، یاد نہ آئے کوئی،لاہور: نستعلیق مطبوعات،اشاعت دوم ۲۰۱۵ء، ص ۱۱

۵۔امجد اسلام امجد، جادو دانی کا سفر، مشمولہ، محبت چھو گئی دل کو،لاہور: نستعلیق مطبوعات،اشاعت سوم،۲۰۱۱ء، ص ۱۱تا۱۲

۶۔عطاء الحق قاسمی، یہ سخن جو تم نے رقم کیے، مشمولہ، محبت چھو گئی دل کو،لاہور: نستعلیق مطبوعات،اشاعت سوم ۲۰۱۱ء، ص ۱۳

۷۔اسلم کولسری، کومل جذبوں کا شاعر، مشمولہ، چلو اقرار کرتے ہیں،لاہور: المطبہ العربیہ،اشاعت دوم، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴

۸۔احمد عقیل روبی، کچھ سر گوشیاں کے بارے میں، مشمولہ، سر گوشیاں، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت پنجم، جولائی ۲۰۱۰ء، ص ۱۳

۹۔سلیم اختر،ڈاکٹر، پیش لفظ، مشمولہ، گفتگو،لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵

۱۰۔عامر بن علی،روبرو،لاہور: نستعلیق مطبوعات،جون ۲۰۱۹ء، ص ۱۱۶

۱۱۔ عامر بن علی، (انتساب)،مشمولہ، آج کا جاپان، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت دوم، جولائی ۲۰۱۳ ء

۱۲۔سویامانے،پروفیسر، تجربہ نامہ، مشمولہ، آج کا جاپان،لاہور: نستعلیق مطبوعات،اشاعت دوم جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۱۳۔محمد زکریا،خواجہ، جاپان۔ایک آئیڈیل ملک، مشمولہ، آج کا جاپان،لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت دوم جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۱۲

۱۴۔عامر بن علی،(انتساب)، مشمولہ، جہاں گردی،لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۷ء

۱۵۔عامر بن علی،(انتساب)، مشمولہ، نگر نگر اک نظر،لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۲۱ء

۱۶۔اسد اللہ غالب، محبتوں کے سفیر کا سفر نامہ، مشمولہ، نگر نگر اک نظر،لاہور: نستعلیق مطبوعات،اشاعت بار اول،جون ۲۰۲۱ء، ص ۱۲

۱۷۔عامر بن علی،(انتساب)، مشمولہ، مشرق کی طرف دیکھ،لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۲۴ء

۱۸۔آمنہ مفتی، دیباچہ، مشمولہ، مشرق کی طرف دیکھ،لاہور: نستعلیق مطبوعات،اشاعت بار اول،اپریل ۲۰۲۴ء، ص ۱۰

باب سوم:

# آج کا جاپان

سفر زندگی کا استعارہ ہے اگر یوں کہا جائے کہ زندگی سفر سے عبارت ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ سفر کی اس مسلمہ حقیقت کو خیالاتِ انسانی کے وجود سے وہی نسبت ہے جو کہ اس کائنات کو انسان سے ہے۔ مثلاً اگر حضرت آدمؑ کے جنت سے زمین تک کے سفر کو انسانی تاریخ کا پہلا سفر قرار دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ سفر کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان۔

اسی طرح سفر نامہ نگاری کی تاریخ بھی صدیوں پر محیط ہے اس صنف نے ہر عہد میں، ہر قوم میں، ہر زبان میں مقبولیت پائی۔ اس کی ایک اہم اور خاص وجہ یہ بھی ہے کہ سفر نامہ انسان کے ذوق تحیر کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے شوق آوارگی کا تحریری بیانیہ بھی ہوتا ہے اور اس صنف میں دیگر تمام اصناف ادب کی خوبیوں کو یکجا کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے اسی لیے اسے 'اُم الاصناف' بھی کہا جاتا ہے۔

دیگر اصناف ادب کی طرح ''سفر نامے'' نے بھی تیزی سے مقبولیت حاصل کی ہے اس حقیقت سے ہر گز انکار ممکن نہیں کہ سفر نامہ اُردو زبان کا اہم سرمایہ ہیں اور نثر کے ارتقاء میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو قریباً پونے دو برس پر اس کی حیات محیط ہے اور اردو ادب میں سب سے پہلا سفر نامہ یوسف خان کمبل پوش کے ''عجائبات فرنگ'' کو اردو کا اولین سفر نامہ قرار دیا جاتا ہے۔ لکھنو کی فضا میں لکھے گئے اس قدیم ترین سفر نامے کی پہلی اشاعت ۱۸۴۷ء میں دہلی میں ہوئی۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب میں یوں بھی لکھا ہے کہ یوسف خان کمبل پوش حیدر آبادی کا یہ سفر نامہ پہلی بار ''تاریخ یوسفی'' کے نام سے پنڈت دھرم نرائن کے زیر اہتمام مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے شائع ہوا تھا۔ یہیں سے اس صنف کی روایت کا آغاز ہوا جس کی مقبولیت دور جدید کی ہر زبان، ہر ادب اور ہر قوم میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اس دوران اردو میں ہزاروں سفر نامے منظر عام پر آئے اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ اس میں تکنیکی، ہستی، اسلوبیاتی تبدیلیاں بھی تجربات کے تحت رونما ہوئیں۔ کبھی مذہبی سفر ناموں نے قبول عام پایا تو کبھی تہذیبوں نے اردو سفر نامے پر اجارا داری حاصل کی۔ دور جدید کے سفر نامے، قدیمی سفر ناموں سے یکسر مختلف نظر آتے ہیں جیسا کہ انیسویں صدی میں اس صنف پر داستانوی رنگ اور اردو زبان پر فارسیت کا غلبہ تھا مگر بیسویں صدی وسائل میں اضافات اور جدیدیت کی طرف روانگی نے اس صنف کو نیا موڑ دیا جبکہ اکیسویں صدی میں داخل ہوئے ہوئے جدیدیت، انقلابات اور ہر طور پر وسائل کی فراوانی نے نئی دنیا کے چیلنجز کو اپناتے ہوئے ترقیاتی منازل کی طرف رواں دواں نظر آتا ہے۔ یوں تو سفر نامے کے منظر نامہ پر بے شمار نام دیکھنے کو ملتے ہیں مگر دور جدید کے چند اہم ناموں میں عطاء الحق قاسمی، جمیل الدین عالی، مستنصر حسین تارڑ، سید اختر جعفری، امجد اسلام امجد اور ڈاکٹر آصف محمود جیسے سر فہرست ہیں۔

اسی فہرست اور دور جدید کا ایک اہم اور مقبول نام عامر بن علی ہے جنہوں نے سفر نامے کی جدت کو برقرار رکھتے ہوئے متعدد مقامات کے منظر نامے کو اپنے صحافتی رنگ کو نمایاں رکھتے ہوئے خوبصورت اسلوب اور سہل الفاظ میں پیش کیا ہے۔ ان کے چار سفر نامے 'آج کا جاپان'، 'جہاں گردی'، 'نگر نگر اک نظر' اور 'مشرق کی طرف دیکھ' شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے بے شمار کالم، چند شعری مجموعے، انٹرویو اور تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔

عامر بن علی کے حیاتی تعارف کے اوراق کو پلٹا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مختلف ممالک کی سیر کی ہے اور ان تمام ممالک کے منظر نامے وہاں کی تہذیب اور معاشرت کو جانچنے اور پرکھنے کے بعد قاری کے سامنے منفرد انداز اور متنوع موضوعات میں پیش کیا ہے۔ ان میں سب سے تفصیلی سفر نامہ ''آج کا جاپان'' ہے جس میں مصنف کی دس سالہ زندگی کے تمام مشاہدات کا عکس واضح دیکھا جا سکتا ہے۔ جاپان کے پھول، کھانے، جانور، رسومات، ٹیکنالوجی، معیشت، سیاست، تعلیم اور تاریخ یہاں تک کہ شخصیات کو بھی اتنی باریک بینی اور عمدگی سے پہلو بہ پہلو کھول کر بیان کرتے ہیں کہ قاری خود کو جاپان کی فضا میں سانس لیتا محسوس کر سکتا ہے۔ ان سے پہلے عامر بن علی جاپانی معاشرے کے بارے میں اپنے مشاہدات، تجربات اور تمام احساسات اخباری کالموں کی شکل میں لکھتے رہے ہیں مگر صحافت کا یہی المیہ ہے کہ ایک تحریر زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہتی ہیں مواد چھپتے ہی پچھلے کو فراموش کر دیا جاتا ہے مگر مصنف کا یہ تحریری نسخہ اردو ادب میں بہترین سرمایہ ہونے کے ساتھ ساتھ جاپانیوں کی تہذیب کو تاحیات روشن رکھے گا۔

سفر نامہ ''آج کا جاپان'' تین حصوں پر مشتمل ہے جس کی ضخامت ۳۱۲ صفحات پر ہیں۔ جاپان کی تہذیب اور معاشرت پر لکھی گئی اس کتاب کا پہلا حصہ سویامانے، خواجہ محمد زکریا اور خود عامر بن علی کے تین موضوعات پر حرف آغاز اور کتاب کے تعارفی مضامین کے بعد بعنوان ''چڑھتے سورج کی سرزمین کا سفر'' کل انچاس ۴۹ مضامین پر لکھا گیا تفصیلی بیانیہ ہے جس میں جاپان کی سرزمین کے مقبول ترین تمام پہلوؤں پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے مثلاً جاپان کی تہذیب، رسومات، تعلیم و ترقیات، مذہبی اور ثقافتی رنگ، سیاست و صحافت کے چند پہلو، شخصیات اور مقامات کا تفصیلی ذکر اور یہاں تک کہ جاپانی قوم کی اخلاقیات اور خصائل کے ساتھ ساتھ وہاں کے موسموں کا ذکر بھی موجود ہے۔ حصہ اول کے موضوعات درج ذیل ہیں:

- مسکراہٹ
- خزاں کی دستک
- چیری بلاسم
- دنیا کا بلند ترین مینار
- برفانی بندر

- محبت کی سائنس
- علامہ اقبالؒ اور جاپان
- جگنو کہاں گئے ؟
- مزیدار کھانوں کا شہر
- جاگتا جہنم
- جاپان میں رمضان المبارک
- روایت کا نیا رنگ
- اولاد کی جنس کا انتخاب ممکن ہو گا ؟
- جاپان کا پرائمری نظام تعلیم
- جاپان بھارت بلٹ ٹرین معاہدہ
- سائبر کرائم کا نیا چیلنج
- جاپان کا معاشی ارتقاء
- ٹوکیو سے کراچی تک ۔۔۔
- جاپانیوں کی جانوروں سے عقیدت
- محو حیرت ہوں کہ ۔۔۔
- ایڈیسن دیوتا
- بدلتے موسم
- جوا۔ کسی کا نہ ہوا
- کرسمس اور نئے سال کی روشنیاں
- سیکنڈ ہینڈ تمباکو نوشی
- جدید ٹیکنالوجی
- رکھ رکھاؤ
- ٹوکیو اولمپک ۲۰۲۰ء
- بلٹ ٹرین
- زلزلے، سونامی، ایٹمی بحران

❖ جوہری توانائی کا مستقبل

❖ صدر پاکستان کا دورہ جاپان

❖ مستقبل کی موٹر گاڑیاں

❖ کوئلے سے توانائی کا حصول

❖ تھری۔ڈی ٹیلی ویژن

❖ مطالعہ کا چلن

❖ اخبار۔کلیدی ذریعہ اطلاعات

❖ امریکی فوجی اڈااور وزیر اعظم کا استعفیٰ

❖ موبائل فونوں سے سونے کی برآمد

❖ چینی، جاپانی حلیف

❖ جاپانی شہر اوبامہ

❖ ایٹمی ہتھیاروں کے خاتمے کی کوششیں

❖ ایٹمی بمباری کے ۶۴ سال

❖ خود کشی کا رجحان اور اوکھی ناوا

❖ کاک ٹیل

❖ یہ بھی کوئی الیکشن تھا

❖ پاکستانی ادیبوں کا دورہ جاپان

❖ سویامانے پاکستان۔واپس جا رہا ہے

❖ ایں جہاں دِ گراست

ان تمام تر موضوعات کا مجموعی جائزہ لیں تو ایسے موضوعات جن پر زیادہ بات کی گئی ہے درج ذیل ہیں:

جاپان کا چند دوسرے ممالک کے ساتھ موازنہ

جاپان کی قابل رشک ترقیات

جاپانی قوم کے مزاج کی خوبیاں

وہاں کے مذاہب اور عقائد کا ذکر

جاپان کا جغرافیہ

پاکستانی معاشرے میں موجود خامیوں کا جاپانی قوم کے ساتھ موازنہ
سیاست اور صحافت کا تفصیلی بیان۔

ان تمام پہلوؤں کو دیکھنے کے بعد قاری کیسے حیرت کا مجسمہ نہ بنے کیوں کہ مصنف نے اس قوم کے احوال کو اتنی گہرائی میں بیان کیا ہے کہ شاید ہی کوئی رنگ باقی رہا ہو۔

''آج کا جاپان'' کے حصہ دوم بعنوان ''رنگ دیگر'' چند متفرق متنوع موضوعات پر مشتمل ہے جس میں نا صرف مختلف ممالک کی مقبول شخصیات بلکہ مختلف مقامات کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔ عامر بن علی دنیا کے مختلف لوگوں کے مزاج اور اپنے ہم وطنوں سے مکالمات کا ذکر بھی مخصوص انداز میں تحریر کرتے نظر آتے ہیں۔ کتاب کے اس حصے کیلئے اگر تقابلی لفظ بھی استعمال کیا جائے تو کوئی عار نہیں کیونکہ کہیں ہمیں شخصیات کا موازنہ دیکھنے کو مل سکتا ہے تو کہیں دوہری شہریت کے فوائد سے آگاہی فراہم ہوتی ہے۔ کہیں جنگ کے بعد ترقی کے سفر کی روداد ملتی ہے تو کہیں دوسرے ملک کی پستی کا بیانیہ سامنے آتا ہے حتیٰ کہ ذات پات، قومیت، فرسودہ تصورات اور ملکی ترقی کے تمام تر پہلو کو دوسرے ممالک کے ساتھ موازنہ کر کے پیش کیا گیا ہے اور مسلمہ حقیقت بھی ہے کہ کسی ایک چیز کو شناخت یا اس کے مقام کا تعین کسی دوسری چیز یا دوسرے ملک کے ساتھ موازنہ اور تقابل کر کے ہی بیان کی جا سکتی ہے۔ یہی بات پروفیسر سویامانے 'آج کا جاپان' کے تجربہ نامے میں لکھتے ہیں:

> **''یہ بات سچ ہے کہ کسی شے کی شناخت دوسرے چیز کے ساتھ مقابلہ کرنے ہی سے زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ کسی شخص یا کسی معاشرے کے بارے میں جاننا چاہیں گے تو دوسرے لوگ ہی اچھی طرح بتا سکیں گے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں اور کیا کیا نہیں ہیں''(۱)**

حصہ دوم بعنوان ''رنگ دیگر'' کے موضوعات کی فہرست درج ذیل ہے:

- نصرت فتح علی خان کے انمٹ نقوش
- پاک ٹی ہاؤس کا نیا روپ
- آئن سٹائن اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان
- یہ زنجیریں ٹوٹ سکتی ہیں
- الیکشن نتائج ۲۰۱۳ء کے روشن پہلو
- پیشہ ذات اور الیکشن
- خدا حافظ

- کیسے لوگ ہیں دنیاوالے؟
- مرارجی ڈیسائی
- اِک چراغ اور بجھا۔۔۔!
- دوہری شہریت
- دوہری شہریت۔دوسرارخ۔۔۔!
- چیئرمین نادرااور دوہری شہریت
- پاکستان۔کپڑے کادوسرابڑابرآمدکنندہ
- گاندھی بنام موتی لال نہرو
- متاعِ ضمیراور حرفِ رسا

حصہ سوم ''جہانِ دگر'' گزشتہ دو حصوں سے یکسر مختلف ہے۔موضوعات کی کثرت تو موجود نہیں مگر اس حصے میں مقامات کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔اس حصے کی خوش منظری کا سبب یہ بھی ہے کہ یہ مقامات کے ساتھ ساتھ معروف ادبی شخصیات مثلاً پابلو نرودا اور ٹالسٹائی کی حیات کے پہلوؤں کا تفصیلی بیان بھی موجود ہے۔پابلو نرودا نا صرف ادبی لحاظ سے مقبول تھے بلکہ انسانی فلاح و ترقی میں بھی متحرک انسان تھے۔نوبل انعام یافتہ شاعر،سفار تکار اور سیاستدان پابلو نرودا کے چلی میں قیام اور ان کی وفات کی اصل حقیقی وجہ پر مکمل مضامین موجود ہیں۔

عامر بن علی نے شخصیات کے علاوہ جن مقامات پر مضامین لکھے اس میں وادیِ دمشق،ایران کے دو شہر تہران اور مشہد میں قیام کے احوال اور افغانستان کا تیسرا قندھار بھی شامل ہے۔علاوہ ازیں ایک مضمون سیاسی اعتبار سے مصنف نے لکھا ہے جس کا نام ''۱۱ ستمبر ایک اور بھی ہے''ہے۔اس میں چلی کے صدر (جمہوری نظام کے تحت اقتدار میں آئے) کے تختہ الٹنے کی سازش اور پابلو نرودا کے قتل کی وجوہات پر قلم فرسائی فرمائی گئی ہے۔حصہ سوم کے مضامین درج ذیل ہیں:

- پابلو نرودا کے چلی میں چندروز
- سرِ وادیِ سینا
- ۱۱ ستمبر ایک اور بھی ہے
- ٹالسٹائی مسلمان تھا؟
- تہران سے ایک خط
- مشہد میں چندروز
- کیا پابلو نرودا قتل کیا گیا؟

❖ میجر آندرے کا قندھار

قدیم روایتی و ثقافتی رنگوں سے بھرپور جاپان دنیا کے نقشے پر بظاہر پانی میں ڈوبا ہوا پہاڑ کی چوٹی معلوم ہوتا ہے مگر اس کو مجمع الجزائر کا نام بھی دیا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ملک تین ہزار سے زائد جزیروں پر مشتمل ہے۔ جاپانی زبان میں اس ملک کیلئے 'کانجی' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو چینی تلفظ پر مبنی ہے۔ اس ملک کی تاریخ پر بات کی جائے تو جاپانیوں کے ہاں اپنے آغاز کے بارے میں دیگر اقوام کی طرح کئی داستانیں موجود ہیں۔ تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چودہ ہزار سال قبل مسیح سے ۳۰۰ قبل مسیح تک یہاں جومون دور گزرا ہے اور اس دور کی تہذیب کے بارے میں مصنفین بیان کرتے ہیں کہ تب کے لوگ پتھر، سمندری شلز، لکڑی اور چمڑے کی بنی اشیاء استعمال کرتے تھے اور ان کا زیادہ تر گزر بسر جنگلی یا آبی اشیاء پر ہوتا تھا تب سے اب تک ان میں بے شمار قومیں اور ادوار گزرے۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ جاپان کے لوگ اپنی تمام قوم کو ایک کنبہ سمجھتے ہیں اور اس کنبے کا سب سے بڑا بزرگ اپنے شہنشاہ کو جانتے ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ جب سے ان کی سلطنت کی بنیاد پڑی ہے آج تک اسی طریقے سے برقرار ہے۔ جدید دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ جاپانی قوم اپنے شہنشاہ کو ایک خدا درجہ دیتے ہیں۔ ان کی تاریخ اسی شہنشاہیت پر مبنی ہے مثلاً ہر دور کو شہنشاہوں سے مطابقت دی جاتی رہی ہے۔ ان کے چند ادوار کا ذکر اد باء یوں کرتے ہیں:

❖ کوفن دور
❖ آسو دور
❖ نارادور
❖ ہیان دور
❖ کاماکورادور
❖ ایڈو دور
❖ میجی دور

علاوہ ازیں مصنفین چند ادوار کو جنگوں اور ایٹمی حملوں کے حوالے سے یوں تقسیم کرتے ہیں:

❖ جاپان کی سمندر پار جنگیں
❖ جنگ عظیم اول
❖ جنگ عظیم دوم
❖ ہرپار بر پر حملہ
❖ جنگ بحیرہ کورل

- جنگ مڈوے
- بحرالکاہل میں جنگی مہمات
- جنگ خلیجہ لٹی
- جاپان پر فضائی حملے
- اوکیناوا پر قبضہ
- ہیروشیما پر ایٹمی حملہ
- ناگاساکی پر ایٹمی حملہ
- جاپان کی شکست
- روس کا منچوریا پر حملہ
- ہتھیار ڈالنے کی تقریب اور جاپان پر قبضہ
- جاپان کے جنگی جرائم
- جاپان چین تعلقات

یہ تمام ادوار اور جنگی حملوں کی داستان مل کر جاپان کی تاریخ رقم کرتے ہیں۔ جاپانیوں کی تاریخ میں دو باتیں بالکل فقید المثال ایک یہ کہ موجودہ فرمانروا خاندان کے شہنشاہ ان پرانے وقتوں سے حکومت کرتے چلے آ رہے ہیں جبکہ انسان کی تاریخ محض داستان کی حیثیت رکھتی تھی، دوسرا یہ کہ جاپان کو کئی بار مسخر کرنے کی کوشش کی گئی مگر حملہ آوروں کو اکثر اوقات ناکام لوٹنا پڑا۔ جاپان کے جغرافیہ اور آبادی کو دیکھا جائے تو جغرافیائی لحاظ سے یہ ۳۰۰۰ کلو میٹر (۱۹۰۰ میل) شمال مشرق، جنوب مغرب میں بحیرہ اوجوتسک سے مشرقی بحیرہ چین تک پھیلا ہوا ہے اور ۱۴۱۲۵ جزائر پر مشتمل ہے جس کی بناء پر اسے مجمع الجزائر کہا جاتا ہے۔ ۲۰۱۹ء تک جاپان کا رقبہ ۳۷۷۹۷۵ مربع کلو میٹر ہے اور اس کے پاس دنیا کا چھٹا سب سے طویل ساحل بھی موجود ہے۔ جاپانی مجمع الجزائر ۶۷ فیصد جنگلات اور ۱۴ فیصد زرعی زمینوں پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر ناہموار اور پہاڑی علاقہ ہے جس کی بدولت اسے چالیسواں سب سے زیادہ گنجان آباد ملک بھی کہا جاتا ہے جس کی آبادی تقریباً ساڑھے بارہ کروڑ سے زیادہ ہے۔ عقائد کی پیروی کرنے والی یہ مضبوط قوم اخلاقی طور پر خوش مزاج، خوددار، زندہ دل، غیرت مند، مہذب اور متفقہ طور پر متحد و حب الوطن ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ اور جدید ٹیکنالوجی کے لحاظ سے دیگر ترقی یافتہ ممالک پر عنقریب سبقت لے جانے پر قادر ہے۔ جاپانیوں کے عقائد میں قدامت پسندانہ روایات کا زیادہ عمل دخل ہے اور مذہبی اعتبار سے خاصے شدت پسند ثابت ہوتے ہیں اور قدامت پسندانہ دور اتنا شدید ہے کہ ان کے ہاں شہنشاہیت کو خدا کے درجے رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ جاپانی قوم آفتاب پرست، بحر پرست، جنگ پرست اور چند دیگر عقائد سے

وابستگی بھی شامل ہے۔ مذہبی لحاظ سے بااصول اور منظم ہیں کوتاہی کی گنجائش نہیں۔ جاپان میں اہم ترین مذہب شنتو مت کہلاتا ہے مگر ماسوائے اس کے چند دیگر مذاہب مثلاً بدھ مت، عیسائیت اور اسلام بھی پائے جاتے ہیں۔ اسلام یہاں کم تعداد میں ہے مگر مساجد کی موجودگی دیکھیں تو معلوم پڑتا ہے۔ جاپانی قوم دیگر مذاہب کے لیے تنگ نظر نہیں ہے ان مذاہب کی مزید تفصیل عامر بن علی کے دوسرے سفر نامے ''جہاں گردی'' میں تحریر کی گئی ہے۔ جہاں تک مذاہب کا تعلق ہے تو اس میں اعتقادات بھی شامل ہوتے ہیں مگر تعلیم کو نظرانداز ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ جدید دور کی فہم وفراست اور تدبر وفکر کرنے والی تعلیم یافتہ جاپانی قوم اپنے قدیم روایات سے بیزاری اور لادینیت کی وباء آپہنچی ہے جاپانیوں کے ساتھ نجی روایت سے ایسی باتیں منکشف ہوتی ہیں کہ غیر ممالک کے لوگ حیران رہ جائیں۔ ان میں سے ایک وہاں کے بدلتے سماجی رنگ اور روایات سے روگردانی ہے۔ تعلیمی نظام جاپان کی ترقی کی راہیں استوار کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فن لینڈ کے بعد جاپان کا تعلیمی نظام دنیا کا سب سے بہترین تعلیمی نظام مانا جاتا ہے۔ تعلیم سے فارغ التحصیل افراد محب وطن ہونے کے ناطے ملک و قوم کی ترقی میں مصروف عمل ہیں۔ اس تعلیمی نظام کی وجہ سے جاپانی نوجوان اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنیاد پر نئی ایجادات کر رہے ہیں اور یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ جاپان جدید دنیا میں تحقیق کا مرکز، بہترین نقال اور نئی دنیا کو جدید شکل دینے والا ملک ہے۔ جدید ٹیکنالوجی میں بہت سے ممالک پر سبقت لے جانے پر قادر ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے، ناصرف ان ترقیات بلکہ قدرتی، آبی علاج میں بھی پوری دنیا پر سبقت لے جانے والا ملک ہے اس کی وجہ وہاں پر آتش فشاں کے نتیجے میں نکلنے والے معدنی چشمے ہیں جو طبّی تاثرات رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی یہ ملک بہت خوش قسمت ہے۔ محنتی اور حب الوطنی جذبات میں جب قدرت آپ کو معدنیات اور دیگر وسائل سے نواز دے تو ترقی کرنا مقدر بن جایا کرتا ہے۔ کثیر تعداد میں دھاتیں اور معدنیات مثلاً سونا، چاندی، تانبا، سیسہ، قلعی، لوہا، مٹی کا تیل اور پتھر کا کوئلہ جاپان کی سرزمین پر بھرپور تعداد میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ سمندر اور بحریئے بھی جو جاپان کے گرد موجود ہیں وہ قوم کے لیے خوراک کا ایک لازوال ذخیرہ پیش کرتے ہیں جس میں بکثرت مچھلی پائی جاتی ہے جو چاول کے ساتھ عموماً استعمال ہوتی ہے۔

عادات واطوار میں جاپانی قوم کا کوئی ثانی نہیں۔ یہ قوم نظم وضبط قائم رکھنے والی، وقت کی پابند، فطرت کے رنگوں میں مثبت اور کارآمد اور بہتر سے بہترین رنگ کو منتخب کرنے والی متحد، حب الوطن اور خوددار قوم ہے جو قدامت پسند روایات پر قائم رہتے ہوئے تہذیب وثقافت کو نئی دنیا کے سانچے میں پرونا ان کے ترقیاتی مظاہر میں اعتدال پیدا کرتا ہے اور یہی طریقہ حیات جاپان ہمارے سفر نامہ نگار ''ابن انشاء'' کو متاثر کیے ہوئے ہیں۔ ابن انشاء جس قدر جاپانی تہذیب و ثقافت، اصول زندگی اور عادات واطوار سے متاثر ہیں شاید ہی دوسری تہذیبوں سے ہوئے ہوں۔ ان کے سفر نامہ 'دنیا گول ہے' سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی ترقی کے پس پردہ ان کی مجموعی طرز حیات کے انداز قابل رشک ہیں جو کہ اس قوم کے پرخلوص ہونے کے متعلق بتاتا ہے۔

ابن انشاء کے مطابق جاپان کی ثقافت اور سماجی زندگی پر امریکی اثرات غالب ہیں اور جاپانی قوم بھی انگریزوں کی طرح مادی طرزِ حیات کو ترجیح دیتے ہیں۔ بقول ابن انشاء:

**''جاپان میں امریکیوں نے ایسے آداب سکھائے ہیں کہ معاشرے کا ڈھانچہ ہی بدل گیا ہے۔ پچھلی بار کے سفر میں ہم نے جاپان کے ایک بڑے سے شکایت کی تھی کہ دیکھئے جاپانی خواتین کی عفت پر کھلم کھلا ڈاکے پڑ رہے ہیں۔۔۔ وہ جاپانی بزرگ مسکرائے اور بولے میاں کن چکروں میں پڑے ہو، پیسہ سب چیز ہے، ڈالر آتے ہیں آنے دو''**(۲)

ابن انشاء کے علاوہ ہمارے ادیبوں نے جاپان کے اس رویے پر اپنے سفر ناموں میں اظہار خیال کیا ہے مثلاً سید راس مسعود، ''جاپان اور اس کا تعلیمی نظام و نسق'' میں لکھتے ہیں کہ جاپان اور انگریز قوم میں خاصی مشابہت پائی جاتی ہے۔ نا صرف جغرافیائی لحاظ سے بلکہ تہذیب، تمدن، قوموں کے تال میں سے اپنے قومیت قائم کرنا اور تمکنت وغیرہ۔ اسی طرح بشریٰ رحمن صاحبہ ''ٹک ٹک دید کم ٹوکیو'' میں امریکیوں کی اندھی تقلید کرتی جاپانی قوم کا احوال بتاتے ہوئے لکھتی ہیں:

**''ہم نے امریکیوں سے اچھی اچھی باتیں بھی سیکھی ہیں اور بری بھی۔ بری بری کہتے وقت وہ ذرا سا لجائے۔ اور ہمت کر کے بولے۔ بری باتوں میں ایک تو ہفتے اور اتوار کی چھٹی ہے حالانکہ ہمیں دو دن کی چھٹی کی کیا ضرورت ہے۔ ہماری قوم کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے اور دوسری۔ نائٹ لائف ہے''**(۳)

رفیق ڈوگر اسی اثناء میں لکھتے ہیں کہ جاپانی قوم کی ہر ماں چاہتی ہے کہ اس کا بچہ انگریزی زبان اور طرزِ حیات سیکھے اور سکھائے۔ ان کے علاوہ جاپانیوں پر ہمارے ادیبوں میں جو بات زیادہ تر مماثلت رکھتی ہے وہ ہے سفر ناموں کے ذریعے عورت کے استحصال اور پستی کا بیانیہ۔ ہر دوسرے سفر نامہ نگار کے ہاں جاپانی عورت کے مقام کی تذلیل دیکھی جاسکتی ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ قدامت پسندی اور انگریزوں کی اندھا دھند تقلید ہے۔

ان کے علاوہ جاپانی قوم پر ہمارے ادیبوں نے خاصی خامہ فرسائی فرمائی ہے ان میں سے چند ایک سفر ناموں کے نام درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر محمد حسین کا سفر نامہ ''۱۹۰۷ کا جاپان''

ڈاکٹر پرویز پروازی کا سفر نامہ ''سورج کے ساتھ ساتھ''

محمد الاسلام فضلی کا سفر نامہ ''حقیقت جاپان''

الطاف شیخ کا سفر نامہ ''جاپان کے چار دن'' اور ''گیشاؤں کے دیس میں''

سید راس مسعود کا سفر نامہ ''روح جاپان''

ابن انشاء کا سفر نامہ ''دنیا گول ہے''

بیگم اختر ریاض الدین کا سفر نامہ ''سات سمندر پار''

ڈاکٹر محمد کامران کا سفر نامہ ''گ سے گڑیاچ سے جاپانی''

رفیق ڈوگر کے سفر نامے ''جاپان نورد'' میں بھی جاپان کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تاریخی احوال پر تفصیلی بیان ملتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں چند دیگر سفر ناموں کی طرح الطاف شیخ صاحب نے بھی جاپانیوں کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، اصول زندگی اور رسم ورواج پر صدیوں سے بنی سوچ بچار پر تحقیقی بات کی ہے۔ سب سے پہلے جاپانیوں کی تہذیب و ثقافت اور رسم ورواج پر مضامین کا تخلیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ان تمام تر سفر نامہ نگاروں میں ایک جدید نام عامر بن علی کا ہے جنہوں نے جاپانی قوم میں رہتے ہوئے وہاں کے تجربات سے مکمل آگاہی کے بعد دس سال میں چار سفر نامے لکھے ہیں جن میں ''آج کا جاپان''، ''جہاں گردی''، ''نگر نگر اک نظر'' اور ''مشرق کی طرف دیکھ'' ہے۔ ان سفر ناموں میں زیادہ تر جاپان کے حالات زندگی پر بات کی گئی ہے۔ جاپان کے علاوہ چند دیگر ممالک کے اسفار کو بھی مصنف نے قلمبند فرمایا ہے۔

ان تمام تر موضوعات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ اس باب کا اصل مقصد ہے۔ جائزہ لیتے وقت مصنف کے اس سفر نامے میں جو موضوعات زیادہ تر نظروں سے گزرے ہیں ان میں تہذیب و ثقافت، رسم و رواج، تعلیمی و ادبی موضوعات، دوسری جنگ عظیم (ہیروشیما اور ناگاساکی) اور سونامی سے ہونے والے ماضی میں نقصانات، ترقی کا سفر (جدید سائنس اور ٹیکنالوجی)، سیاست و صحافت، چند دوسرے ممالک کے ساتھ موازنہ (اخلاقی و سیاسی اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے) اور اس کے علاوہ چند شخصیات پر مصنف نے مضامین لکھے ہیں جس میں نا صرف جاپان بلکہ چند دیگر ممالک کی معروف شخصیات کے ساتھ ملاقات کی روداد اور ان کے اَن مٹ نقوش اور خراج تحسین پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

جاپان میں بہت ساری منفرد اور مثبت عادات و رسومات پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگ بے عیب زندگی کے خواہشمند ہوتے ہیں اور ان کی زندگی جاپانی اصول و ضوابط کے زیر اثر ہوتی ہے۔ یوں تو انسانی زندگی کے بہت سے رسم ورواج، اصول و اطوار، قومی و مذہبی احساس، برتری اور احساس کمتری، حد سے بڑھا ہوا جنسی تعصب یا پھر مافوق الفطرت عناصر اور جنات یا مذاہب پر اندھی تقلید۔ یہ تمام تر ثقافتی و اخلاقی خوبیاں اور خامیاں ہر ملک و قوم کے ماضی اور حال کا حصہ رہی ہیں اور انہی اطوار میں کہیں نہ کہیں ہماری تاریخ کا بہت بڑا اثر پایا جاتا ہے جو ہماری تہذیب پر اپنی چھاپ قائم رکھتا ہے۔ انسان یا قوم خواہ کتنی ہی ترقیات کی منازل طے کر کے خود کو جدید پیرائے میں ڈھال لے مگر کہیں نہ کہیں ماضی و تاریخ کے اثرات قائم رہتے ہیں۔

جاپانی قوم بھی ہمیشہ سے انہی اثرات کے زیر اثر رہی ہے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو قوم کو ضعیف الاعتقادی اپنی جڑ سے جڑے رہنے پر مجبور رکھتی ہے۔ جاپانی قوم کے لیے یہی کہا جاتا ہے کہ یہ قدیم روایات میں پھنسی ہوئی ترقی یافتہ قوم ہے جن کی روایات تو قدیم ہو سکتی ہیں مگر ان میں بہت ساری عادات دیگر جہانوں سے منفرد ہیں مثلاً جاپانی قوم انتہائی خوش گفتار اور حق گو ہیں۔ کتاب کا سب سے پہلا موضوع ہی جاپانیوں کی مسکراہٹ پر ہے جس میں جاپانیوں کے خلوص دل اور محبت بھری مسکراہٹوں کی سب سے بڑی وجہ مذہب کو شمار کرتے ہیں۔ شنتومت جاپان کا سب سے اہم مذہب ہے۔ مصنف اپنے مضمون کا آغاز یہاں سے کرتے ہیں کہ ''شنتو روح ہمیشہ مسکراتی ہے''، مسکرانا جاپانیوں کی اخلاقی عادات میں شمار کیا جاتا ہے۔ مسکراہٹ میں ایک جگہ مصنف نے مذہبی عقائد کو بنیادی وجہ قرار دیا ہے تو دوسری جگہ اس کو تجارتی معاملات اور دیگر کاروباری معاملات میں ضرورت کے طور پر پیش کیا ہے اور یہاں یہ مسکراہٹ کو اخلاقی عادات سے زیادہ ان کی ضرورت اور رسم و رواج گردانا جا سکتا ہے۔ اقتباس ہے:

> **''کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ شنتومت کی روحوں کو ہمیشہ مسکرانے کی تلقین اور فطری جذبات سے زیادہ ان مسکراہٹوں کے پیچھے ادارتی پالیسی کارفرما ہوتی ہے''**(۴)

دیگر عادات واطوار میں ایک سب سے خوبصورت چیز تحفے کا لین دین ہے جو جاپانیوں کی خصلت میں ہمیشہ سے شامل رہا ہے۔ یوں تو جاپانیوں کی طرز حیات نہایت سادہ ہے مگر ان کے سماج میں تحفے کی اہمیت باقاعدہ عادات ورسوم میں شمار کی جاتی ہے۔ اس زمرے میں ابن انشاء اپنے سفر نامے میں لکھتے ہیں:

> **''تحفے کا لین دین بھی ان کی طبعی عادات ورسوم میں ہے۔ جوابی تحفے کی قیمت کچھ قدر زیادہ ہونی چاہیے''**(۵)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> **''تحفہ لے کر شکریہ ادا کرنے کے آداب بھی جاپانیوں سے دیکھنے چاہیئے۔ وہ کھول کے نہ دیکھیں تب بھی کہیں گے کہ صاحب، بہت عمدہ ہے''**(۶)

اس سے مراد یہ کہ زندہ دلی اور خوش مزاجی میں جاپانی قوم اپنی مثال آپ ہیں اور ان کی یہی خصلت ابن انشاء کو بہت بھاتی ہے عامر بن علی لکھتے ہیں جاپانیوں کے رسم و آداب میں بہت باریکیاں پائی جاتی ہیں جو منفرد بھی ہیں اور اپنی مثال آپ بھی۔ مثلاً مصافحہ کرتے وقت خود کو مہمان کے سامنے سر خم کر لینا ان کی خوبصورت روایت میں ہمیشہ سے شامل رہا ہے اور مہمان نوازی میں ان کا کوئی ثانی نہیں مانا جاتا اور مہمان اور گاہک کو خدا کا درجہ دیتے ہیں، ان سے بات کرتے وقت مسکرانا، گفتگو کا انداز لطیف رکھنا اور بات کرتے وقت لفظوں کا چناؤ ان کے مہذب ہونے کی یقین دہانی کرواتے ہیں۔

جاپان قدیم اعتقادات میں پھنسا ہوا روایت پسند ملک ہے جس میں تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کے بے شمار رنگ اور پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں اکثر تضادات کا عنصر بھی شامل ہے۔ مثال کے طور پر اخلاقاً مسکرانا اور ضرورتاً مسکرانا، ایک طرف شہنشاہیت پرست ہیں تو دوسری طرف جمہوریت کے عناصر نظر آتے ہیں جس قدر سائنٹیفک تہذیب کے پروانے ہیں اسی قدر فنون لطیفہ کے دلدادہ بھی، ایک طرف مادیت پرستی کی لذت میں سرشار ہیں تو دوسری طرف تصوفانہ تصورات رکھتے ہوئے سکونت کے خواہشمند، کبھی نہ ہمیں مشرقی تہذیب کے علمبردار معلوم ہوتے ہیں تو کبھی مغربیت میں رچے بسے۔ بیک وقت امن جوئی اور جنگ جوئی میں مصروف قدامت پسندانہ رویہ لیے دو حصوں میں منقسم قوم معلوم ہوتے ہیں مگر اس حقیقت سے ہر گز روگردانی ممکن نہیں کہ رب کریم نے انہیں بے شمار قدرتی وسائل سے نوازا ہے۔ موسم بہار میں خوبصورت رنگوں کے پھول جس میں ''چیری بلاسم'' کا پھول سرفہرست ہے کا کھلنا۔ چیری بلاسم کے پھول جاپان کی خوبصورتی کی علامت ہیں۔ اس پھول کے کھلنے سے وہاں کی بہت ساری تقاریب کا انعقاد کیا جاتا ہے جن کا تفصیلی ذکر مصنف نے ''چیری بلاسم'' مضمون میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> **''ہمارے ہاں جیسے بسنت کا تہوار بہار کی آمد کا اعلان سمجھا جاتا رہا ہے اسی طرح جاپان میں چیری کے پھول کھلنے کو فصل بہار کی سند مانا جاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ چیری بلاسم دیکھنا یہاں باقاعدہ تہوار ہے''**(۷)

جاپان میں چیری بلاسم کے پھولوں کو دیکھنے کا تہوار مقامی زبان میں ''ہنامی'' کہلاتا ہے اور یہ ان کے بنیادی اجزاء میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایک جگہ تو چیری کے پھول کو جاپان کی روح بھی کہا گیا ہے۔ جہاں چیری کا پھول خوشگواری اور بہار کی علامت تصور کیا جاتا ہے وہاں خزاں کی رت کو جاپان میں پت جھڑ کا موسم مانتے ہیں۔ عامر بن علی نے نا صرف موسم بہار کے اثرات کا ذکر کیا ہے بلکہ خزاں کے اثرات بھی بیان کیے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ جاپان کی خزاں پتوں کے ساتھ ساتھ انسانی بالوں کو بھی لے اڑتی ہے اور بال گرنے کی شرح پتوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ جاپانیوں کے گرتے بالوں کو دیکھ کر وہاں کی حکومت نے مصنوعی بالوں کے پارلر کھولنے کا باقاعدہ اہتمام کر رکھا ہے کیونکہ خزاں کے جانے سے قدرتی طور پر نئے پتے تو پیدا ہو سکتے ہیں مگر بالوں کا قدرتی طور پر اگنا خاصہ مشکل عمل ہے۔ اقتباس ہے:

> **''خزاں کا پیڑوں اور انسانوں پر ایک ہی انداز میں، اتنی مماثلت کے ساتھ اثر انداز ہونا قدرت کا کرشمہ لگتا ہے۔ مشکل مگر یہ ہے کہ خزاں کے گزر جانے کے بعد درختوں پر نئے پتوں کا آنا یقینی ہوتا ہے جبکہ سر کے بالوں کے دوبارہ نمودار ہونے کی تھیوری پر یقین متزلزل ہے''**(۸)

موسموں کے ساتھ ساتھ جاپان کو مزیدار کھانوں کا مرکز بھی کہا جاتا ہے۔ جاپان کا شہر ''ٹوکیو'' دنیا کے معیاری اور مزیدار کھانوں میں نمبرون پر شمار کیا جاتا ہے اور ان کھانوں کے اثرات موسموں کی طرح انسانی زندگی پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ قدیم کھانوں کے شوقین جاپانی قوم دنیا بھر کے مقبول کھانوں کا مرکز بن چکی ہے۔ عامر بن علی نے اپنے مضمون ''مزیدار کھانوں کا شہر'' میں کھانے کے ساتھ ساتھ جاپانیوں کی ترقیات کا بھی ذکر کیا ہے کہ کیسے آج کا جاپان اپنے ریستورانوں میں بیروں کی جگہ روبوٹ کو استعمال کر رہا ہے۔

کھانوں کی مقبولیت تو ہے ہی مگر جاپان میں ریستورانوں کے ساتھ چند منفرد چیزوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ عامر بن علی اپنے سفر نامے آج کا جاپان میں بتاتے ہیں کہ جاپان میں ایک انوکھی تقریب منائی جاتی ہے جس کو ''شادی میٹنگ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس تقریب میں والدین اپنے نوجوان بیٹے اور بیٹیوں کو ریستورانوں میں اکٹھا کرتے ہیں جہاں اس تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے وہاں والدین اور بچوں کی ملاقات کروائی جاتی ہے اور ان کی پسند سے شادی بیاہ کے معاملات طے کیے جاتے ہیں۔ اسی مضمون میں دوسری طرف یہ بھی لکھتے ہیں کہ جہاں یہ تقریب شادی بیاہ کی غرض سے کی جاتی ہے وہاں طلاق کے معاملات بھی اسی طرح حل کیے جاتے ہیں۔

جاپانیوں کی یہ حیران کر دینے والی عادت میں چند مزید کا شمار مصنف نے اپنے ایک اور مضمون ''ایں جہانِ دگر است'' میں کیا ہے۔ مضمون کا احاطہ کرتے ہوئے جو چیزیں سامنے آئی ہیں ان میں ایک تو یہ کہ ریستورانوں میں کھانے پیش کرنے والے بیرے ٹپ وصول کرنا نا گوار سمجھتے ہیں یہ ان کے اصولوں اور روایت کے بالکل خلاف ہے۔ دوسرا یہ کہ صفائی کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے وہ گلی محلہ ہو یا سکول اور ریستوران وغیرہ۔ دیگر منفرد عادات میں چوری اور ڈکیتی کی واردات بہت کم ہونا اور بھکاریوں کی تعداد تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک اور اہم چیز وہاں کی مقبول اور حیران کن یہ ہے کہ وہاں پر اناؤنسمنٹ صرف زنانہ آواز میں کی جاتی ہے چاہے وہ سرکاری طور پر ہو یا نجی، چند ہنگامی صورتحال میں نوجوانوں کو اناؤنسمنٹ کی اجازت ہے مگر تعبیر ضرورت اسے جرم تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ زندگی کا تقریباً ہر پہلو جاپانیوں کے ہاں انفرادیت کا حامل ہے۔ جاپانی قوم بحیثیت مجموعی زندہ دل، خوش گفتار اور اخلاقی لحاظ سے معیار بلندی پر پائے جاتے ہیں۔ ان کی حق گوئی ان کو دیگر اقوام سے منفرد و معتبر بناتی ہے۔

مضمون ''کاک ٹیل'' میں عامر بن علی ان کی حق گوئی پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> **''جاپان کی ثقافت کو سمجھنے کے لیے آپ کو باقی دنیا کے متعلق ثقافتی اور سماجی معلومات شاید بہت زیادہ مدد نہ دے سکیں گے کیونکہ یہاں کے اخلاقی معیار اپنے ہیں جن کا یہاں کا معاشرہ سختی سے کاربند ہے۔ مثال کے طور پر جھوٹ بولنا کتنا برا خیال کیا جاتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے گزشتہ روز عدالت کی طرف سے دیا جانے**

والا فیصلہ ہماری مدد کرے گا۔۔۔ ٹھیکیدار کو جھوٹا الزام لگانے کے جرم میں تین سال قید کی سزا سنادی گئی جو کہ معطل ہے''(۹)

گو یا جاپانی قوم تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور اخلاقی اعتبار سے دیگر اقوام سے یکسر مختلف اور منفرد ہے اور ان کا طرز حیات، قدامت پسندانہ روایات ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ جہان دگر سے انفرادیت کے حامل جاپانی قوم اپنی مثال آپ ہیں۔

جاپان دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جہاں قاعدے قانون پر سختی سے عمل ہوتا ہے۔وہاں قدم قدم پر زندگی کے اصولوں پر عملدرآمد کرتی قوم کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔ جاپانی عادات واطور کی یہ ترتیب ان کے بچپن سے دینا شروع کر دیتے ہیں اور بچپن سے ان کو نظم و ضبط، اجتماعی ترقی، محب الوطنی اور محنت و مشقت کا درس دیا جاتا ہے۔ یہی ان کے پختہ اصول حیات بن کر تمام عمران کے ساتھ چلتے ہیں اور اسی طرح جاپانی قوم ترقی کی راہ پر چلتے چلتے مہذب اقوام میں شانہ بشانہ کھڑی نظر آتی ہے۔ جاپان کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے رفیق ڈوگر لکھتے ہیں:

''ان کے سکولوں میں بچوں کو روز اول سے اجتماعی علم اور اجتماعیت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شخصیت کی تعمیر کی بجائے اجتماعی تعمیر و ترقی کا سبق دیا جاتا ہے۔ سکول میں کلاس روم کی صفائی پر استانی دو چار لڑکوں کو نہیں لگاتی بچوں کو صفائی کا فرض سونپ کر خود سویٹر بننا شروع نہیں کر دیتی۔ ''آؤ بچو ہم اپنا کمرہ صاف کریں'' وہ خود صفائی شروع کرتے ہوئے کہتی ہے۔۔۔''(۱۰)

جاپان کے سکولوں میں سکھائے گئے آداب، عادات واطوار کی فہرست کھولیں تو حیرانی سے ہم جیسی قومیں دنگ رہ جائیں کہ کس طرح انہیں اساتذہ کرام اپنے قول و فعل سے زندگی کے بڑے بڑے سبق سکھا رہے ہیں۔انہیں کس طرح سکھایا جاتا ہے کہ جھوٹ اور چوری برا فعل ہے، دوسروں کو تنگ کرنا غلط بات ہے، محبتیں بانٹنا کتنا ضروری ہے، کتابوں سے لگاؤ کتنا مفید ہے، ذمہ دار اور خوش اخلاق بننے سے ہماری زندگیوں پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ انہی اخلاقی آداب کی تعلیم جاپانی قوم کو آج پستی سے بلندی تک لے آئی ہے۔ مضمون ''جاپان کا پرائمری نظام'' میں عامر بن علی نے جاپان کے تعلیمی نظام کو پرائمری تک مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جس میں پرائمری سکول میں بچوں کے داخلے اور ان کی آمد و رفت کا بہترین نظام۔ سرکار کی طرف سے مہیا کی جانے والی مفت تعلیم اور کھانے کا ذکر اور جاپان کی تعلیم کا ہمارے ملک پاکستان کے تعلیمی نظام کے ساتھ موازنہ شامل ہے۔

جاپان کی یونیورسٹی لیول کی تعلیم کا چیدہ چیدہ تذکرہ مضمون ''محبت کی سائنس'' میں ملتا ہے مگر منفرد انداز کے ساتھ۔ منفرد انداز سے مراد یہ ہے کہ وہاں پر کسی یونیورسٹی میں دیگر نصاب مثلاً بیالوجی، نفسیات، معاشیات وغیرہ کی طرح

محبت کی سائنس بھی ایک مکمل سبجیکٹ کی طرح پڑھایا اور سکھایا جاتا ہے۔ محبت کی سائنس نامی شعبے میں طلبا کی تعداد دیگر شعبہ جات سے بھی زیادہ دیکھی گئی ہے۔اسے پڑھانے والے پروفیسر اسے نیکی کا کام سمجھ کر پڑھاتے ہیں۔ مذکورہ پروفیسر کے خیالات رقم طراز ہیں فرماتے ہیں:

> ''ملکی آبادی مسلسل گھٹتی جارہی ہے۔لوگوں میں تمام عمر کنوارے رہنے کا رجحان فروغ پاتا جارہا ہے۔ایسے عالم میں لوگوں کی پسندیدگی کے معیار کا تجزیہ کرتے ہوئے بیالوجی، نفسیات اور معاشیات کے پہلوؤں کو ساتھ ملا کر موجودہ نوجوان نسل کو محبت کی جانب مائل کرنا ایک نیک کام ہے میں طلبا و طالبات کو محبت میں کامیابی کے کلیدی طریقے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں،اس سے بہتر کام بھلا کیا ہوسکتا ہے؟''(۱۱)

اوساکا شہر کی ''واسیدا یونیورسٹی'' کے متعلقہ شعبے میں رومانیت کے منطقی اور سائنسی انداز کے ساتھ ساتھ ناصرف جنس مخالف سے بات کرنے کے گر سکھائے جاتے ہیں بلکہ تبادلہ خیال کرنے کی صلاحیت کو بہتر بنانے کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔اس شعبہ کی مقبولیت تو عام ہے مگر مخالف بھی دیکھنے میں آئی ہے۔دیگر مضامین کی طرح اس مضمون میں بھی ربط کے ساتھ ساتھ پاکستان کی ''گورنمنٹ یونیورسٹی''(جہاں سے عامر بن علی نے تعلیم حاصل کی) کے ساتھ موازنہ موجود ہے اور اعتراضات کی چھوٹی سی فہرست بھی ادب اور ادیبوں کے ساتھ جاپان کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ تعلیم و تربیت کے ساتھ ادب اور ادیبوں کے مقام و مرتبہ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔اس کا تفصیلی بیانیہ ''آج کے جاپان'' میں شامل ہے۔ مضامین ''مطالعہ کا چلن''،اور ''پاکستانی ادیبوں کا دورہ جاپان'' میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ان مضامین میں دیگر اقوام کے ساتھ ادبی روابط کو بیان کیا گیا ہے۔ کتابوں سے محبت رکھنے والے ملتے اور وابستگیاں ظاہر کرتے جذبات کی ترسیل کرتے کبھی پاکستان جاتے ہیں تو کبھی جاپان میں ملاقاتیں کرتے ہیں۔

قدامت پسندانہ روایات میں جکڑی ہوئی یہ قوم اپنے تمام افراد کو پوری قوم کو ایک کنبہ سمجھتے ہیں اور اس کنبہ کا سب سے بڑا بزرگ اپنے شہنشاہ کو جانتے ہیں جس طرح شہنشاہیت ان کی پہچان اور تاریخ کا حصہ ہے اسی طرح یکجہتی، محب الوطنی اور اتحاد ان کی ترقی کا راز ہے۔ جاپانی قوم کی محنت طلبی و محنت پسندی اور جفاکشی، خودداری جیسے اوصاف نے اس قوم کو آسمانوں کی پرواز عطا کی ہے۔ماضی پرست اہل جاپان کے ترقیاتی دور کے بدلتے تناظر کو دیکھا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ کیسے انہوں نے جدید ٹیکنالوجی میں اپنا نام کمایا۔ گزشتہ صفحات میں اگرچہ یہ بات واضح کی گئی کہ اہل جاپان مسلسل زندگی کے ہر معاملے میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور بہتر سے بہتر قوم بننے کی جدوجہد جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں انہوں نے بہت ترقی کی ہے یہاں تک کہ جدید دنیا کا ایک اہم ملک تصور کیا جاتا

ہے۔ شاید ہی کوئی شعبہ حیات اور دنیاوی فن ہو جس میں جاپان نے دیگر اقوام کو متاثر نہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ ہر ادیب، سفر نامہ نگار اور چند شاعر بھی ان کی ترقیاتی روداد کو بیان کیے بنا نہ رہ سکے۔

جہاں تک عامر بن علی کا تعلق ہے تو انہوں نے وہاں عرصہ دراز گزارا ہے۔ وہاں کی ٹیکنالوجی اور ترقیات کے مناظر خود مشاہدہ فرمائے ہیں اور بہت حد تک ان کے گرویدہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں زیادہ تر جاپان کی ترقیات پر مضامین موجود ہیں۔ ''آج کے جاپان'' کے حصہ اول میں زیادہ تر مضامین ترقیات اور ٹیکنالوجی کی روداد بیان کر رہے ہیں جن میں دنیا کا بلند ترین مینار، جاگتا جہنم، جاپان بھارت بلٹ ٹرین معاہدہ، جاپان کا معاشی ارتقاء، محو حیرت ہوں کہ۔۔۔، ایڈیسن دیوتا، جدید ٹیکنالوجی، ٹوکیو اولمپک ۲۰۲۰ء، بلٹ ٹرین، جوہری توانائی کا مستقبل، مستقبل کی موٹر گاڑیاں، کوئلے سے توانائی کا حصول، تھری ڈی ٹیلی ویژن، موبائل فونوں سے سونے کی برآمد وغیرہ شامل ہیں۔

بلاشبہ جاپان ایک ایسا ملک ہے جہاں جا کر تیسری دنیا ہی کے لوگ نہیں بلکہ بے حد ترقی یافتہ ممالک کے باشندے بھی حیران رہ جاتے ہیں اس قدر حیرت انگیز ترقی کر چکا ہے خصوصاً الیکٹرونکس میں۔ برقی استعمال سے چلنے والی ہر دوسری چیز پر جاپانیوں کی مہر "Made in Japan" ثبت ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ جاپان کے اندر مختلف قسم کے مظاہر قدم قدم پر دیکھتے جا سکتے ہیں جیسا کہ جوہری توانائی سے قسم قسم کے کام لیے جا رہے ہیں نسل در نسل کی انتہائی منظم انداز میں فراہمی، معدنی ذخائر سے ترقیاتی وسائل تک کا سفر، حتیٰ کہ ایٹمی بحران سے نمٹنے کا موثر حل بھی اس کے پاس موجود ہے۔ جدید دور کی نئی ایجادات میں جاپان آج ہمارے جیسے ممالک سے کہیں آگے کھڑا ہے۔ مضمون ''ٹوکیو اولمپک ۲۰۲۰ء'' میں عامر بن علی جاپان کی جدید ٹیکنالوجی میں نئی ایجادات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> **''جدید ٹیکنالوجی اور جدیدیت جس طرح پوری دنیا کے لوگوں پر اثرانداز ہو رہی ہے اسی طرح جاپانیوں کو بھی متاثر کر رہی ہے لیکن یہاں پر ٹیکنالوجی کے اثرات باقی دنیا کی نسبت زیادہ گہرے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نئی سے نئی ایجاد ہونے والی چیز بھی یہاں کی غالب اکثریت کی قوت خرید میں ہوتی ہے''** (۱۲)

ٹیکنالوجی کی دوڑ میں جس طرح سائنس ترقی کر رہی ہے پیشگوئی کی جا سکتی ہے کہ جاپان اور دیگر ممالک مصنوعی انسان بنانے کے قابل ہو جائیں گے۔ ان مضامین میں جاپانیوں کی ایک منفرد عادت بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ ضعیف الاعتقادی، قدامت پسند جاپانی جہاں سائنس کے دلدادہ ہیں وہیں سائنس دانوں کی پوجا کا رجحان بھی عام ہے۔ کہیں کہیں تو سائنسدانوں کو خدا کا درجہ بھی حاصل ہے۔ 'ایڈیسن دیوتا' پر لکھا گیا مضمون اس بات کی دلیل پیش کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایڈیسن کو ''بجلی کا

دیوتا'' مانا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی ٹیکنالوجی کے ایجادات کے موجب کو خدا کا درجہ دیا گیا ہے۔ مضمون کے آخر میں مصنف کے اس بات کی تصدیق سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> **''مجھے تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ صرف تھامس ایڈیسن کو ہی یہاں دیوتا کا درجہ حاصل نہیں بلکہ جرمن سائنسدان ہرٹس کو بھی خدا کا اوتار مانا جاتا ہے۔ اس سے ہمیں یہاں کی صرف روحانیت کی جہتیں ہی معلوم نہیں ہوتی ہیں بلکہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت لوگوں کے ذہن میں کتنی زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں اس بات سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ یہاں سائنس دانوں کو کس تکریم اور تقدس سے دیکھا جاتا ہے''**(۱۳)

جاپانی قوم کی ترقیات میں مرد کے ساتھ ساتھ عورت بھی اہم کردار ادا کر رہی ہے اکثر مقامات پر پڑھنے کو آیا ہے کہ جاپانی لوگ عورت کی بہت تذلیل کرتے ہیں مگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر عورت مساوی طریقے سے اپنی قوم ترقیات میں مرد کے شانہ بشانہ کھڑی ہے۔ ٹیکنالوجی پر لکھے گئے ان مضامین میں زیادہ تر کمپنیوں کا ذکر ملتا ہے کہیں ویڈیو گیم بنانے والی کمپنی تو کہیں موبائل فونز بنانے والی کمپنی تو کہیں کھیلوں میں استعمال ہونے والی اشیاء کی کمپنیاں، موٹر گاڑیاں بنانے والی کمپنی تو کہیں ڈیجیٹل ٹی وی سکرین بنانے والی کمپنیاں، حتیٰ کہ روزمرہ کے استعمال میں آنے والی اشیاء کے بنانے والی کمپنیوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ ان کے ساتھ جاپانی قوم موازنہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ مصنف جاپان کا پاکستان کے ساتھ تقابل کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہم ابھی کتنا پیچھے کھڑے ہیں۔

تعمیراتی کام سے انسانی زندگی کے سہل ہونے کا یہ سفر طویل تو ہے مگر مفید ہونے کے ساتھ ساتھ نیکی کا عمل بھی تصور کیا جاتا ہے۔ آئی پیڈ سے انقلاب برپا کرنے والے ''سٹیو جاب'' کا ایک خوبصورت جملہ عامر بن علی نے اپنے مضمون ''جدید ٹیکنالوجی'' کے آخر میں شامل کیا ہے۔ یہاں رقم کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> **''انسانیت اس صاحب نظر کی احسان مند ہے جس نے انسانی زندگی میں بہت سی آسانیاں پیدا کر دیں''**(۱۴)

جہاں تک یہ جدید ٹیکنالوجی اور ایٹمی توانائی و ہتھیاروں کا چین کے ہاں ترقیاتی سفر کو دیکھتے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ بھی ہمارے سامنے آتی ہے ہیروشیما اور ناگاساکی۔ بچپن سے اب تک سنے جانے والے یہ دو مقبول ترین نام اپنے اندر داستان لیے ہوئے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی جاپان کے دو شہروں کے نام ہیں جن پر ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران ایٹمی بمباری کی گئی تھی۔ امریکیوں کی طرف سے کی گئی اس بمباری سے جو جاپانیوں کا جانی اور مالی نقصان ہوا آج چوہتر سال بعد بھی اس کا ازالہ کرنے میں جاپانیوں نے جی جان محنت لگا دی مگر مکمل طور پر وہ اثرات نہ مٹا سکی۔ جاپانیوں کے لیے یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ جذباتی لحاظ سے آج بھی وہ اس کو بھول نہیں پائے۔ اس سانحے پر سالانہ تقریبات منعقد کی جاتی

ہیں۔ایٹمی بمباری کی زد میں آنے والے لوگوں کی زبانی ان کی یادداشتیں سنی اور سنائی جاتی ہیں۔ مضمون ''ایٹمی بمباری کے ۶۴سال''میں اسی طرح ایک خاتون اپنے جذبات بیان کرتے ہوئے کہتی ہے:

> **''دو دن پہلے ایک خاتون ناگاساکی میں ۱۹۴۵ کے امریکی ایٹمی حملے کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ میں اس وقت ۱۳ سال کی تھی اس بمباری کے واقعے نے مجھے جذباتی طور پر ایسا شدید گھائل کیا کہ میں پچاس سال تک ایٹم بم گرنے کے واقعے کے متعلق ایک لفظ بھی زبان پر نہ لا سکی''**(۱۵)

جسمانی اور جذباتی طور پر نقصان اٹھانے والے ان معصوم لوگوں نے خود کو کس طرح اٹھایا اور اپنے گھائل جسموں کو سمیٹ کر وقت کی دوڑ میں چلنا شروع کیا اور آج وہ جس مقام پر کھڑے ہیں ہم سب ان کے شاہد ہیں۔جاپانی قوم نے خود کو مضبوط بنایا اور ترقی کی راہ اختیار کی۔آج اس قدر ٹیکنالوجی کا مالک ہے کہ کوئی بھی ان کی طرف بری نگاہ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتا ہے۔اس ایٹمی بمباری کو جاپانیوں نے اپنی کمزوری کی بجائے طاقت بنانا مناسب سمجھا اور ۴۷ سال کے اس عرصے میں ایٹم بم پر تمام تر تحقیقات مکمل کیں، ان کے اثرات، نقصانات اور فوائد اور استعمال کرنے کے تمام تر عوامل سے آشنائی حاصل کی۔ہیروشیما یونیورسٹی میں اس پر تحقیقات جاری و ساری ہیں۔ناگاساکی کی یونیورسٹی میں ہونے والی تحقیقات نے بتایا ہے کہ ۱۹۴۵ء کی بمباری میں ہلاک ہونے والوں کے جسموں سے اب تک تابکاری شعاعیں خارج ہو رہی ہیں۔اس تحقیق میں مزید ایٹم بم سے نکلنے والے مواد کے بارے میں یوں بتایا ہے:

> **''ایٹم بم میں استعمال ہونے والا پلوٹونیم نا صرف باہر سے انسانی جسم میں داخل ہوتا ہے بلکہ ایک دفعہ انسانی خلیوں میں داخل ہونے کے بعد مستقل طور پر ایٹمی شعاعوں کی شکل میں اسی سے خارج ہوتا رہتا ہے''**(۱۶)

انہی اسباب نے جاپان کو ٹیکنالوجی کی طرف مائل کیا اور آج یہ ملک اپنے ذاتی مواد کا مالک ہے۔ایٹمی پاور رکھنے والا طاقتور خطہ بن چکا ہے۔ایٹمی بمباری کے نقصانات سے ہٹ کر اس ملک کو ہر سال ایک ایسے سونامی اور طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو قدرت کی طرف سے آتا ہے۔جغرافیائی لحاظ سے جاپان کو مجمع الجزائر کہا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان تین ہزار سے زائد جزیروں پر مشتمل ہے۔ جزیروں کی قسمت آتش فشاں مادوں اور سونامیوں کے ساتھ جڑی ہوئی ہے انہی سونامیوں کا سامنا اکثر جاپان کو رہتا ہے کبھی آتش فشاں مادے پھٹتے ہیں اور شدید زلزلے آتے ہیں تو کبھی سونامیاں اس خطے کو گھیرے رکھتی ہیں۔ان طوفانوں کی بدولت جاپان اکثر جانی و مالی نقصان سے دوچار رہتا ہے مگر دوسری طرف یہی آتش فشاں جاپانیوں کو زرخیزی اور معدنی وسائل فراہم کرنے کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ مثلاً آتش فشاں پہاڑوں نے۔۔اور معدنی چشمے

جو مختلف طبّی تاثرات رکھتے ہیں ملک میں اس کثرت سے پیدا کر دیئے ہیں کہ آبی علاج میں جاپان کا دنیا کے دیگر ممالک پر عنقریب سبقت لے جانا ممکن ہے۔

اس کے علاوہ جاپان میں کثرت سے دھاتیں اور معدنیات مثلاً سونا، چاندی، تانبا، سیسہ، قلعی، لوہا، مٹی کا تیل اور پتھر کا کوئلہ وغیرہ موجود ہے جو معدنی وسائل کو پورا کرتا ہے۔ انہی وسائل نے برقی و جوہری توانائی کے حصول میں خاصی مدد فراہم کی ہے جس کی بدولت جاپان غربت کے گڑھوں سے نکل کر بلندیوں تک پہنچ چکا ہے۔ قدرتی وسائل کی ان فراوانیوں کو جاپان اپنی قسمت سمجھتا ہے اور ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ معدنی وسائل کی اس فراوانی نے ترقی یافتہ ممالک کو بھی تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ترقی یافتہ ان ممالک کا تعجب بجا ہے۔ جیسا کہ پروفیسر سویامانے (استاد شعبہ اردو، اوساکا یونیورسٹی) نے فرمایا ہے کہ کسی بھی چیز کی شناخت دوسری چیز کے ساتھ مقابلہ کرنے ہی سے واضح ہوتی ہے یا پھر کسی بھی شخص یا معاشرے کی خوبیاں اور خامیاں دوسرے معاشرے سے تعلق رکھنے والے ہی بتا سکتے ہیں۔ ہمارے مصنف نے بلاشبہ ایک طویل عرصہ جاپان میں گزارا، اسے دیکھا، جانچا، ترقیاتی مناظر سے روبرو ہوئے اور تجربات کی کثرت نے انہیں کسی حد تک مجبور ضرور کیا کہ وہ ان ترقیات کی روداد بیان کریں اور اپنے اور دیگر ممالک کو ان کی خوبیوں سے روشناس کروائیں جن کی بدولت آج جاپان مہذب اقوام کی فہرست میں موجود ہے۔ پاکستانی ہونے کے ناطے ہمارے مصنف عامر بن علی صاحب سب سے پہلے ہمارے ملک کو یہ آشنائی فراہم کرنا چاہتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ کس طرح وسائل کو استعمال کیا جاتا ہے، کس طرح مہذب اقوام کی فہرست میں شامل ہوا جاتا ہے اور کس طرح ہمارا ملک ترقی کر سکتا ہے۔

سفر نامہ ''آج کا جاپان'' زیادہ تر موازنہ پر مشتمل ہے کہیں ترقیاتی موازنہ ہے تو کہیں تعلیمی نظام کی ترسیل اور بہتری پر خیالات، ٹیکنالوجی میں موازنہ تو ہر دوسرے مضمون میں موجود ہے۔ موازنے کی اس فہرست میں سب سے پہلا نام ہمارے ملک پاکستان کا ہے۔ اس کے بعد دیگر ممالک مثلاً امریکا، چین، کوریا، اسرائیل، سنگاپور اور چند دیگر ایشیائی و ڈرچی ممالک شامل ہیں۔

موازنہ میں نا صرف ترقیاتی عوامل شامل ہیں بلکہ دیگر چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی عادات بھی شامل ہیں جیسا کہ ٹوکیو اور کراچی شہر کی مہنگائی کا موازنہ، تعلیمی نظام کا موازنہ، سی این جی کا بطور اینڈ حسن دستیابی کے باہمی امتزاج پر بات ہو۔ موٹر گاڑیوں کی خرید و فروخت کا ذکر آئے یا موبائل فون کمپنیوں کا ذکر، کہیں توانائی کے بحران کا ذکر ہوتا ہے تو کہیں جوہری توانائی کی فراوانی اور حصول کے لیے دیگر ممالک کی تشویش کا اظہار، حتیٰ کہ کاروباری، ادبی، سیاسی، صحافتی اور ترقیاتی لحاظ سے ہر پہلو پر بات کرتے کرتے ہمارے مصنف موازنہ کی طرف چلے جاتے ہیں اور جاپانیوں کی خوبیوں کو باور کرواتے ہیں۔

موازنہ کی بات ہو تو اس کا ایک اور رخ ہمارے سامنے آیا ہے معاہدہ، دوسرے ممالک کے ساتھ معاہدہ۔ جاپان جس ترقیاتی مقام پر کھڑا ہے ہر دوسرا ملک چاہتا ہے وہ بھی جاپانی وسائل سے فائدہ اٹھا سکے اور اپنی ضروریات پوری کر سکے۔

انہی وسائل (معدنیات، توانائی) وغیرہ کی تحصیل کے لیے جاپان کے ساتھ چند دوسرے ممالک کے معاہدات کا ذکر بھی اس سفر نامے کا ایک موضوع ہے۔ مضمون ''جاپان بھارت بلٹ ٹرین معاہدہ'' میں ہندوستان اور جاپان کے معاہدے کی تفصیل موجود ہے لکھتے ہیں:

> ''تازہ خبر یہ ہے کہ جاپان اور ہندوستان کی حکومت کے درمیان عنقریب اس بلٹ ٹرین کے متعلق معاہدہ طے پانے جارہا ہے۔اس معاہدے کے تحت جاپان اپنی تیز ترین ٹرین کی ٹیکنالوجی، ''شن کان سین'' کہا جاتا ہے اور مذکورہ بالا ریکارڈ بنانے والی ٹرین بھی اسی بلٹ ٹرین سیریز کا حصہ ہے، بھارت کو فراہم کرے گا''(۱۷)

اس معاہدہ کے تمام پہلوؤں پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے مثلاً ریلوے لائن کیسے بچھائی جائے گی؟ ٹریک کیا ہو گا؟ اس منصوبے کی لاگت کیا آئے گی؟ اور اس معاہدہ سے ہونے والے فوائد کا ذکر۔ معاہدہ جو بھی ہو یا جن بھی ممالک کے درمیان ہو فائدہ دونوں کو ہوتا ہے اس کی مثال ہم زمانہ قدیم میں ترک قوم کے سلطان عبدالمجید کے ٹرین معاہدے سے لے سکتے ہیں۔ اس دور میں بھی ایشیائی ممالک کی ترقی کے ساتھ ٹرین کا معاہدہ خاصہ مفید ثابت ہوا تھا۔ دونوں ممالک میں آمدورفت اور نقل و حرکت کی سہولیات میسر آئی تھیں۔اسی طرح یہ معاہدہ بھی دونوں ممالک کے مابین تعمیراتی اور ترقیاتی منصوبہ کہلاتا ہے۔ معاہدے اور منصوبے کا تعلق سیاسی، سفارتی اور صحافتی طور پر دو ممالک کے درمیان ہوتا ہے۔ سیاست و صحافت ہر ملک و قوم کی جڑی ہوتی ہے جس کے ذریعے اپنے ملک کی ترقیاتی منصوبہ بندی کی جاتی ہے بلکہ ملک و قوم کی بہتری کے لیے کس ملک سے کیا درآمد کیا برآمد کرنا ہے یہ بھی طے پایا جاتا ہے، ملک و قوم کا نظام سیاسی نظام کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ یوں کہہ لیں کہ سیاست و صحافت پر ملک و قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہوتا ہے۔

جہاں تک عامر بن علی کا تعلق ہے تو پیشے کے لحاظ سے صحافی بھی ہیں اور بزنس مین بھی جنہیں بہت سارے ممالک کی سیر کا موقع میسر ہوا۔ وہاں کی سیاست اور سیاسی شخصیات سے ملاقات و مذاکرات، تجارتی و سیاحتی وادبی لحاظ سے ہوتی رہی ہیں ان ممالک کا بغور مشاہدہ کرنے کا بھی سنہری موقع ملتا رہا ہے۔ان تمام مشاہدات کو عامر بن علی صاحب وقتاً فوقتاً قلمبند کرتے رہے ہیں۔ اکثر سفر ناموں میں ان کی روداد سیاحت و صحافت موجود ہے۔ ''آج کا جاپان'' میں حصہ اول تقریباً آٹھ سے نو مضامین ان کی سیاسی و صحافتی سیاحت پر موجود ہیں جن میں جاپان کے دیگر ممالک کے ساتھ معاہدات وہاں کی برآمدات، دوسرے ممالک کے صدر کا دورہ جاپان اور آپسی تعلقات کا ذکر اور امریکیوں اور دیگر ممالک کے ساتھ سفارتی اور ترقیاتی معاملات تمام تر ذکر ان مضامین میں شامل ہے۔ ان میں زیادہ تر پاکستان، بھارت اور امریکا کے ساتھ سیاسی و سفارتی تعلقات کا بیانیہ موجود ہے۔ پاکستان اور جاپان کے سفارتی تعلقات کو ہمارے مصنف یوں تحریر کرتے ہیں:

**''پاکستان اور جاپان کے سفارتی تعلقات ۱۹۵۲ء میں قائم ہونے والے تھے۔اپنی ابتداء سے لے کر آج تک ان دونوں ممالک کے باہمی تعلقات بحیثیت مجموعی انتہائی خوشگوار رہے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان تعلقات میں بہتری آرہی ہے''** (۱۸)

پاکستان کی طرح امریکیوں کے ساتھ بھی جاپان کا سیاسی تعلق ہمیشہ سے قائم رہا ہے۔ یہ تعلق کبھی نقصان کا باعث بنتا تو کبھی مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہاں پر مضمون ''امریکی فوجی اڈا اور وزیراعظم کا استعفیٰ'' میں ایک اڈے پر مباحث جاری ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان کی سرزمین اوکی ناوا جزیرے پر امریکی فوجی اڈا قائم کیا گیا تھا جس کی منتقلی کے معاملات جاری وساری ہیں۔ یہاں سفر نامے میں اس کا ذکر کرتے ہوئے ہمارے مصنف لکھتے ہیں:

**''دوسری جنگ عظیم میں جاپان پر قبضے کے بعد امریکا نے اوکی ناوا جزیرے پر اپنا سب سے بڑا فوجی اڈا قائم کیا تھا لیکن اپنے قیام سے لے کر آج تک اس فوجی اڈے کی حیثیت متنازعہ رہی ہے۔ سالہاسال سے مقامی لوگ اور حکومت اس فوجی اڈے کو جزیرے سے باہر منتقل کرنے کا مطالبہ کرتے آئے ہیں۔''** (۱۹)

اس فوجی اڈے کے تنازعات اتنے بڑھ گئے کہ جاپان کے صدر کو مستعفی ہونا پڑا مگر معاملہ حل نہ ہو پایا۔ جہاں تک صحافت کا ذکر ہے تو ہمارے مصنف خود ایک بہترین صحافی ہیں جنہوں نے بہت سارے کالم اور اشتہارات قلمبند فرمائے ہیں ان میں اکثر وبیشتر دیگر ممالک کے سیاسی و معاشی حالات تھے اور اکثر میں خصوصاً جاپان موضوع رہا ہے۔

یہ بات مسلمہ حقیقت رکھتی ہے کہ اخبار کلیدی ذریعہ اطلاعات ہے۔ جس سنجیدگی اور طوالت کا مظاہرہ اخبارات کرتے ہیں وہ ہمیں ٹی وی سکرین پر بھی میسر نہیں ہو سکتے۔ ٹی وی سکرین سے اخبار کو بہتر جانا جاتا ہے کیونکہ اس کی دستیابی اور سہولت زیادہ ہے کہیں بھی جاتے ہوئے اسے ہاتھ میں پکڑا جا سکتا ہے سفر کے دوران بہترین ساتھی کا کام بھی دیتے ہیں۔ مضمون میں ایک جگہ تحریر کیا ہے:

**''گزشتہ روز اس سروے کے نتائج کا اعلان ہوا جس کے مطابق ۹۲ فیصد لوگوں کے لیے خبروں تک رسائی کا کلیدی ذریعہ اخبار ہے''** (۲۰)

موجودہ دور جہاں ٹیکنالوجی کے ذرائع بہت زیادہ ہیں وہاں اخبار کی کلیدی حیثیت بہت کم رہ گئی ہے لوگ انٹرنیٹ اور موبائل کو اخبار پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ آنے والے دنوں میں اخبار کی اہمیت کم ہونے کا امکان ہے۔اس حقیقت کے باوجود اخباری صحافت کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی جس کی وجہ مصنف نے یہاں یوں بتائی ہے:

**''شاید اسی لیے اخبارات میں جو سنجیدگی اور بلوغت نظر آتی ہے اس کا ٹی وی نیوز چینلز میں عموماً فقدان نظر آتا ہے''** (۲۱)

مزید یہ بھی ذریعہ ابلاغ اور صحافت کے بارے میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اشتہارات بھی ذریعہ ابلاغ کا ضروری شعبہ ہے۔ الیکٹرانک میڈیا ہو خواہ پرنٹ میڈیا، ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی اہمیت دونوں بہت زیادہ ہیں۔ دونوں کے ذریعے قاری دنیا کی تمام تر خبروں سے آگاہی حاصل کرتا رہتا ہے اور یہی صحافت کا اصل مقصد ہے۔ علاوہ ازیں حصہ اول میں چند متفرق موضوعات بھی نظر آتے ہیں جن میں جانوروں سے عقیدت، مذہب کی اہمیت، سوشل میڈیا کے فوائد و نقصانات، جوئے کا ذکر، شخصیات کے متعلق بیان اور جاپان کی انوکھی روایت خودکشی کا رجحان شامل ہیں۔ ان تمام موضوعات کے مطالعے کے بعد ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مصنف عامر بن علی نے جاپان اور جاپانیوں کی زندگی کا بیشتر حصہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جس سے بخوبی ہم گھر بیٹھے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں اور خود میں یہ خوبیاں پیدا کر کے مہذب اقوام میں شامل ہو سکتے ہیں۔

زیر تحقیق کتاب ''آج کا جاپان'' کا حصہ دوم چند متفرق اور متنوع موضوعات پر مشتمل ہے جس میں مختلف ممالک کی مقبول شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پاکستان کی سیاست اور معاشیات کے حوالے سے بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے اس حصے میں تقابلی کا لفظ استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ مختلف شخصیات کا موازنہ دیکھنے کو ملتا ہے کہیں دوہری شہریت کے فوائد سے آگاہی فراہم ہوتی ہے۔ کتاب کی رونمائی کے حوالے سے بھی چند ایک مضمون مصنف نے تحریر کیے ہیں۔

عامر بن علی ایک محب وطن پاکستانی ہونے کے ناطے اپنے ملک کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہم پاکستانی قوم ہیں ہمیں چاہیے دنیا میں پاکستان کی خوبصورتی اور اصل تصویر پیش کر کے پاکستان کے حالات چاہے جیسے بھی ہوں، عالمی سطح پر ہمارے ملکی امیج خراب ہونے کی وجوہات چاہے جو بھی ہوں لیکن پاکستان سے تعلق رکھنے والا ہر انسان چاہے پاکستان میں مقیم ہو یا بیرون ملک وہ خود کو پاکستان کا سفیر سمجھے اور پاکستان کا امیج بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ ہر قوم کے فرد کا تعلق ملک سے ہے اگر فرد اچھا ہے تو قوم بھی اچھی ہے، اگر فرد برا ہے تو قوم بھی بری ہے۔ اس حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

> **''آپ کا اور میرا نام ہی پاکستانی قوم ہے، اگر آپ اور میں اچھے ہیں تو پھر پاکستانی قوم اچھی ہے اگر آپ اور میں برے ہیں تو پھر ہماری قوم بھی بری ہے، یہ بات ممکن ہی نہیں کہ آپ بھی اچھے ہوں، اور میں بھی اچھا ہوں ہی، مگر قوم بری قرار دی جائے''**(۲۲)

پاکستان کا عالمی سطح پر امیج خراب کرنے والے جہاں سامنے آتے ہیں وہاں ہی پاکستان کا مثبت امیج ابھارنے والوں کی کمی نہیں۔ پاکستان میں بے شمار نامور ایسے ستارے ہیں جو پاکستان کے لیے اعزاز ہیں۔ ایسا ہی ایک چمکتا ہوا ستارہ نصرت فتح علی خان تھے جو دنیا بھر میں موت کے بعد بھی پاکستان کی مثبت امیج ابھارنے کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ نصرت فتح علی

خان کو نا صرف پاکستان میں بلکہ دنیا بھر میں خاص مقبولیت حاصل تھی۔ عامر بن علی ''نصرت فتح علی خان'' کے بارے میں ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> **''اگر میں کہوں کہ ہندوستان کے کسی گلوکار کو عالمی سطح پر نصرت فتح علی خان کی مقبولیت کا دسواں حصہ بھی آج تک نصیب نہیں ہوا تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہو گا۔''** (۲۳)

پاکستان کو نصرت فتح علی خان کی طرح اور بہت ساری نامور شخصیات کا مالک ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ پاکستان میں جو بھی مسائل ہیں وہ یکساں نوعیت کے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے قوم کو اجتماعی سوچ اور اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ عامر بن علی پاکستانی سیاست کے حوالے سے بھی بات کرتے ہیں کہ پاکستانیوں کو جن مسائل نے زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے یہ زنجیریں پاکستانی قوم نے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے۔ ان زنجیروں کی رہائی کے لیے پاکستانی عوام پاکستان کے حکمرانوں کو امید و التجا کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان حکمرانوں کو چننے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا کردار، جذبہ ایثار، اخلاق اور اہلیت کا دیکھا جائے تاکہ پاکستان ایک کامیاب ملک بن سکے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> **''اگر ہم ذات، برادری کی زنجیروں میں جکڑے، فرقہ و مسلک کے اسیر ہو کر، زبان، نسل اور قبائلی تعصبات کی بیڑیاں پہن کر اپنے نمائندے منتخب کریں گے تو پھر مسائل کی قید سے رہائی کبھی ممکن نہیں ہو گی ہمیں ان تعصبات سے بالاتر ہو کر سوچنا پڑے گا''** (۲۴)

سفر نامہ نگار کے مطابق پاکستان کے تمام مسائل کا حل جمہوری نظام کے ذریعے نکلے گا۔ یہ ہی دنیا میں اب تک بہترین نظام حکومت ہے۔ پاکستان میں الیکشن کے نتائج کے حوالے سے برسوں سے روایت چلی آرہی ہے کہ الیکشن میں ایک فریق جیتتا ہے تو دوسرا فریق ہارتا نہیں بلکہ دھاندلی کا شور مچاتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اس روایت کو ختم کر کے نتائج کو تسلیم کرنا چاہیے، یہ پاکستان کی ترقی کے لیے ایک مثبت قدم ہے۔

عامر بن علی پاکستان کے الیکشن کمیشن جو حکم نامہ جاری کیا جس کے مطابق دوہری شہریت کے حامل افراد الیکشن نہیں لڑ سکتے، اس حکم نامہ کی مذمت کرتے ہیں۔ یہ حکم نامہ جمہوریت کی روح کے منافی ہے۔ دنیا کے بہت سے کامیاب ممالک میں جمہوری نظام رائج ہے دوہری شہریت رکھنے والے افراد کو سیاست میں حصہ لینا اور عوام کو حکمران چننے کا پورا پورا حق دیا جاتا ہے جبکہ پاکستان میں دوہری شہریت کے حامل افراد کو الیکشن کے لیے نااہل قرار دیا گیا ہے، یہ طرز حکومت جمہوری نہیں بلکہ آمرانہ ہے۔ پاکستان کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ دوہری شہریت رکھنے والے پاکستانیوں کو برابری کے حقوق ملیں۔ کوئی بھی ایسا قانون ملک میں لاگو نہیں ہونا چاہیے جس کے مطابق تارکین وطن پاکستانیوں کو، پاکستانیوں سے کم تر

سمجھا جائے کیونکہ سمندر پار پاکستانی ہی پاکستان کا قیمتی اثاثہ ہیں اُن کا بنیادی حق ہے کہ انہیں بھی عام شہریوں کے برابر حقوق دیئے جائیں۔ مصنف لکھتے ہیں:

**"دوہری شہریت کے مخالف نظریات رکھنے والے دوستوں سے میری گزارش ہے کہ وہ اپنی سوچ پر نظرِ ثانی کریں۔ دلیل کو تسلیم کر لینے سے آدمی چھوٹا نہیں ہو جاتا، میری نظر میں تو دلیل کو تسلیم کر لینے سے انسان کا قد کاٹھ مزید بڑھ جاتا ہے"**(۲۵)

سابق وزیر اعظم نواز شریف نے اس حکم نامہ کی مذمت کی ہے اور دوہری شہریت کی پابندی کے خاتمے کا اعلان کیا کیونکہ ان کے مطابق دوہری شہریت رکھنے والے پاکستانیوں کی وفاداری اور حب الوطنی کو شک کی نگاہ سے دیکھنا ان کی توہین ہے۔ ہمیں پاکستان میں ایسا نظام لانا چاہیے یا ایسی حکومت کا انتخاب کرنا چاہیے جو اپنے وجود کو برقرار رکھنے کی بجائے لوگوں کے مسائل کا حل نکالے اور حکومت کے مثبت اقدام کو سراہنا چاہیے جیسا کہ لاہور میں پاک ٹی ہاؤس کی بندش کو ختم کر کے اس کو نیا روپ دینا حکومت کا ایک مثبت قدم ہے۔ اس چائے خانے کا قیام ۱۹۴۰ء میں کیا گیا تھا اور اس کا نام انڈیا ٹی ہاؤس رکھا گیا ۱۹۴۸ء میں انڈیا ٹی ہاؤس کے نام سے نام تبدیل کر کے پاک ٹی ہاؤس رکھ دیا گیا لیکن تختی پر پاک ٹی ہاؤس کی ابتداء ۱۹۴۸ء لکھی گئی۔ اس ٹی ہاؤس میں رخصت ہونے والے تمام ادباء کی تصاویر لگائی گئی ہیں جو ان کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ سفر نامہ نگار ٹی ہاؤس کی بحالی کے حوالے سے بتاتے ہیں:

**"مسلم لیگ (ن) کی قیادت اس منصوبے کو اپنا کارنامہ شمار کر سکتی ہے اور اس کامیابی کے لیے وہ داد اور تحسین کی مستحق بھی ہے"**(۲۶)

عامر بن علی مسلم لیگ (ن) کے کارناموں کو سراہتے ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ تمام عالم میں جہاں پاکستان پر بے جا تنقید کی جاتی ہے وہاں پاکستان میں ہونے والے مثبت کاموں کو بھی سراہنا چاہیے۔

پاکستان کے بارے میں جہاں منفی سوچ رکھی جاتی ہے وہاں ضروری ہے کہ مثبت پہلوؤں کو بھی زیر غور رکھا جائے۔ پاکستان غربت، بے روزگاری، جہالت، کرپشن، بدامنی، لوڈشیڈنگ اور مہنگائی کے باوجود کپڑے ایکسپورٹ کرنے والا دوسرا بڑا ملک ہے۔ اٹلی کے بعد پاکستان دوسرے نمبر پر وہ ملک ہے جو سب سے زیادہ جوتے ایکسپورٹ کرتا ہے۔ پاکستان پر تنقید کرتے وقت ان باتوں کو مد نظر رکھنا ضروری ہے۔ بقول عامر بن علی:

**"پاکستان کی جغرافیائی اہمیت اور اس کے قدرتی وسائل تو حال ہی ہمارے میڈیا کا موضوع بنتے ہیں لیکن دستیاب نامساعد حالات میں بھی پاکستان کی برآمدات ترقی کرتے ہوئے اگر سالانہ پچیس ارب ڈالر تک پہنچ گئی ہے تو یہ پاکستانی قوم کی ہمت، سخت جانی اور جنگجویانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے جس کی تحسین ہونی چاہیے"**(۲۷)

پاکستان کے تمام نامساعد حالات کے باوجود پاکستانیوں کی لگن، محنت اور جذبے کے بل بوتے پر پاکستانی ایکسپورٹ کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک نہیں پہنچ سکی تھی بلاشبہ پاکستانیوں کے لیے یہ باعث فخر بات ہے۔

اسی طرح پاکستانی قوم ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر فخر کرتی ہے۔ پاکستانیوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان (جو کہ ایٹمی پروگرام کے بانی و موجد تھے) کو محسن پاکستان کا خطاب دیا ہے۔ سفر نامہ نگار ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا تقابل آئن سٹائن سے کرتے ہیں۔ جرمن نژاد امریکی سائنسدان آئن سٹائن کو امریکا میں بالخصوص پورے مغرب میں عقل اور ذہانت کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔ عامر بن علی اپنی تصنیف میں اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ آئن سٹائن کے اعلیٰ مقام و مرتبے کے پیچھے ایک اہم محرک ان کا یہودی مذہب کا پیروکار ہونا ہے۔ دنیا میں بہت سے سائنسدانوں نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں لیکن جو مقبولیت آئن سٹائن کو حاصل ہوئی وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوئی۔ مصنف اس کی مثال اس طرح پیش کرتے ہیں:

> **''یوں تو ہالی وڈ کی فلم انڈسٹری کے زیادہ تر سٹوڈیو مالکان، پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ڈسٹری بیوٹر یہودی ہیں، مگر شاید یہ اتفاق ہی ہو کہ جس فلم میں بھی آئن سٹائن کا ذکر ہو اس کا پروڈیوسر یا پھر ڈائریکٹر ضرور یہودی ہو گا۔ عالمی میڈیا آئن سٹائن کا خوبصورت امیج بنانے میں ایک اہم محرک ہے''** (۲۸)

جرمنی نژاد امریکی سائنسدان آئن سٹائن کی طرح پاکستانی قوم ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر فخر کرتی ہے پاکستان میں ان کی پہچان ایک ہیرو کی نسبت سے رہی ہے سائنس کے میدان میں ڈاکٹر عبدالقدیر کا کارنامہ بہت ہی عظیم سمجھا جاتا ہے۔ انہیں بھی فقط ایٹمی بم کی نسبت محسن پاکستان کا خطاب دیا گیا ہے۔ مصنف دونوں شخصیات کے حوالے سے حقیقت سے روشناس کرواتے ہیں اور قارئین کی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔

اسی طرح مصنف آگے چل کر ہندوستان کی دو نامور شخصیات گاندھی اور موتی لال نہرو کا دو خطوط کے ذریعے موازنہ کرتے ہیں گاندھی اپنے خط میں موتی لال نہرو کو عوام کے سامنے شراب نوشی کرنے سے منع کرتے ہیں جبکہ موتی لال نہرو اس خط کے جواب میں لکھتے ہیں کہ گاندھی جی! آپ مجھے کیوں پاکھنڈی بنانا چاہتے ہیں میں جو ہوں سب کے سامنے وہی نظر آتا ہوں۔ عامر بن علی ان دو خطوط کے ذریعے واضح کرتے ہیں کہ گاندھی منافق اور مکار ہے جبکہ اس کی نسبت نہرو کم منافق تھے۔ عامر بن علی نے ان خطوط کے متعلق اظہار خیال کچھ یوں کیا ہے:

> **''ان خطوط سے ہمیں بڑی حد تک ان حضرات کے سوچنے کا ڈھنگ اور زندگی گزارنے کا انداز سمجھ آتا ہے گاندھی کے رویے میں ہمیں صاف منافقت اور چھلکتی**

**ہوئی مکاری نظر آرہی ہے جو کہ شراب چھوڑنے کا نہیں کہہ رہا بلکہ اسے لوگوں کے سامنے پینے کی ممانت کر رہا ہے گویا شراب میں تو کوئی خرابی وہ نہیں سمجھتے صرف عوام کے سامنے اسے پینے پر معترض ہیں"**(۹۲)

گاندھی کے مقابلے میں ہمارے عظیم رہنما قائداعظم محمد علی جناح کا طرز زندگی اور انداز سیاست بالکل مختلف تھا وہ سوانگ اور ڈھونگ کے قائل نہیں تھے آپ کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ قائداعظم کا گاندھی کے منافقانہ رویے کی وجہ سے اس پر اعتبار اٹھا گیا تھا جس کی بناء پر قائداعظم نے کانگریس کو خیر آباد کہہ دیا۔ اس کے برعکس پاکستان کے عظیم لیڈر کی شخصیت میں بناوٹ، اکھنڈ اور ڈھونگ کا الزام ان کے شدید ترین مخالفین نے بھی نہیں کیا۔

حصہ دوم کے آخر میں مصنف کتاب کی رونمائی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ پاکستان کے ذرائع ابلاغ میں مایوسی کی باتیں کرنا عام بات ہے بلکہ فیشن کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ ایسے ماحول میں سید احتشام ضمیر پاکستانی قوم کے روشن مستقبل کے لیے پُرامید ہیں انہوں نے اخباری کالموں کا مجموعہ ''متاع ضمیر'' شائع کر کے وطن عزیز کے سپاہی کی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس کتاب کو نستعلیق مطبوعات لاہور سے شائع کیا گیا ہے اور اس کا دیباچہ نامور ادیب عطاء الحق قاسمی نے تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے رقم الحروف کی رائے بھی اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔ یہ کتاب تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ستر منتخب کالموں کے ساتھ رنگین تصاویر شامل کی گئی ہیں جو کہ ایک دیدہ زیب نیا تجربہ ہے۔ عامر بن علی ''متاع ضمیر'' کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

**''ان کا پہلا کالم پڑھتے ہی میرے ذہن میں تو یہ سوال ابھرا تھا کہ ایسا باکمال لکھاری اب تک کیوں دریافت نہ ہو سکا؟ اور کیونکر قارئین کی نظروں سے او جھل رہا؟ عین ممکن ہے ''متاع ضمیر'' پڑھ کر آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آئے۔ خیر دیر آید درست آید''**(۳۰)

اس کالم نگار کی تحریروں کا ایک خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ یہ اپنی کہی ہر بات کو بار بار دہراتے نہیں ہیں بلکہ نئی نئی باتیں لکھتے اور انکشاف کرتے ہیں۔ ایسی ہی ایک خوبصورت کتاب ''حرف رسا'' ہے جس کے مصنف اعجاز احمد ہیں۔ اسے خوبصورت کتاب کہنا اس لیے بھی ضروری ہے پانچ سو صفحات پر مشتمل اکتالیس ابواب کی تحریروں میں نبی کریم ﷺ کی سینکڑوں دعائیں شامل ہیں۔ اسی وجہ سے اُسے خوبصورت دعاؤں کا گلدستہ کہا جا سکتا ہے بلاشبہ نبی پاک ﷺ کی دعاؤں کو اکٹھا کر کے مرتب کرنا ایک عظیم سعادت ہے اور اہل ایمان تک پہنچانا ایک عظیم نیکی ہے۔ ''حرف رسا'' کے مصنف اعجاز احمد کا تعلق بھی مصنف کتاب کے آبائی گاؤں میاں چنوں سے ہے۔ اعجاز احمد ہر مسلمان تک یہ کتاب تحفتاً پہنچانے کی خواہش وجذبہ رکھتے ہیں بلاشبہ یہ بہت بڑی سعادت ہے۔

اس حصہ کا بغور جائزہ لیا جائے تو ایک اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ مسئلہ ہے کہ ذات پات اور قومیت کے فرسودہ تصورات سے نکل کر پاکستان کے روشن مستقبل کے لیے ایسے حکمران کو منتخب کرنا چاہیے جو ذاتی کردار، اخلاق اور منشور کو بنیاد بنائیں۔ امیدوار کو چننے کے لیے ذات، برادری سے بالاتر ہو کر سوچنا چاہیے۔ قوم، قبیلہ، ذات، برادری قطعاً نااہلی یا قابلیت کا معیار نہیں ہونا چاہیے یہی پیغام نبی کریم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں دیا ہے۔ پاکستان کے روشن مستقبل کے لیے ذات پات کے تعصبات سے جان چھڑا کر سوچنا چاہیے پھر ہی پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے

''جہانِ دگر'' حصہ سوم چند دیگر ممالک کی سیر و سیاحت کی روداد پر مشتمل ہے۔ عامر بن علی چونکہ کاروباری سلسلے میں دوسرے ممالک میں تجارتی و سفارتی معاملات لے جاتے رہتے ہیں اس لیے وہاں کا بغور مشاہدہ ان کے لیے زیادہ آسان ہے۔ انہی مشاہدات کا تحریری نمونہ حصہ سوم ہمارے سامنے موجود ہے۔ آٹھ مضامین پر مشتمل ہے جس میں تین مضامین پابلو نرودا ان کی شخصیت اور ان کے قتل کی سازش پر لکھے گئے ہیں۔ پہلا مضمون ''پابلو نرودا کے چلی میں چند روز'' ہے۔ چلی کا ذکر ہو تو پابلو نرودا کا نام نہ آئے یہ ہو نہیں سکتا۔ چلی پر لکھے گئے اس مضمون میں سب سے پہلے پابلو نرودا کی رہائش گاہ کے اندرونی مناظرات کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اس رہائش گاہ میں خوبصورت مصوری کے نمونے جن میں پابلو نرودا اور ان کی بیوی کی پینٹنگ کا ذکر کیا گیا ہے۔ گھر میں موجود لائبریری اور وہاں کی کتب پر لکھنے کے بعد چلی کے دیگر علاقے پر بات کرتے ہوئے ان کے تعلیمی نظام اور شہری نظام کا احوال بیان کرتے ہیں۔

اگلے دو مضامین میں پابلو نرودا کے قتل کی وجوہات پر تفصیلی بات کی گئی ہے۔ ان کی موت کی وجوہات کہ یہ تفصیلی مضمون کے آخر میں جو نتیجہ ہمارے سامنے رکھا گیا اس میں بتایا گیا:

> **''فرازنک سائنسدانوں کا یہ کہنا ہے کہ نرودا کی باقیات کے تجزیے میں یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوگا کہ اسے کتنا زہر دیا گیا؟ اور کیا یہ زہر موت کا سبب بننے کے لیے کافی تھا؟ موت تو عظیم لوگوں کو بھی آتی ہے مگر یہ ان کی عظمت میں اضافے کا سبب بنتی ہے''**(۳۱)

چلی کے علاوہ جن دیگر مقامات کا ذکر یہاں کیا گیا ان میں وادی دمشق، ایران کے دو شہر تہران اور مشہد اور افغانستان کا شہر قندھار بھی شامل ہے۔

مضمون ''سر وادی سینا'' میں وادی دمشق کی سیر کے واقعات کے ساتھ ساتھ وہاں مسلمانوں کے مذہبی مقامات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اسلامی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے مذہبی۔۔ جامعہ بنی امیہ جسے مسجد بھی کہا جاتا ہے اور ہابیل کے قتل

کا مقام بھی وہیں پر موجود ہے وہاں پر ہونے والے تشدد پر ایک مسیحی آر تھوڈکس سے گفتگو کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح مظالم یہاں کا مقدر بنے۔ فرماتے ہیں:

> **''کچھ توقف کے بعد کہنے لگا کہ اس سرزمین پر خدا کے پیغمبروں کا ناحق خون بہایا گیا ہے۔ یسوح مسیح کو یہاں مصلوب کیا گیا ہے، یہ ان مظلومین کے لہو کا اثر ہے۔ آج کی خون آشامی کی جڑیں ماضی میں بہت گہرائی میں موجود ہیں''**(۳۲)

آخری مضمون میں ایک روسی فوج کے ریٹائرڈ افسر جو جاپان سے روس اور وہاں سے قندھار کے سفر پر روانہ ہوا، ان کی ملاقات جب ہمارے مصنف کتاب سے ہوئی تو دونوں کا افغانستان کے حالات و واقعات پر تبادلہ خیال ہوا۔ افغانستان کا احوال بتاتے ہوئے میجر آندرے قندھار شہر کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ اقتباس یہ ہے:

> ''افغان صدر اسی شہر میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ہیں جبکہ طالبان کی پیدائش بھی اسی شہر کی ہے اسی وجہ سے قندھار افغانستان میں برسرپیکار سبھی متحارب قوتوں کی خصوصی توجہ کا مرکز ہے''(۳۳)

میجر آندرے نے افغانستان کی جنگ کے چند تلخ تجربات کا ذکر بھی کیا اور ان کی ریڈ آرمی کی ناکامی کی وجوہات بھی بتائیں۔ مجموعی طور پر جاپان اور چند متفرق موضوعات پر مشتمل یہ مجموعہ (سفر نامہ) ہمیں نا صرف جاپان کی تہذیب و ثقافت بلکہ چند دیگر ممالک کے حالات و واقعات سے بھی روشناس کرواتا ہے۔ عامر بن علی بہترین اسلوب تحریر سے ہمیں بآسانی اپنے مشاہدات سے آگاہ کرتے ہوئے ''جہانِ دگر'' کی صحافت و سیاست اور وہاں کی تاریخ و تہذیب کی خوبیاں اور خامیاں بیان کی ہیں۔ عامر بن علی کے اس سفر نامے کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جاپان کے ساتھ پاکستان کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ جاپان سے زیادہ پاکستان کا تصور، تہذیب و ترقی کو زیادہ نمایاں کرتے دکھائی دیتے ہیں اور سب سے بڑی سیکھ جو اس سفر نامے سے ہمیں ملتی ہے وہ یہ کہ ہمیں بھی جاپان کی ادبی تہذیب و روایات کے ساتھ ساتھ محنت اور حب الوطنی جیسے جذبات سیکھ کر اپنے ملک و قوم کی ترقی میں حصہ ڈالنا چاہیے۔

## حوالہ جات


۱۔عامر بن علی، آج کا جاپان، لاہور: نستعلیق مطبوعات اردو بازار، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱

۲۔ابن انشاء، دنیا گول ہے، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۸۰ء، ص ۱۵۱

۳۔بشریٰ رحمن، ٹک ٹک دیدم ٹوکیو، لاہور: پاکستان کنکشنز، س۔ن، ص ۵

۴۔عامر بن علی، آج کا جاپان، ص ۲۳

۵۔ابن انشاء، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۷۴ء، ص ۶۸

۶۔ایضاً، ص ۱۰۷

۷۔عامر بن علی، آج کا جاپان، ص ۳۰

۸۔ایضاً، ص ۲۸

۹۔ایضاً، ص ۱۸۳تا۱۸۴

۱۰۔رفیق ڈوگر، جاپان نورد، لاہور: دید شنید پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۵۸

۱۱۔عامر بن علی، آج کا جاپان، ص ۴۰تا۴۱

۱۲۔ایضاً، ص ۱۲۵

۱۳۔ایضاً، ص ۹۶

۱۴۔ایضاً، ص ۱۱۴

۱۵۔ایضاً، ص ۱۷۶

۱۶۔ایضاً، ص ۱۷۴

۱۷۔ایضاً، ص ۷۰

۱۸۔ایضاً، ص ۱۳۸

۱۹۔ایضاً، ص ۱۵۷

۲۰۔ایضاً، ص ۱۵۵

۲۱۔ایضاً، ص ۱۵۵

۲۲۔ایضاً، ص ۲۳۳

۲۳۔ایضاً، ص ۲۰۴

۲۴۔ایضاً،ص۲۱۶

۲۵۔عامر بن علی،آج کا جاپان،ص۲۵۴

۲۶۔ایضاً،ص۲۰۸

۲۷۔ایضاً،ص۲۵۵

۲۸۔ایضاً،ص۲۱۰

۲۹۔ایضاً،ص۲۵۷تا۲۵۸

۳۰۔ایضاً،ص۲۵۹

۳۱۔ایضاً،ص۲۷۲تا۲۷۳

۳۲۔ایضاً،ص۲۹۹

۳۳۔ایضاً،ص۲۳۳

باب چہارم:

# جہاں گردی

سفر انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ عربی مثل مشہور ہے کہ 'السفر وسیلۃ الظفر' یعنی سفر کامیابی کا وسیلہ ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سفر کامیابی کی کنجی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا میں وہی اقوام فتح و ظفر مندی سے ہم کنار ہوئیں جنھوں نے بہ رضا و رغبت اور بہ شوق سفر اختیار کیے۔

ے سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

یقیناً حیدر علی آتش کا یہ شعر ہمیں سفر کے اُن خوبصورت مناظر، واقعات و مشاہدات اور سفر کے ان امکانات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس میں ایک جہان معنی آباد ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انسان کو عزمِ مسلسل، مستقل جدوجہد اور مستقبل کی طرف پیش قدمی پر مائل کر رہا ہے۔

حقیقی معنوں میں اگر ہم حیات انسانی کے ساتھ ساتھ کرۂ ارض پر موجود دیگر پہلوؤں سے روشناس ہونا چاہتے ہیں تو سفر اختیار کرنا لازم ہے۔ اسی سفر کے ذریعے انسان حیات و کائنات کے پوشیدہ رازوں کو منکشف کرنے کے ساتھ ساتھ ستاروں پر کمند ڈال سکتا ہے۔ انسانی بقا کے استحکام کا راز بھی کسی نہ کسی حد تک مسلسل سفر اور مستقل مزاجی پر ہے۔ چنانچہ انسانی زندگی کی ترقی کے لیے سفر کی اہمیت مسلمہ ہے۔ سفر انسان کے لیے نئی دنیا کی تسخیر اور نئے امکانات کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔ ایک مثبت سفر دراصل سفر نامہ نگار کا کوہ بے ستون کو کاٹ کر ایسی جوئے شریں کا بہانا ہے جو ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا۔

جس طرح خط کو آدھی ملاقات قرار دیا جاتا ہے اسی طرح سفر نامے کے ذریعے تجربات و مناظرات میں شریک ہونے کو آدھا سفر گردانا جا سکتا ہے۔ اس بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نہ صرف اردو ادب سے ادباء بلکہ دنیا کے تمام زبانوں سے تعلق رکھنے والے افراد دنیا کے مختلف ممالک کی سیر کرتے اور اس کو تحریری شکل میں پیش کر کے ہمیں اپنے تجربات سے روشناس کراتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب سفر کرنا قطعاً آسان نہ تھا اور نہ ہی سفر کی روداد کو دوسروں تک پہنچانا سہل تھا۔ اکیسویں صدی میں انقلابات زمانہ، ٹیکنالوجی کی تیز رفتاری اور ذرائع آمد و رفت کا تیز تر ہو جانے جیسی سہولیات کو اتنا وسیع کر دیا ہے کہ اب نہ تو طویل فاصلہ طے کرنا مشکل رہا ہے اور نہ ہی ان اسفار کی روداد کو لکھ کر شائع کرنا دشوار گزار ہے۔ ہمارے سفر نامہ نگاران سہولیات کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف دنیا کے مختلف حصوں میں اپنے تجربات و مشاہدات کی بھٹی کو سلگا کر کندن کر رہے ہیں بلکہ اپنے تجربات اور مشاہدات میں قاری کو بھی شریک کار کیے ہوئے ہیں۔

سفر نامہ دراصل ایک مضطرب دل، بے چین روح اور بے قرار قدموں کی وہ داستان ہے جو سفر نامہ نگار کو قریہ قریہ، نگری نگری، کونہ کونہ گھما کر معلومات کا خزانہ اکٹھا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ان معلومات اور مشاہدات کو اپنے قاری تک پہنچا کر سفر نامہ نگار اپنے تجربات کے ذریعے ان دور دیس دنیاؤں سے متعلق مختلف موضوعات کے بارے میں آگاہی فراہم کرتا

ہے۔ ایسے روشن ستاروں میں ایک نام عامر بن علی کا ہے جو ادب کی سرزمین میں اپنے مشاہدات و تجربات کے بیج اپنے منفرد انداز میں بوتے دکھائی دیتے ہیں۔

جب ہم کسی علاقے کا سفر کرتے ہیں تو اس کی تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور جغرافیائی حیثیت سے وہاں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان مشاہدات کو اپنے تخلیقی زاویہ نگاہ سے پُر تاثیر انداز میں پیش کرنا آسان مرحلہ نہیں ہوگا بلکہ یہ دشوار گزار عمل ہے جو ہر سیاح نہیں کر سکتا۔ ان اسفار کی روداد جب عامر بن علی کے قلم سے رقم ہوتی ہے تو تاثیر کی حدت و تپش واضح محسوس ہوتی ہے۔ ادب کو مکمل حسن کے ساتھ قاری تک پہنچانا ایک بڑی Commitment ہے جس پر پورا اترنا کم لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے لیکن عامر بن علی ایسے سفر نامہ نگار ہیں جو ادب کی Commitment کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

عطاالحق قاسمی عامر بن علی کے شعری مجموعہ ''محبت چھوگئی دل کو'' میں مصنف کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> **''ادب سے عامر بن علی کی کمٹمنٹ ہے اور یہی کمٹمنٹ اسے کچھ کر گزرنے کے عمل پر اکساتی رہتی ہے اور بے چین رکھتی ہے''**(۱)

عطاالحق صاحب کے ان الفاظ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عامر بن علی متجسس روح کے مالک ہیں جو نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

زیرِ تحقیق کتاب ''جہاں گردی'' کو پڑھیں تو انسانی سوچ دنگ رہ جاتی ہے کہ انسان اگر ایک مقام کا سفر کرے تو اس جگہ کی تمام معلومات جغرافیہ، تاریخ اور تہذیب و ثقافت کو جامع انداز میں پیش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر یہاں عامر بن علی آٹھ آٹھ ممالک کا سفر تحریر کرتے ہوئے تمام ممالک کی روداد کو اتنی خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہیں کوئی پہلو ہاتھ سے جانے نہیں پاتا۔

سفر نامہ ''جہاں گردی'' تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں عامر بن علی جاپان کے موضوعات کے بارے میں تفصیلی طور پر بات کرتے ہیں جن میں خصوصی اور عمومی موضوعات کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔ حصہ اول ''احوال جاپان'' کے عنوان کے تحت ہے جن کے ذیلی موضوعات یہ ہیں: (احوال جاپان)

- چیری کے پھول
- بدلتے ذوق و شوق
- ہاچیکو۔ وفا کی علامت
- سفید بالوں والا ملک
- مجموعی معیاری پیداوار کا جاپانی تصور
- سبز گلاب

- زندگی کا سرچشمہ
- دنیا کا بہترین سیاحتی مقام
- ترقی کا راز
- سالِ نو اور نیا دارالحکومت
- ہیروشیما کا ایٹمی گنبد
- ایٹمی بمباری کی یاد میں
- مستقبل کا سفر
- چیری بلاسم اور کاتیرینا کے سوالات
- ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے
- مارکیٹنگ کی دنیا میں انقلاب
- روماجی
- جاپان کے اردو سائن بورڈ
- اوشی بانا

اس حصہ میں عامر بن علی جہاں بنیادی موضوعات جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی، ہیروشیما کی تباہی، جاپان کی ترقی کا راز اور جاپانی قوم کا مارکیٹنگ کی دنیا میں انقلاب کا بیان تفصیل سے کرتے ہوئے ایک محققانہ نگاہ رکھی ہے وہاں ذیلی موضوعات جیسے پھول، جانور، رسم ورواج اور جاپان کے اردو سائن بورڈ وغیرہ کو تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے۔

''جہاں گردی''کا حصہ دوم کا عنوان ''ہفت اقلیم'' کے نام سے کیا گیا ہے جن میں سات ممالک کا احوال بیان کیا گیا ہے جن میں پہلے پانچ ممالک کا ذکر ہفت اقلیم کے زمرے میں کیا گیا ہے چھٹے ملک چلی کا تعارف شہ سرخی میں دیا گیا جس میں ''چلی'' سے تعلق رکھنے والے نو موضوعات باب کی شکل میں دیئے گئے ہیں جن میں پابلونرودا، گبریلا مسترال اِن پر تفصیلی طور پر بات کرتے ہیں۔ ساتواں ملک ''میکسیکو'' کا تعارف بھی جلی حروف میں کیا گیا ہے جن میں ''میکسیکو'' سے تعلق رکھنے والے پانچ بڑے موضوعات پر بات کی گئی ہے جن میں اہم موضوع فرید کا آستانہ، لیوان ٹراٹسکی کا گھر ہے۔ ہفت اقلیم کے موضوعات یہ ہیں:

- تھائی لینڈ۔ دیس اچھا مگر بدنام بہت ہے۔
- سری لنکا۔ امن اور خوشحالی کی راہ پر گامزن
- قطر کی ایک جھلک

❖ ارجنٹائن۔خوابوں جیسی سرزمین

❖ پیرو کا تکنا

**(چلی)**

❖ چند دن چلی میں

❖ ایسا منظر نہیں دیکھا

❖ پابلو نرودا کے حضور

❖ سینتا گو کی ایک صبح

❖ شاعروں اور ادیبوں کا وطن

❖ فٹ بال کا قدیم ترین عالمی ٹورنامنٹ

❖ پابلو نرودا کے آنگن میں ایک دوپہر

❖ لاس بیر دیس

❖ لاطینی امریکہ کی پہلی نوبل انعام یافتہ

**(میکسیکو)**

❖ محبت کے خطوط

❖ میکسیکو سٹی۔ قوس قزح کے رنگوں سے مزین شہر

❖ امریکی سرحد کے اس پار

❖ لیون ٹراسکی کا گھر

❖ فریدا کا نیلا آستانہ

کتاب کا حصہ سوم ''دیس پردیس'' کا عنوان شہ سرخی میں دیا گیا ہے۔اس میں انیس معلومات سے بھرپور مضامین بیان کیے گئے ہیں جن میں اسلم کولسری، فراز صاحب اور رخسانہ نور جیسی نامور شخصیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ایک موذی مرض کے انکشاف کے ساتھ ساتھ بنک کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی کی معلومات دی گئی ہے۔ حصہ سوم میں کتابوں کی رونمائی بھی کی گئی ہے۔اس حصے میں متفرق موضوعات بیان کیے گئے ہیں لیکن ان موضوعات کو یکجا اس طرح کیا گیا ہے کہ کہیں ربط ٹوٹتا محسوس ہوتا ہے۔ حصہ سوم میں عامر بن علی ایک صحافی ہونے کے ناطے پاکستانی اور بھارتی میڈیا کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو بھی بیان کرتے ہیں۔ حصہ سوم کے ذیلی انیس مضامین یہ ہیں:

❖ نوبیل انعام یافتگان کا ترکِ وطن

- ❖ بٹوے کا درد
- ❖ فراز صاحب
- ❖ ہماری اینک فرینک
- ❖ دنیا میری نظر میں
- ❖ اسلم کولسری۔ایک تابندہ شاعر کی رخصتی
- ❖ فن اور فنکار
- ❖ دنیا کے ٹاپ ٹین بنک اور بنکاری کی ابتداء
- ❖ گفتگو کے آداب
- ❖ اردن داتی رائے اور گاندھی جی
- ❖ دو کتابیں
- ❖ رخسانہ نور کی رخصتی
- ❖ تلسی داس اور تھامس پیکیٹی
- ❖ مے کدے کا سبق
- ❖ کھیل یہی تو ہے
- ❖ مضبوط قلعہ
- ❖ حلال کوشر
- ❖ عامر بن علی کا ادبی سفر

عامر بن علی ایک محقق کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے معلومات کا ایسا خزانہ اس کتاب میں سینچ دیا ہے کہ قاری کتاب کی سطروں سے صرف لطف اندوز نہیں ہو رہا بلکہ وہ ان لفظوں کے دوش پر سوار ہو کر ان ممالک کی سیر کرتا ہوا خود محسوس کرتا ہے۔سفر نامے کے کینوس پر عامر بن علی کی تصویر اس سیاح کی سی ہے جو مقصد کی دوڑ میں لپٹے بغیر سفری تھیلے کو کندھے پر ڈال کر جہاں گردی کرتا ہے اور اپنے تجربات ومشاہدات کو خارجی لمس اور داخلی احساس کے ساتھ قاری تک پہنچتا ہے۔

''جہاں گردی''کا پہلا حصہ جاپان کے بارے میں ہے جس میں عامر بن علی نے جاپانی تمدن کا تذکرہ کیا ہے۔جاپان کی شکل اگر دنیا کے نقشے پر دیکھئے تو یہ مثال درست ثابت ہوتی ہے کہ جاپان ایک پانی میں ڈوبے ہوئے پہاڑ کی چوٹی ہے جو سمندر کی سطح سے اُبھر آئی ہے۔جاپان چونکہ تین ہزار سے زیادہ جزیروں پر مشتمل ہے اس لیے جاپان کو درحقیقت ایک مجمع الجزائر ہی کہا جاتا ہے۔دنیا کا چھٹا سب سے طویل ساحل جاپان کے پاس ہے جاپانی مجمع الجزائر ۱۴ فیصد زرعی زمینوں پر اور ۶۷ فیصد

جنگلات پر مشتمل ہے۔ جاپان چالیسواں سب سے زیادہ گنجان آباد ملک ہے عالمی رسک انڈیکس ۲۰۱۶ء میں اس بات کا انکشاف کیا گیا ہے کہ جاپان قدرتی آفات کا سترواں حصہ زیادہ خطرہ ہے اور اس ملک میں ۱۱۱ فعال آتش فشاں ہیں۔

جاپان دنیا کا گیارھواں سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہے اور اس کی آبادی ساڑھے بارہ کروڑ سے زیادہ ہے۔ جاپان زیادہ گنجان آبادی والے ممالک سے ایک ہے۔ ملک کی زیادہ تر شہری آبادی تنگ ساحلی میدانوں میں مرکوز ہے اور تقریباً تین چوتھائی حصہ پہاڑی ہے۔ جاپان کا دارالحکومت اس کا سب سے بڑا شہر ٹوکیو ہے۔ جاپان کی ثقافت دنیا بھر میں مشہور ہے اور اسے ثقافتی سپر پاور سمجھا جاتا ہے۔ جاپان کا کھانا، فن، فلم اور موسیقی بہت مقبول ہے۔ جاپان تمام تر معاشرتی، معاشی، سیاسی مسائل اور زمینی تناظر کے باوجود بھی ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہوتا ہے۔ جاپان دوسری جنگ عظیم میں شکست کے باوجود بھی آج الیکٹرونک آلات میں دنیا کا مقابلہ کر رہا ہے اس میدان میں جاپانیوں نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

امریکا کے بعد دنیا کے بڑے بڑے جہاز اور کاریں جاپان میں تیار ہوتی ہیں اور کمال کی بات یہ ہے کہ آج بھی جاپان اس قدر ترقی یافتہ ہونے کے باوجود بھی قدیم رسوم و رواج، عقائد، تہذیب و ثقافت کے عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ جاپانی ایک طرف تو کلاسیکل ماضی کی طرف جڑے ہوئے ہیں اور دوسرا رخ حال کی طرف جس میں مغربی طرزِ فکر اور اطوار ہیں۔اس طرح جاپان ایسا ملک ہے جو دوہرا منظر پیش کرتا ہے۔ جاپان دنیا کا سب سے زیادہ صاف ستھرا ملک ہے۔ جاپانی قوم میں جھوٹ کا تصور نہیں اور وقت کی پابندی کا خاص خیال کرتے ہیں۔ جاپانی قوم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ صبر و تحمل، برداشت، بردباری اس قوم کا خاصا بن گیا ہے۔ آئندہ سالوں میں بھی جاپان کی ترقی یقیناً بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جاپانی قوم 'مٹی سے سونا بنانا' کی کہاوت پر پورا اترتی ہے۔ جاپان کے بارے کہا جاتا اس ملک میں کچھ دن رہ لیں تو اس ملک سے پیار ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر محمد کامران اپنی تصنیف ''گ سے گڑیا ج سے جاپانی'' میں جاپان کے بارے لکھتے ہیں:

> **''میں نے بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی جس میں شہزادی اپنی شادی کے امیدواروں سے کہتی ہے کہ جو اس سوال کا جواب ڈھونڈ کر لائے گا، وہ اس سے شادی کرے گی۔اور سوال تھا: 'ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے' کی حقیقت کیا ہے؟'' اگر شہزادی مجھ سے یہ سوال پوچھتی تو میں جان اور شادی کی امان پا کر بے ساختہ کہہ اٹھتا'' جاپان۔۔۔''**(۲)

فن لینڈ کے بعد جاپان کا تعلیمی نظام دنیا کا سب سے بہترین تعلیمی نظام مانا جاتا ہے۔ تعلیم سے فارغ التحصیل افراد ایک قومی سوچ کے ساتھ ملک و قوم کی ترقی میں مصروف عمل ہیں۔اس تعلیمی نظام کی وجہ سے جاپانی نوجوان اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنیاد پر نئی سے نئی ایجادات کر رہے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جاپان دنیا میں تحقیق کا مرکز اور آنے والی دنیا کو جدید شکل دینے والا ملک ہے۔ جاپان کی ان خصائص کی وجہ سے بہت سے سفر نامہ نگار اس ملک کی طرف متوجہ ہوئے جاپان پر سفر نامے

لکھے۔ جدید سفر نامہ نگاروں میں عامر بن علی منفرد شناخت کے حامل ہیں۔ ان کا جدید اسلوب و آہنگ اور دلچسپ و شگفتہ انداز بیاں سفر نامہ نگاری کو نئی جہت سے آشنا کرتا ہے۔ عامر بن علی اپنے سفر ناموں میں ایک منفرد سیاح کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب مصور بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ان سیاحتی جگہوں کو ایک مصور کی نظر دیکھا اور ''جہاں گردی'' میں ان جگہوں کی قدرتی و مصنوعی اشیاء کے ساتھ ساتھ ان علاقوں میں بسنے والی قدیم قوموں کے خیالات، نظریات، رسم و رواج عرضیکہ ہر ایک شے کی خوبصورت تصویر دکھائی ہے۔ عامر بن علی نے جاپان کو مختلف نوعیت سے دیکھا اور اس حوالے سے ان کی سیاحت کا فکری و فنی جائزہ لیتے ہیں۔ کائنات ایک وسیع عالم ہے جس پر خالق کائنات نے بے شمار فطری مناظر، قدرتی رنگ اور تخلیقات کے نمونے پیش کیے ہیں اس کے علاوہ انسانی زندگی میں بڑی وسعت اور پھیلاؤ ہے۔ ایسی وسعت اور پھیلاؤ جس میں مختلف رنگ، مختلف جذبات اور مختلف حالات و واقعات حقیقی اور بناوٹی تصویروں میں سامنے آتے ہیں۔ کائنات کے ان تمام رنگوں کا مشاہدہ اور مطالعہ انسان کے حصے میں آتا ہے۔

پھولوں کے بارے میں ایک جاپانی کہاوت بہت مقبول ہے ''پھول جو یاد دلائیں: زندگی عارضی مگر خوبصورت ہے''

بظاہر پھولوں کو خوشبودار اور رنگوں کی علامت قرار دیا جاتا ہے مگر حقیقت میں پھول انسانی زندگی کا ایک اہم عنصر ہے جو نہ صرف ہماری قوت بصارت کو تازگی بخشتے ہیں بلکہ انسانی جذبات کے اظہار میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مختلف ممالک میں ان کی انفرادیت کا اظہار مختلف انداز میں ہوتا ہے مگر جب جاپان کی خوبصورتی اور انفرادیت کا ذکر آئے تو سب سے پہلے ہمارے ہی تخیل پر جو نقش ابھرتا ہے وہ گلابی اور سفید رنگ کے پھول چیری بلاسم کا ہے۔ جاپان میں یہ سفید اور گلابی رنگ کا پھول پاکیزگی اور طہارت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چیری بلاسم جاپان کا قومی پھول ہے۔ چیری کے درختوں پر موسم بہار میں پھول کھلتے ہیں۔ جاپان میں چیری کے پھولوں کے کھلنے سے باقاعدہ تہوار شروع ہو جاتا ہے جسے مقامی زبان میں ''ہنامی'' کہا جاتا ہے اس لفظ کا مطلب ''پھول تکنا'' ہے۔ جاپان کے قومی پھول چیری بلاسم کا تعلق پاکستان سے ہے۔ چیری کے پیڑ اور اس کے پھولوں کی ابتداء درہ کوہ ہمالیہ سے منسوب کی جاتی ہے آہستہ آہستہ یہ شجر امریکا، کینیڈا، چین اور جاپان وغیرہ میں پھیل گیا۔ جاپانی بہت شوق سے باغبانی کرتے ہیں۔ عام طور پر چیری بلاسم کے درخت ندی، نالوں کے کنارے پائے جاتے ہیں لیکن بدھ مت اور شینٹو مذہب کی عبادت گاہوں سے جڑے ہوئے باغات میں چیری کے درختوں کا ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار بھی چیری بلاسم کی خوبصورتی سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور اس پھول پر ایک مضمون اپنے گزشتہ سفر نامے ''آج کا جاپان'' میں بھی لکھتے ہیں۔ چیری بلاسم کے پھول سے جاپانی لوگ دلی عقیدت رکھتے ہیں۔ چیری کے پھولوں کی رُت جب جوبن پر آتی ہے تو لوگ پھول دیکھنے کے لیے ندی، نالوں اور دریاؤں کے کنارے بیٹھ جاتے ہیں۔ کہیں پھول سے بھرے ہوئے درخت کے نیچے بوڑھے اور بوڑھیاں جشن بہاراں منا رہے ہوتے ہیں کسی جگہ کالج کے طالب علم ٹولیوں کی شکل میں گپ شپ میں مصروف ہوتے ہیں۔

اس حوالے سے عامر بن علی لکھتے ہیں:

> **''چیری کے پھول کو جاپان کی روح کہا جاتا ہے۔ یہ ان ثقافتی اور سماجی علامات میں سے ایک ہے جسے اس ملک کا چہرہ شمار کیا جاتا ہے جیسے بلٹ ٹرین، سبز چائے، جدید الیکٹرونکس، ابلے ہوئے چاولوں پر کچی مچھلی کی تہہ جسے 'سوشی' کہا جاتا ہے، فیوجی کا پہاڑ، کورنش بجالاتے ہوئے فرشی سلام، گھر کے داخلی دروازے پر جوتے اتارنے کی روایت وغیرہ۔۔چیری بلاسم کے گلابی اور سفید رنگ کے ملبوس پھولوں کو ان کی پاکیزگی کے سبب جاپان کی روح کہا جاتا ہے''**(۳)

سفر نامہ نگار عبادت گاہ کے باغ میں چیری کے پھولوں کو دیکھ رہے تھے تو ان کی ملاقات ایک بدھ بھکشو سے ہوتی ہے اور اس سے پوچھتے ہیں کہ جاپان کے لوگ گھر میں داخل ہونے سے پہلے جوتا کیوں اتارتے ہیں؟ نوجوان بدھ بھکشو کو بتاتا ہے کہ گھر کے باہر جوتا اتارنے کا ایک پہلو تو صفائی کا ہے اور دوسرا پہلو باہر کی سوچوں اور مسائل کو گھر سے باہر رکھنا ہے۔

گلابی اور سفید رنگ کے چیری بلاسم سے جاپانی لوگ دلی عقیدت رکھتے ہیں۔ عامر بن علی اپنی تصنیف ''جہاں گردی'' کے ایک مضمون ''چیری بلاسم اور کاتیرینا کے سوالات'' میں چیری کے بارے لکھتے ہیں کہ جاپان میں چیری کے پھولوں کا انتظار بہار کی آمد سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس تہوار کی رونق ایسے ہوتی ہے جیسے ماضی میں لاہور میں بسنت کے پتنگ میلے میں ہوتی تھی۔ دنیا بھر سے سیاح ہر سال جاپان چیری کے پھول دیکھنے کے لیے کھچے چلے آتے ہیں۔ چیری پھولوں کی رُت جوبن پر جب آتی ہے تو چیری کے باغات کو دیکھ کر جنت کے باغات ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ جاپان کے ہر شہر میں چیری کا کم از کم ایک باغ ضرور ہوتا ہے ایسے ہی چیری کے بوٹینکل گارڈن میں سفر نامہ نگار کی ایک بزرگ روسی خاتون سے ملاقات ہوتی ہے کاتیرینا نام کی یہ روسی خاتون چیری کے پھول دیکھنے کے لیے سائبریا سے جاپان آئی تھی۔ کاتیرینا کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار روسی زبان جانتے ہیں تو وہ پاکستان اور اسلام کے بارے میں بہت ہی دلچسپ سوالات پوچھنے لگتی ہے، پاکستان کے غرباء کی خوراک کیا ہے؟ سفر نامہ نگار کے جواب پر چاول اور سادہ روٹی پر وہ حیران ہو کر طنز کرتی کہ وہ پھر اتنے غریب تو نہیں ہوں گے۔ دوسرا سوال وہ حرم کے بارے میں کرتی ہے حرم کیا ہوتا ہے؟

اقتباس ملاحظہ ہو:

> **''سوال یہ تھا کہ حرم کیا ہوتا ہے؟ میں نے گھر، آشرم، آستانہ اور بڑی رہائش گاہ کہہ کر بات ٹالنے کی کوشش کی، بڑھیا نے مجھے شرارتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ زیادہ بھولے بننے کی کوشش مت کرو، اس حرم کی بات کر رہی ہوں جس میں تم مسلمان مرد بہت ساری عورتیں جمع کرتے ہوئے، تمہیں چار شادیاں کرنی ہوتی ہیں یا پھر اس سے زیادہ اور کم بھی کر سکتے ہو۔''**(۴)

سفر نامہ نگار اس بزرگ کو کہتے ہیں کہ جس حرم کا بزرگ ذکر کر رہی اس کا تعلق ایک مرد کا زیادہ شادیاں کرنے کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ طاقت اور دولت سے ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگار بزرگ سے پوچھتے ہیں کہ ''روسی ملکہ کا تیر ناعالیہ کا سترہ شادیاں کرنا کیا جائز ہے؟'' اور پھر آخری سوال بڑھیا پوچھتی ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے اسلام کس نے قبول کیا تھا؟ سفر نامہ نگار ''حضرت خدیجہؓ'' کے جواب کے ساتھ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ دوسری قومیں مسلمان پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ مسلمان عورتوں کو براری حقوق نہیں دیتے ہماری تو اسلام قبول کرنے والی پہلی فرد ہی عورت ہے تو وہ بزرگ روسی خاتون کہنے لگی کہ مسلمان عورت مشکل میں مرد کا ساتھ دیتی ہیں لیکن جب عورت مشکل میں ہوتی ہے تو کوئی بھی مرد آگے بڑھتا وہ اس کی وضاحت ''حضرت عیسیٰؑ'' کی مثال دے کر کرتی ہیں کہ جب حضرت عیسیٰؑ کو مصلوب کیا گیا تو کوئی بھی مرد لاش وصول کرنے کے لیے موجود نہیں تھا اور تین عورتیں ہی کلوری کی پہاڑی سے جسد خاکی کو لے کر اتری تھیں۔ کا تیرینا سوالات کے ذریعے مسلمان مردوں پر تنقید کرتی ہے کہ وہ عورتوں کو براری حقوق نہیں دیتے۔ سفر نامہ نگار اس مضمون میں کا تیرینا سے ملاقات کے بارے میں بتاتے ہیں جو اتفاقیہ طور پر چیری کے خوبصورت باغات میں ہوتی ہے۔ چیری کے پھولوں کے تذکرے کے ساتھ ساتھ عامر بن علی اسلام سے متعلق مغربی ممالک کے تاثرات بھی قاری تک پہنچاتے ہیں۔ چیری کے پھولوں سے مناظر اس قدر دلکش محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حقیقی منظر نہیں آل پنٹنگ ہے۔ جاپان کے موسم بہار میں ہر سال لوگ پھولوں کو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور پھولوں کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جاپانی ثقافت میں پھول ہمیشہ کے لیے ایک لازمی حصہ ہیں۔ جاپان کے لوگ پھولوں کے شیدائی ہیں اور پھول دیکھنے کے لیے جاپانی دور دراز کے علاقوں سے آتے ہیں اور ٹولیوں کی شکل میں بیٹھ کر گپ شپ میں مصروف ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں پھولوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جاپان کے پھولوں میں ایک نقص یہ ہے کہ جاپانی پھولوں میں خوشبو نہیں ہوتی۔ قبروں اور مقبروں پر پھول چڑھانے کے بعد پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار کے مطابق پاکستان جیسے خوشبودار پھول کہیں نہیں پائے جاتے ہیں۔ ہر شخص کو پھول سے خاص لگاؤ ہوتا ہے یہاں تک کہ ہٹلر جیسا ظالم شخص بھی پھولوں کو پسند کرتا ہے اور روسی کمیونسٹ لینن کے کوٹ پر بھی ہمیشہ پھول سجا رہتا تھا۔ جارج برناڈ شاہ کو بھی پھولوں سے بے حد لگاؤ تھا لیکن وہ پھول توڑنا گوارا نہیں کرتا تھا۔

عامر بن علی نے اپنے مضمون میں ''سبز گلاب'' میں ایک جاپانی لڑکی کے عجیب و غریب خواب کے بارے میں بتایا ہے جو اپنے خواب میں سبز گلاب دیکھتی ہے اس لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کے خواب کو سچا ثابت کرنے کے لیے اپنے چار کاشتکار دوستوں سے مل کر سبز رنگ کا گلاب تیار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب دنیا بھر میں سبز گلاب فروخت ہوتا ہے۔ سبز رنگ کے گلاب کے ساتھ کچھ اساطیری کہانیاں وابستہ ہیں جتنے مفروضے اس پھول سے منسلک ہیں شاید ہی کسی اور پھول سے ہو۔ اس حوالہ سے اقتباس ملاحظہ ہو:

''زرد رنگ کا گلاب بیزاری جدائی کی خواہش کا اظہار بھی ہو سکتا ہے سرخ گلاب ہر
دیس میں محبت اور خوشی کا رنگ سمجھا جاتا ہے گلابی اور سفید گلاب نیک خواہشات،
پاک جذبات اور روحانیت کے لیے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ سبز رنگ کا گلاب
شاید امارت، خوشحالی اور ترقی کی علامت کہلائے گا''(۵)

ہمارے کلاسیکی ادب میں میر تقی میر نے محبوب کے لبوں کو گلاب پنکھڑی سے تشبیہ دی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

ے نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے(۶)

جاپان میں پھولوں کی سجاوٹ کا بھی اپنا منفرد طریقہ ہے۔ جاپانی لوگ ہر کام میں جدت پیدا کرنے کے ماہر ہیں۔ جاپان کے لوگ پھولوں اور پودوں سے محبت نہیں بلکہ عقیدت رکھتے ہیں۔ جاپان میں شاید ہی کوئی گھر ہو جہاں اہل خانہ کے ذوق کے مطابق پھول اور پودے نہ لگے ہوں۔ دنیا میں عام طور پر ہر جگہ پھولوں کو اس طرح سجایا جاتا ہے کہ بہت زیادہ پھول اکٹھے گلدان میں بھر دیئے جاتے ہیں اور سجاوٹ کے لیے زیادہ سے زیادہ پھولوں کے استعمال کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جاپان میں تعلیمی اداروں میں باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جاتی ہے کہ پھولوں کو کیسے تروتازہ رکھا جائے۔

سفر نامہ نگار اپنے مضمون ''اوشی بانا'' میں جاپان کے پودوں کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ''اکے بانا'' میں پھولوں کی آرائش اور ترتیب کا فن ہے جس کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ ''اکے بانا'' جاپانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''جیتے جاگتے زندہ پھول''، یعنی پھولوں کو جیتا جاگتا تصور کرنا توڑ کر ضائع کرنے کی بجائے تھوڑے پھولوں کو ہی بہت زیادہ جاننا ہے۔ اسی فلسفے کے تحت جاپانی پھولوں کو سجاتے ہیں۔ اسی تناظر میں ناصر کاظمی کے اشعار گویا مہرِ تصدیق ثبت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ے ہنستے گاتے روتے پھول
جی میں ہیں کیسے کیسے پھول
کیسے اندھے ہیں وہ ہاتھ
جن ہاتھوں نے توڑے پھول
اور بہت کیا کرنے ہیں
کافی ہیں یہ تھوڑے پھول(۷)

''اکے بانا'' دراصل پھولوں کی سجاوٹ کا نام نہیں بلکہ سجاوٹ کے نام پر فنکار پیغام دیتا ہے کہ نیچر بہت خوبصوت ہے اس کے قریب رہو اور اس کی قدر کرو چنانچہ ''اکے بانا'' کے آرٹ کے ذریعے نیچر کو کوزہ میں بند کر کے گھر میں رکھ لیا جاتا ہے۔ دوسرے ممالک میں رہنے والے لوگ بھی پھول سے محبت کرتے ہیں تو پھول کو کوٹ کی جیب میں لگا لیتے ہیں جب

کہ جاپان کے لوگ پھول سے محبت کی وجہ سے ''اکے بانا'' جیسا مسحور کر دینے والا آرٹ وجود میں آتا ہے۔ ''اکے بانا'' سے ملتا جلتا آرٹ ''اوشی بانا'' بھی ہے جس کی انفرادیت یہ ہے کہ جس پھولوں اور پتوں کو زیادہ برس تک زندہ اور تازہ رکھنے کے لیے فنکارانہ حسن ترتیب بخشنے کے بعد آرائشی فریموں میں مخصوص انداز میں پیک کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی فطری تروتازگی اور رنگ و روپ برقرار و دائم رہتے ہیں۔ پھولوں کو تروتازہ رکھنے میں فریم اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ''اکے بانا'' کی طرح ''اوشی بانا'' کی تربیت دینے کے لیے بھی جاپان میں باقاعدہ کلاسز ہوتی ہیں۔ آرٹ گیلری میں معیاری شہ پاروں کو باقاعدہ پیش کیا جاتا ہے۔

عامر بن علی جاپانی لوگوں کی ایک منفرد خصوصیت یہ بتاتے ہیں جو دنیا میں اور کہیں اور نظر نہیں آتی ہے کہ جاپانی تہ دل سے فطرت کی جملہ حسین چیزوں کی قدر کرتے ہیں۔ جاپانی قوم حسین مناظر، درخت، پودے سے عشق رکھتے ہیں۔

سید راس مسعود اپنی تصنیف ''روح جاپان'' میں لکھتے ہیں:

> **''جاپانیوں کے نزدیک پودے اور پھول بھی جانداروں کی طرح ہیں اور ان کے لیے بھی قریب قریب انسانوں کی سی غور پرداخت کی ضرورت ہے جب کوئی خاتون گلدان میں پھول سجاتی ہے تو ایک مامتا بھری ماں کی طرح پیار اور احتیاط سے ان کو بنارتی سنوارتی اور سجاتی ہے اور وقت کو وقت نہیں سمجھتی۔ جاپانی خاتون کے لیے پھول سہیلیوں کا کام دیتے ہیں''**(۸)

جاپانی قوم نہ صرف پودوں سے بلکہ جانوروں سے بھی محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ جاپان میں اگر کوئی پالتو جانور مر جائے تو اس کا سوگ گھر کے فرد کی طرح منایا جاتا ہے۔ کتے اور بلی کے مرنے کا کریا کرم منایا جاتا ہے جس میں مذہبی رسومات بھی ادا کی جاتی ہیں۔ جاپان میں جانوروں کے متعلق یہی سوچ ہے کہ اس نوع کی بھی انسانوں کی طرح ایک الگ اہمیت ہے۔ جاپانی قوم کے نزدیک جیسے تمام انسان برابر ہیں بالکل اسی طرح تمام نوع برابر ہے۔

اس بارے میں ڈاکٹر کامران ''گ سے گڑیا، ج سے جاپانی'' میں لکھتے ہیں:

> **''جاپان میں پالتو جانوروں کے مزے ہیں۔ بھانت بھانت کے کتے، بلیاں اور پرندے، مینشن اور اسٹیٹس کی علامت ہیں۔ بالشت بھر کے پلے جو ڈھنگ سے ''بچ'' کی آواز بھی نہیں نکال پاتے، لاکھوں ین میں بکتے ہیں۔ پاکٹ سائز پلوں سے لے کر جفادری قسم کے ہیبت ناک کتوں تک اتنا تنوع اور رنگا رنگی ہے کہ سبحان تیری قدرت۔۔۔''**(۹)

انسان کا جانوروں میں سب سے زیادہ وفادار جانور کتا سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس کی ایک مثال اصحاب کہف کے واقعے سے ملتی ہے کہ کتا صدیوں سے انسانوں کا پالتو جانور رہے۔ جاپان میں ہاچیکو نام کے کتے کو وفا کی علامت تصور کیا جاتا

ہے وفادار کتوں نے دنیا بھر میں انسانوں کو حیران کیا ہے لیکن جاپان کا ہاچیکو ان سب میں ممتاز ہے جس کا تعلق اکیتا نسل کے کتوں سے تھا۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں ہاچیکو پیدا ہوا اور ۱۹۲۴ء میں ٹوکیو یونیورسٹی کا پروفیسر اوا ینو اس کتے کو خریدتا ہے اور اس کا نام ہاچیکو رکھ دیتا ہے۔ پروفیسر اوا ینو زراعت کے شعبے سے منسلک تھا۔ پروفیسر جب یونیورسٹی سے واپس آتا تو وہ کتا اپنے مالک کو خوش آمدید کہنے کے لیے قریبی ریلوے اسٹیشن پر جایا کرتا تھا پھر دونوں وہاں سے گھر تک پیدل سفر کرتے۔ ہاچیکو اور پروفیسر کا ساتھ صرف ایک سال چار ماہ تک رہا کیونکہ پروفیسر کی ۵۳ برس کی عمر میں ہیمرج سے موت ہو گئی۔ ''ہاچیکو'' تقریباً دس سال ٹوکیو کے شبیا اسٹیشن پر بلاناغہ جاتا ہے اور مالک کا انتظار کرتا ہے۔ ہاچیکو کا یہ دس سالہ انتظار ۱۹۳۵ء میں اس کی موت کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔

''جہاں گردی'' کے مضمون ''ہاچیکو وفا کی علامت'' میں عامر بن علی نے جاپان کے ایک وفادار کتے کا اپنے مالک سے اظہار محبت کے انداز کو قلمبند کیا ہے کہ ایک کتا کس طرح اپنے مالک سے وفاداری کرتا ہے اور اظہار محبت کرتا ہے۔ اس وفادار کتے کو نیشنل میوزیم آف سائنس ٹوکیو میں حنوط کر کے رکھا گیا ہے۔ اس کی یاد میں ہر سال ٹوکیو کے شبیا اسٹیشن پر تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے ہیں۔ ٹوکیو کے شبیا اسٹیشن پر ہاچیکو سے منسوب ایک مجسمہ نصب کیا گیا ہے۔ اس اسٹیشن کے داخلی دروازے کا نام ''ہاچیکو گیٹ'' ہے۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں ہاچیکو کا اپنے مالک سے محبت کرنے کے انداز کو مجسمے کے روپ میں ڈھال کر نصب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ عامر بن علی لکھتے ہیں:

> **''ٹوکیو یونیورسٹی میں گزشتہ روز ہاچیکو اور پروفیسر کے مجسمے کی تقریب رونمائی میں پانچ سو افراد نے شرکت کی تقریب میں شریک ایک رضاکار کا کہنا تھا کہ ہمیں امید ہے کہ یہ مجسمہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان گہری محبت کی ایک علامت بن جائے گا''**(۱۰)

ہاچیکو پر ہالی وڈ مقبول بلاک بسٹر فلم ''ہاچی'' بھی بنائی گئی ہے۔۔

جاپان کے لوگ روایت پسندی اور جدت پرستی کا خوبصورت امتزاج ہیں۔ یہ لوگ ہر نئی چیز کو خوشی سے اپنا لیتے ہیں۔ جاپانی رسم الخط کچھ حصہ چین سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر جاپان کے دستر خوان پر نظر ڈالیں تو کئی اشیاء خوردنی ایسی ہیں جو بیرونی ممالک سے آتی ہیں لیکن اب جاپان کے دستر خوان کا حصہ بن چکی ہیں۔ جاپان کے لوگ کافی بہت شوق سے پیتے ہیں اس ملک میں سبز چائے اور بھنے چاول سے کشید کردہ چائے بہت اہم مشروب بنائے جاتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو چائے پیش کرنے کے فن سے بہت لگاؤ ہے اس موضوع پر کئی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں اور باقاعدہ سکول بھی کھلے ہیں جو چائے پیش کرنے کا طریقہ سکھاتے ہیں۔ جاپان کے لوگ چائے کی تقریبات بھی منعقد کرتے ہیں۔ اس بارے میں عامر بن علی ایک مضمون ''بدلتے ذوق شوق'' میں لکھتے ہیں:

''چائے پینے کی پُر تکلف تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ ہم مشرب لوگ بعض اوقات سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے صرف چائے کی پیالی پینے کے واسطے اکٹھے ہوئے ہیں ہلکی پھلکی گپ شپ کرتے ہیں۔ گفتگو کا دائرہ عموماً ثقافتی و معاشرتی و معاشی موضوعات ہوتے ہیں۔ ثقیل گفتگو سے پرہیز کیا جاتا ہے، اور بعض اوقات تو رسمی تعارف ہی ہوتا ہے تو یہ تقریب اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے''(۱۱)

جاپان میں کافی شاپ بے شمار ہیں ان میں سے ایک کافی شاپ ''سٹار بکس'' ہے جو امریکا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت سٹار بکس کی انتظامیہ کے پاس جاپان میں اس کے کاروبار کے انتالیس فیصد حصص ہیں۔ جاپان میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والا مشروب کافی ہے۔ اپنے مضمون ''بدلتے ہوئے ذوق شوق'' میں سفر نامہ نگار ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ نوے کی دہائی میں سفر نامہ نگار کے بڑے بھائی سے ملنے ان کے ایک دوست آسٹریلیا سے آتے ہیں اور وہ کھانے کے بعد کافی کی فرمائش کرتے ہیں۔ اس وقت ٹوکیو میں سفر نامہ نگار کے بھائی کافی شاپ کی تلاش میں نکلتے ہیں تو کافی تلاش کے بعد انہیں ''شن جیکو'' میں ایک کافی شاپ دکھائی دیتی ہے وہاں سے کافی کے تین کپ تین ہزار روپے میں ملتے ہیں۔ آج جاپان میں سینکڑوں کافی ہاؤس ایسے ہیں جہاں کافی کا کپ تین چار سو سے زیادہ کا نہیں ہے۔

عامر بن علی اپنے مضمون میں کافی کی دریافت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ کافی کو ایتھوپیا کے ایک چرواہے نے دریافت کیا تھا۔ اس چرواہے کی بھیڑ بکریاں جب کافی کے دانے کھاتیں تو مستی اور سرور میں آجاتی تھیں ایک دن وہ چرواہا بھی کافی کے دانے کھاتا ہے تو اپنے آپ کو چست محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ بات ایتھوپیا کے دیگر قبائل میں پھیل گئی۔ نتیجتاً کافی افریقی قبائل کا محبوب مشروب بن گئی۔ فرانسیسی کافی کو یورپ لے کر گئے پھر یورپ کے لوگوں نے باقاعدہ کافی لے کر پینا شروع کیا۔ ''کاپے چینو کافی'' کے ساتھ مسلمانوں کی بھی تاریخی نسبت ہے جب سپین میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو وہ کافی کی بوریاں وہاں لے کر آئے عیسائی جنرل نے وہ کافی اپنے فوجیوں کو بطور مشروب پلائی ان کے فاتح سپاہ کا نام ''کاپے چینو'' تھا۔ اس لیے کافی کا نام اس کے نام سے منسوب ہو گیا۔ گزشتہ چند سالوں میں افریقی چرواہے کی اس دریافت نے کامیابی کے ایسے جھنڈے گاڑھے ہیں کہ کافی کے بغیر جاپانی قوم کی زندگی کا تصور محال ہے۔

آج کے دور میں جاپان اس قدر ترقی کرنے کے باوجود بنیادی اصول حیات، اخوت، محبت اور گرم جوشی سے استقبال کرنا مذہبی عقائد کا پرتو ہے نظریات، خدشات، مذہبی عقائد، رسمیں کسی بھی ملک و قوم کے ہوں مشترکہ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جاپان میں بھی دوسرے ممالک کی طرح سالِ نو کا جشن بہت خوشی سے منایا جاتا ہے۔ جاپان میں عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن پھر بھی سال نو کا جشن اور کرسمس بالکل اسی طرح جوش و جذبے سے منایا جاتا ہے جیسا کہ مسیحی ملک میں منایا جاتا ہے۔ شام سے پہلے ہی رنگوں اور روشنیوں کا دریا بہنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ سلسلہ نومبر

کے آخر سے لے کر جنوری کے آخر تک چلتا ہے۔ ہر جگہ پر سانتاکلاز کے مجسمے اور کرسمس بڑے سجے ہوئے ہوتے ہیں، بازاروں میں کرسمس اور نئے سال کے مدھر گیت گائے جاتے ہیں۔ سرخ اور سبز ڈبوں میں بہت سے تحائف کرسمس لڑی پر سجے ہوئے جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ کرسمس کے موقع پر اور نئے سال کے جشن پر ہر چیز پر ۵۰ فیصد کمی کی جاتی ہے اور قیمت ۷۰ فیصد سے ۸۰ فیصد تک بھی کئی جگہ پر کم کی جاتی ہے۔ جاپان کے دوسرے شہروں کی طرح ٹوکیو بھی اس موقعہ پر روشنیوں اور رنگوں میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ ٹوکیو جاپان کا دارالحکومت ہے اس علاقے میں بارشوں کی کثرت کی وجہ سے سبزا وافر ہے۔ ٹوکیو کے لوگ صفائی کا اس قدر خیال رکھتے ہیں کہ فضائی آلودگی کا تصور ہی نہیں ہے۔ چند ہی ممالک کے باشندوں کو صاف ہوا میں سانس لینے کی سہولت حاصل ہے جیسے ٹوکیو کے لوگ شفاف فضاء میں سانس لیتے ہیں۔ ٹوکیو میں لوگوں نے سبزے کی کمی کو پورا کرنے کے لیے چھتوں پر باغیچے بنا رکھے ہیں جسے ہم ''بام باغ''یعنی چھت کا گلشن بھی کہہ سکتے ہیں۔ ٹوکیو کی صبح بہت شاندار منظر پیش کرتی ہے۔ ٹوکیو گنجان آباد اور محدود رقبے کے باوجود کشادہ کشادہ محسوس ہوتا ہے۔ ٹوکیو میں جگہ کا زیاں بالکل بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر آصف محمود جاہ جاپان کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> **''جاپان میں جگہ کم ہے تو ان لوگوں نے زمین کا سینہ پھاڑ کر اس کے اندر شہر بسا لیے ہیں''**(۱۲)

جاپان میں چھوٹے چھوٹے اور صاف ستھرے مکان ہیں۔ جاپانی قوم زمین کے چپے چپے پر کوئی نہ کوئی چیز اُگاتے ہیں زمین ایک انچ بھی ضائع نہیں کرتے۔

عامر بن علی اپنے مضمون ''سال نو اور نیا دارالحکومت'' میں اس بات کا انکشاف کرتے ہیں:

> **''ٹوکیو دنیا کا سب سے گنجان آباد شہر ہے چار کروڑ کی آبادی والے اس شہر کے قریب قریب کوئی بھی گنجان آباد نہیں۔۔۔ اس شہر کی اکثریتی آبادی چھوٹے چھوٹے فلیٹ نما گھروں میں رہتی ہے، ان رہائش گاہوں کا عمومی سائز اندرون لاہور شہر میں گھروں کی چھتوں پر کبوتروں کے بنے ڈربوں سے ملتا جلتا ہے مگر طرزِ تعمیر کی مہارت دیکھیے کہ اتنی سی محدود جگہ میں بھی گھر کی بنیادی ضروریات فراہم کر دی جاتی ہیں۔۔۔ شہر بھر کی زمین کو بڑی بچت اور ہوشیاری سے استعمال کیا گیا ہے''**(۱۳)

سفر نامہ نگار کے مطابق ملک کا دارالحکومت کم آبادی والے علاقے میں ہونا چاہیے تاکہ وی آئی پی آمدورفت کی وجہ سے عام لوگوں کی زندگی متاثر نہ ہو۔ ٹوکیو سے پہلے جاپان کا دارالحکومت ''کیوٹو'' رہا ہے۔ سیاحت کے لحاظ سے جاپان کا شہر کیوٹو پہلے نمبر پر آتا ہے۔ سیر وسیاحت کے حوالے سے امریکا کا معتبر جریدہ ''ٹریول اینڈ لیٹر'' ہے۔ ۲۰۱۴ء کے شمارے میں سیاحت کے حوالے سے دنیا کے ٹاپ ٹین لسٹ میں کیوٹو پہلے نمبر پر آیا ہے۔ کیوٹو میں شنتو دھرم اور بدھ مت مذہب کی

ہزاروں عبادت گاہیں ہیں جس کی وجہ سے معبدوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ جاپان کا اوساکا کے بعد بڑا شہر کیوٹیو ہے۔ کیوٹو میں جاپان کے حقیقی خدوخال دکھائی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کامران اس بارے میں اپنی تصنیف میں کہتے ہیں:

**''کیوٹو اور ٹوکیو میں یہ ظاہر تو حروف کی ترتیب ہی تبدیل دکھائی دیتی ہے مگر در حقیقت ان دونوں شہروں میں وہی فرق ہے جو لاہور اور اسلام آباد میں ہے۔ ٹوکیو کے دارالحکومت بن جانے کے بعد بھی کیوٹو کی عظمت اور بزرگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ سچ پوچھیں تو کیوٹو آج بھی جاپان کا تہذیبی و ثقافتی دارالحکومت ہے''**(۱۴)

عامر بن علی ''بہترین سیاحتی مقام کیوٹو'' جاپان کے شہر کیوٹو کا تذکرہ کرتے ہیں کہ یہ دنیا کا سب سے بہترین اور خوبصورت شہر ہے۔ اس کے منفرد ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اب تک کیوٹو کے سترہ تاریخی مقامات کو اقوام متحدہ کا ادارہ یونیسکو عالمی ورثہ قرار دے چکا ہے۔ یہ شہر بہت سی عبادت گاہوں، شاہی محلات اور باغات پر مشتمل ہے۔ کیوٹو کا نیشنل میوزیم اور بوٹینکل گارڈن قابل دید ہے۔ عامر بن علی پاکستانی ادیبوں کے وفد کے ہمراہ کیوٹو کی سیاحت کرتے ہیں۔ اس شہر کے باسیوں سے شہر کے متعلق گپ شپ کرتے ہیں۔ کیوٹو ایک ہزار سال تک جاپان کا دارالحکومت رہا ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے ایک جاپانی دوست سے سوال کرتے ہیں کہ جاپان کی اپنی عمر کتنی ہے دوست کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا سوال کرنے کے تقریباً تین ہفتے بعد سفر نامہ نگار کا دوست اپنی منگیتر کو لے کر اس کا جواب دینے کے لیے سفر نامہ نگار کے آفس آجاتا ہے وہ خاتون بتاتی ہے کہ جاپان کم از کم دو ہزار سال اور زیادہ سے زیادہ بیس ہزار سال پرانا ملک ہے۔ سفر نامہ نگار جاپان کی ایک خاص بات بتاتے ہیں کہ اگر کوئی غیر ملکی اس ملک میں آجائے تو اس ملک کے تمام شہر ایک جیسے لگتے ہیں دوکانیں، سڑکیں، ہسپتال حتیٰ کہ چہرے اور فطرت کے مناظر بھی ایک جیسے لگتے ہیں پورے جاپان میں صرف ایک زبان بولی جاتی ہے۔

جاپان کے چند شہروں میں سے ہیروشیما بھی وہ شہر ہے جس میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہیروشیما کا حسن بم کی تباہی کے بعد بھی قائم ہے۔ الطاف شیخ اپنی تصنیف ''گیشاؤں کے دیس میں'' میں لکھتے ہیں:

**''جاپان آنے والے ہم وطن دوستوں کا ہیروشیما جانے اور وہاں کی سیر کرنے کا مشورہ دیتے وقت میں اُن سے کہتا ہوں جس طرح ہمارے شہر لاہور کے لیے کہا جاتا ہے کہ 'لہور لہورا ے' تو دوستو اسی طرح ہیروشیما، ہیروشیما ہے''**(۱۵)

۶ اگست ۱۹۴۵ء ہیروشیما خوبصورت شہر کا سیاہ ترین دن تھا اس دن تمام جنگی آداب بھلا کر ایک لاکھ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکا اور جاپان ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے۔ جاپانی فوجیں ایک ساتھ بہت سے حملے کر کے اتحادی فوجوں کو نقصان پہنچا چکی تھیں۔ جاپانیوں کی پیش قدمی سے امریکی فوج کافی بوکھلائی ہوئی

تھی کہ اچانک امریکا نے ۶ اگست کو دنیا کا پہلا ایٹم بم گرایا، چند لمحوں میں سارا شہر راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا، مکانوں کا نام و نشان تک مٹ گیا، کرہ ارض سے ہیروشیما کو تقریباً مٹا کر رکھ دیا گیا۔ ایک لاکھ لوگ جاں بحق ہو گئے، ۷۳ ہزار زخمی اور ۱۳ ہزار لاپتہ ہو گئے زندہ رہنے والوں کی حالت مرنے والوں سے بھی بدتر تھی اُن کے جسموں سے لباس کے ساتھ کھال بھی جھلس کر الگ ہو گئے تھے۔ اس تباہی کے بعد اس شہر میں کوئی شور وغل نہ تھا، نہ چیخیں تھیں، نہ کراہیں تھیں، شہر میں سب کچھ جل کر راکھ بن گیا۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے خوفناک حملہ تھا۔ چند برسوں میں ہی جاپانی حکومت نے تمام سڑکیں، عمارتیں اور پل دوبارہ بنا دیئے۔ آج ۷۰ سال بعد بھی زندہ بچ جانے والے لوگوں میں خوف، دہشت اور کرب کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایٹمی تابکاری کے اثرات کی وجہ سے برسوں بعد پیدا ہونے والے بچے بھی معذور پیدا ہوتے رہے۔ اس سے پہلے آج تک ایسی تباہی کی نظیر انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ جاپانی قوم نے ہیروشیما اور ناگاساکی کی راکھ پر بیٹھ کر اکتفا نہیں کیا بلکہ نئے جذبے اور عزم کے ساتھ تعمیرِ نو کی مہم شروع کی جو آج بھی جاری ہے۔ جاپانی ماضی کو بھی نہیں بھولے۔ جاپان میں روایت پسندی اور جدیدیت کا خوبصورت امتزاج ہے جو دنیا میں اور کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ عامر بن علی ''ہیروشیما کا ایٹمی گنبد'' میں بیان کرتے ہیں:

> **''آپ نے ہیروشیما کے ایٹمی گنبد کی تصویر تو یقیناً دیکھی ہو گی دنیا میں جہاں کہیں ایٹمی اثرات یا امن کی بات ہو تو وہاں ایٹم بم سے تباہ ہونے والی اس نیم کھنڈر نما عمارت تصویر ہی عموماً استعمال ہوتی ہے۔ ہیروشیما کے نام کے ساتھ اب امریکی ایٹمی بمباری سے متاثرہ یہ میٹالے رنگ کا شکستہ گنبد فوراً دماغ میں آتا ہے اقوام متحدہ نے اس کثیر المنزلہ عمارت کو عالمی ورثہ قرار دیا ہے''**(۱۶)

پورے شہر میں تباہ ہونے والی سڑکوں، عمارتوں اور سکولوں کو دوبارہ بنایا گیا لیکن ایک عمارت پورے شہر میں ویسی ہی ہے جو ایٹم گرائے جانے کے وقت موجود تھی اس عمارت کو ایٹمی گنبد کہتے ہیں۔ اس عمارت سے تباہی کے اثرات واضح دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہیروشیما سے لاطینی امریکا کے اساطیری انقلابی گوریلا چے نے اپنی صاحبزادی کو پوسٹ کارڈ کے ذریعے پیغام دیا کہ ہر شخص جو امن سے محبت کرتا ہے اُسے ایٹمی گنبد ضرور دیکھنا چاہیے۔ عامر بن علی انکشاف کرتے ہیں کہ ۲۰۱۳ء میں ہیروشیما یونیورسٹی کے ایک محقق نے اس عمارت کا ایک ٹکڑا نکال لیا ہے جو عمارت سے ٹوٹ کر بم گرانے کی وجہ سے دریا میں جا گرا تھا۔ اس ٹکڑے کا وزن ۳۰۰ کلو گرام ہے۔ یہ ٹکڑا دوسری جنگ عظیم میں ہونے والی تباہی اجاگر کرتا رہے گا۔ ہیروشیما دوسرے شہروں کی طرح جدید نگر ہے لیکن واحد عمارت بچ جانے کی وجہ سے ایٹمی گنبد کی وجہ سے اس شہر کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

مسلمانوں کے لیے محرم الحرام جس طرح سوگ سے منایا جاتا ہے بالکل اسی طرح جاپان میں اگست کا مہینہ منایا جاتا ہے جو شخص جس علاقے سے بنیادی تعلق رکھتا ہو اگست میں اپنے پیاروں کی قبروں پر دیکھ بھال کے لیے ضرور جاتا ہے اگست

میں پورا مہینہ چھٹیاں ہوتی ہیں۔ دفاتر بھی سہولت کے مطابق چند چھٹیاں مناتے ہیں۔ جگہ جگہ پر نوجوان روایتی لباس پہن کر جلوس نکالتے ہیں۔ ہیروشیما کی تباہی کے تین دن بعد امریکی صدر ہیری لٹرومین کے حکم پر ناگاساکی میں دوسرا بم پھینکا گیا۔ دونوں شہروں میں مرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ ہیروشیما پر گرائے جانے والے بم کا نام ''لٹل بوائے'' رکھا گیا جبکہ ناگاساکی پر پھینکے گئے بم کو ''فیٹ مین'' یعنی موٹے آدمی کا نام دیا گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپانی فوج نے ہار تسلیم کر لی اور ہتھیار ڈال دیئے لیکن ہروشیما پر گرانے والے بم نے دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنگ کا تصور ہی تبدیل کر دیا۔ ۶ اگست اور ۹ اگست کو ایٹم بم گرنے کی جگہ جہاں پر امن پارک قائم ہے اس میں تقریب رکھی جاتی ہے۔ اس تقریب میں وزیر اعظم سمیت سفارت کار اور عام شہری شرکت کرتے ہیں۔ ہلاک شدگان کی یاد پر پھول چڑھائے جاتے ہیں اور ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ عامر بن علی اپنے مضمون ''ایٹمی بمباری کی یاد میں'' کہتے ہیں:

> **''دوسری جنگ عظیم میں کس حکمران کا کتنا قصور تھا؟ اور کون سی ریاست کتنی قصور وار تھی؟ اس کا فیصلہ کرنا تو بہت مشکل ہے شاید ناممکن ہی ہوگا کیونکہ جنگ میں تو پہلی موت ہی سچائی کی ہوتی ہے اس وقت جاپان مشرق بعید میں جارحیت کا مرتکب تھا، نوآبادیاں قائم کر رہا تھا دیگر بھی ایسے بہت سے امور میں ملوث تھا جن کی توجیح پیش نہیں کی جاسکتی''**(۱۷)

آبادی کے لحاظ سے جاپان دنیا کا گیارہواں ملک ہے دنیا کی کل آبادی کا ۲ فیصد حصہ یہاں آباد ہے۔ جاپان کی پچھلی مردم شماری کے مطابق یہاں بارہ کروڑ تہتر لاکھ افراد زندگی گزار رہے تھے جبکہ جدید اعداد وشمار کے مطابق یہاں کی آبادی بارہ کروڑ تہتر لاکھ افراد زندگی گزار رہے تھے جاپان میں گرتی ہوئی آبادی کی سب سے بڑی وجہ کم شرح پیدائش ہے۔ کم شرح پیدائش کی وجہ ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی ہے۔ مہنگائی میں جاپان کے دو تین شہر ہر سال دنیا کے مہنگے ترین شہروں میں شامل ہوں گے۔ مہنگے ترین شہروں میں عموماً ٹوکیو اور اوساکا اس فہرست میں شامل ہیں۔ اس ملک میں بچے پالنا بہت مہنگا ہے اس لیے لوگ دو بچوں کے بعد مہنگائی کے خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جاپان میں آبادی کی کمی کی دوسری وجہ شہروں کی مختصر رہائش گاہیں ہیں۔ جاپان کی کل ۶ فیصد آبادی دیہاتوں میں جبکہ ۹۴ فیصد آبادی شہروں میں رہائش پذیر ہے۔ شہروں میں گھروں کا سائز چھوٹا ہوتا ہے اس لیے وہاں بڑے خاندان کا رہنا ناممکن ہے۔ جاپان کے شہروں میں رہائش گاہوں کا سائز چھوٹا ہے جس میں بڑا خاندان سمانا ناممکن ہے۔ عامر بن علی ''جہاں گردی'' کے مضمون ''سفید بالوں والا ملک'' میں جاپانی آبادی کی کمی کی وجوہات کو قلمبند کرتے ہیں کہ اس کی بڑی وجہ مذہب سے دوری ہے، انہیں مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔ جاپان میں زراعت کے شعبے سے منسلک افراد میں بھی خاطر خواہ کمی آئی ہے یہاں پر زیادہ تر لوگ جو بوڑھے ہیں وہ ہی زراعت کے شعبے سے منسلک ہیں۔ زراعت کے شعبے میں افراد کی کمی کے ضمن میں عامر بن علی اس مضمون میں لکھتے ہیں:

''ملک میں مجموعی طور پر زیر کاشت رقبہ مسلسل کم ہوتا جا رہا ہے گزشتہ پانچ سالوں میں روزی روٹی کمانے اور اس شعبے پر انحصار کرنے والے افراد کی تعداد میں چودہ فیصد کمی ہوتی ہے''(۱۸)

جاپان میں گرتی ہوئی آبادی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے اس کے برعکس پاکستان میں خانہ منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے بڑھتی ہوئی آبادی ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ عامر بن علی نے اپنے مضمون ''زندگی کا سرچشمہ'' میں جاپان کے زلزلے اور سونامی سے متاثرہ افراد کے حالات کو قلمبند کیا ہے۔ وزارت صحت ایک تحقیقی رپورٹ تیار کرتا ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ آفت زدہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے بچوں میں سے ہر چوتھا بچہ اَبنارمل ہے۔ رپورٹ کے مطابق ۲۵.۹ فیصد بچے تشدد میں مبتلا ہیں جن کو طبّی امداد کی ضرورت ہے۔ ان بچوں کو غیر صحت مند ہونے کی وجہ دوستوں کو کھو دینا اور والدین سے بچھڑنا ہے۔ بچوں کو صحت مند بنانے کے لیے ان کے سکول اور گھر والوں کو تعاون کرنا چاہیے۔

بچپن میں پیش آنے والے حادثات انسان کی زندگی کو متاثر کر سکتے ہیں اس کی ایک مثال سفر نامہ نگار نے یوں بیان کی ہے کہ فرانس کا لیڈر نپولین بوناپارٹ چھ ماہ کا تھا جب اس کے سینے پر ایک جنگلی بلا سوار ہو گیا تھا نپولین بوناپارٹ ساری زندگی ان بلیوں سے ڈرتا رہا تھا۔ انیسویں صدی میں یورپ پر بوناپارٹ کی دہشت تھی لیکن انگلستان کے جنرل نپلیین کو بوناپارٹ کی کمزوری کا پتہ تھا وہ واٹرلو کی جنگ میں ۷۰ فیصد جنگلی بلے اپنے لشکر کے ساتھ لے کر آتا ہے نپولین بوناپارٹ جنگلی بلے دیکھ کر ڈر جاتا ہے جس وجہ سے اسے زندگی میں پہلی بار شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالات اور واقعات کا اثر بچوں پر پڑتا ہے دوسری جنگ عظیم میں ایٹمی تابکاری کی وجہ سے برسوں بعد بھی کئی بچے معذور پیدا ہوتے رہے۔ اسی طرح پاکستان میں بھی دہشت گردی کے برے اثرات بھی بچوں پر پڑے ہیں اس خون ریزی کے دور میں پرورش پانے والے بچے کل کو جب ملک کی باگ دوڑ سنبھالیں گے تو کیسا معاشرہ دیں گے۔ اس حوالے سے سفر نامہ نگا نوبل انعام پانے والی شاعرہ گبریلا مسترال کی نظم کا ہسپانوی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کرتے ہیں اس نظم کا نام ''آج'' ہے۔ اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہم بہت سی غلطیوں اور خرابیوں کے ذمہ دار ہیں مگر ہمارا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے اپنے بچوں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ زندگی کے چشمے کو بھلا رکھا ہے۔ بہت سی چیزیں جن کی ہمیں ضرورت ہے انتظار کر سکتی ہیں، مگر بچے انتظار نہیں کر سکتے۔ یہی وقت جب ان کی ہڈیاں بن رہی ہوتی ہیں، ان کا خون بن رہا ہوتا ہے۔ ان کو ہم یہ جواب نہیں دے سکتے کہ ''کل'' کیونکہ اس کا نام ''آج'' ہے''(۱۹)

اس انشائیے میں عامر بن علی نے بنیادی طور پر یہ بتایا ہے کہ قدرتی آفات بچوں پر اثر انداز ہوتی ہیں اور یہ اثرات گہرے ہوتے ہیں۔ دہشت گردی، خون ریزی اور آفات کی وجہ سے بچے ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بچوں کا مستقبل بہتر بنانے کے لیے ان کے گھر والوں کو ان پر توجہ دینی چاہیے۔

جاپان نے سونامی اور ۲۰۱۱ء کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ایٹمی بحران اور دوسری جنگ عظیم کے ملبے سے خود کو نکالا اور معاشی ترقی کر کے دنیا کے لیے ایک مثال بن گیا۔ ان کی معاشی ترقی کا سبب مستقل مزاجی سے سخت محنت اور محنت کا سماجی اعتراف ہے۔ جاپانی قوم قائد اعظم کے قول کام، کام اور کام پر عمل کرتی ہے۔ جاپانی قوم کے بارے میں سید راس مسعود لکھتے ہیں:

**''جاپان نے جس تیزی کے ساتھ ترقی کر کے ایک بڑی طاقت کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے یہ کوئی معجزہ نہیں تھا کیونکہ جاپان کی ترقی میں کوئی بات مافوق الفطرت نہیں ہے جاپان نے جو کام کیا اور قومیں بھی کر سکتی ہیں بشر طیکہ وہ اس بات کو ذہن نشین کر لیں کوئی قوم بڑے بڑے کام اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک اس کے افراد خلوص اور شوق سے کام کرنے کو تیار نہ ہو جائیں''**(۲۰)

عامر بن علی جاپان کی ترقی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ نہ صرف دوسرے شعبہ جات میں بلکہ ٹریفک کا نظام ہو یا ریلوے کا نظام، جاپانی قوم نے ہر جگہ کامیابی کے جھنڈے گاڑھ دیئے ہیں۔ جاپان میں تیز رفتار گاڑیوں کو پکڑنے کے لیے تمام شاہراہوں پر موٹروے پولیس کی طرف سے کیمرے نصب کیے گئے ہیں جو خود بخود تیز رفتار گاڑیوں کی تصویر کھینچ لیتے ہیں اور گاڑیوں کی نمبر پلیٹ کے ذریعے مالکان کا پتہ کر کے ڈاک کے ذریعے نوٹس بھجوا دیا جاتا ہے خلاف ورزی کرنے والوں کو پولیس طلب کر کے تصویر دکھانے کے بعد معاملہ عدالت کے سپرد کر دیتی ہے اور جج جرمانہ عائد کرتے ہیں۔ عامر بن علی ''ترقی کا راز'' میں اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ جاپان میں کمپنی کے مالک مزدور کی طرح کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ کمپنی کا مالک اگر ارب پتی بھی ہو تو وہ بھی مزدور کا لباس پہن کر بالکل ان کے برابر ہی کام کرتا ہے اور یہ جاپانی قوم کی ترقی کی وجہ ہے جبکہ ہمارا ملک دنیا کی ذہین ترین اقوام میں پانچویں درجے میں آتا ہے اور جاپان کے مقابلے میں قدرتی وسائل سے مالا مال ہے لیکن ذہانت اور قدرتی وسائل کی یہ چیزیں ترقی کی ضمانت نہیں ہو سکتی ہیں جب تک محنت نہ کی جائے تب تک کامیابی نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ ہو سکتا نہیں کہ رب العالمین کسی فرد یا قوم کو اس کی محنت کا صلہ نہ دیں۔ یہ کھلا راز ہے کہ دنیا میں ترقی کا اصول مستقل محنت ہے۔

جاپان کی معیاری پیداوار دنیا کے دیگر ممالک سے ذرا مختلف نوعیت کی ہے۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں معیشت اور تجارت کے طلباء کو صنعت و حرفت کے شعبے کو جاننے کے لیے مضمون پڑھایا جاتا ہے لیکن جاپان میں صنعت ہی کو نہیں بلکہ معیار کو پرکھنے اور قائم رکھنے کا پیداوار کے تمام شعبوں میں مربوط نظام موجود ہے۔ عامر بن علی نے اپنے مضمون ''مجموعی میعاری پیداوار کا جاپانی تصور'' میں جاپان کے معیاری پیداوار کی وضاحت کی ہے۔ سفر نامہ نگار نے جاپان کی میعاری پیداوار کو جانچنے کی ایک مثال پیش کی ہے کہ ایک کمپنی ٹی وی بناتی ہے تو وہ اس کے بٹن، اسکرین، سوئچ، بلب وغیرہ

ہر پرزے کو الگ الگ جانچ کرے گی لہٰذا جب ہر پرزے کی جانچ پڑتال ہو گی تو تیار شدہ ٹی وی کے غیر معیاری اور خراب ہونے کے امکان کم ہو جائیں گے۔ یہ جاپان کے معیاری پیداوار کا تصور ہے۔ پاکستان کے صنعتی ادارے بھی اس تصور کو اپنا رہے ہیں کیونکہ اس معیار سے منافع کمایا جاتا ہے۔ جاپان میں معیاری پیداوار کا تصور صرف صنعت ہی نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں کارفرما ہے۔ جاپان میں کسی خرابی اور نقص والی شے کو فروخت کرنا معاشرتی طور پر برا سمجھا جاتا ہے۔ جاپان میں کوئی چیز خریدتے ہوئے خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ چیز معیاری ہو۔ جاپانی معاشرے کے لوگ غلطی کی گنجائش گوارا نہیں کرتے۔ قدیم زمانے میں جاپان میں جاگیردارانہ نظام قائم تھا۔ اس زمانے میں اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جاتی تو وہ شخص خودکشی کر لیتا تھا۔ یہاں غلطی کو ختم کرنے کے لیے ہر چیز کے معیار کی پڑتال کی جاتی ہے۔ غلطی سے مبرا ہونے کا رویہ جاپان کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ جاپانی قوم ہمت نہیں ہارتے جیسا بھی مشکل کام ہو یا دورانیہ چاہے جتنا بھی طویل ہو یہ جلدی گھبراتے اور اکتائے نہیں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ کام میں جتے ہی رہتے ہیں۔

جاپان کی جدید اشیاء میں سے تیز رفتار بلٹ ٹرین بھی ہے۔ اس بلٹ ٹرین نے خوبصورتی، آرام دہ سواری اور سلامتی، تیز رفتاری اور وقت کی پابندی کے لحاظ سے بہت زیادہ نام پیدا کیا ہے۔ یہ بلٹ ٹرین اپنے نام کی مناسبت سے گولی کی رفتار سے چلتی ہے۔ اس کی رفتار فوکر ٹائپ ہوائی جہازوں سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ الطاف شیخ ''گیشاؤں کے دیس میں'' بلٹ ٹرین کے بارے لکھتے ہیں:

> **''جاپان کا نام سنتے ہی یہاں کا مشہور پہاڑ فیوجی (FUJI)، خوبصورت ملبوسات اور میک والی گیشائیں درمیان میں آ جاتی ہیں۔ دونوں جاپان کی قدیم اشیاء ہیں اور انہی کے ساتھ جاپان کی تیز رفتار بلٹ ٹرین جو جاپان کی جدید اشیاء میں سے ایک ہے، یہاں آنے والا اس ریل گاڑی میں جسے جاپانی میں شنکانیس کہتے ہیں، ایک دفعہ ضرور چڑھتا ہے یا اسٹیشن پر آ کر اسے کھڑے کھڑے دیکھتا ہے''** (۲۱)

عامر بن علی اپنے مضمون ''مستقبل کا سفر'' میں اس ٹرین کا تذکرہ کرتے ہیں کہ دنیا بھر میں جاپان کی بلٹ ٹرین کا چرچا ہے اس ٹرین کی رفتار ۶۰۳ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے اس ٹرین کے ماڈل کو ''میگلیف'' کا نام دیا گیا ہے یہ ٹرین جس ٹریک پر چلتی ہے ٹوکیو کے ۴۲ کلومیٹر گردونواح میں بچھایا گیا ہے لیکن کچھ سالوں میں جاپان کے اور بڑے بڑے شہر بھی اس ٹریک سے آپس میں منسلک ہو چکے ہوں گے۔ یہ ٹرین گاڑی کی رفتار کی بجائے جہاز کی رفتار معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہ ٹریک پاکستان میں بچھایا جائے تو لاہور اور کراچی کے درمیان دو گھنٹوں کا فاصلہ رہ جائے لیکن پاکستان میں یہ مشکل امر ہے لیکن امریکا یہ بلٹ ٹرین ٹیکنالوجی کا منصوبہ خرید کر جاپان لے جانا چاہتا ہے۔ اس ٹریک کو امریکا کے دو بڑے شہروں میں بچھانے کا خرچ سو ارب امریکی ڈالر ہے۔ اس کے مہنگے ہونے کی وجہ ٹریک کی بنیادیں بہت ہی مضبوط رکھی گئی ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں بلٹ ٹرین کو

بنایا گیا لیکن نصف صدی میں ٹرین سے کوئی حادثہ نہیں ہوا۔اس بلٹ ٹرین کے بعد سات سواریوں کے لیے چھوٹا طیارہ بھی جاپان نے ایجاد کیا ہے۔اس طیارے کی خوبی یہ ہے کہ دوسروں کی نسبت تیل کا بہت کم خرچہ ہے اور اس کے کیبن زیادہ کھلے ہیں۔ پاکستان میں QR کوڈ کا بہت چرچا ہے اس کی ایجاد کا سہرا بھی جاپان سے تعلق رکھنے والے ''ماساہیر وہار'' اور ان کی ٹیم کو جاتا ہے۔QR کے موجد اور اس کی ٹیم کو یورپی ایجاداتی ادارے کی جانب سے پاپولر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ عامر بن علی ''مارکیٹنگ کی دنیا میں انقلاب'' میں لکھتے ہیں کہ ہارا نے QR کوڈ ۱۹۹۴ء میں ترتیب دیا تھا لیکن اس کی ایجاد کا دنیا بھر میں استعمال بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔اس کوڈ کو سمجھنے کے لیے چند باتیں بہت ضروری ہیں اس کو پڑھنے کے لیے کیمرہ یا سکینر بہت اہم ہے۔QR کوئیک رسپانس کا مخفف ہے۔اور یہ بالکل بلٹ ٹرین کی طرح تیز رفتار ہے۔ یہ کوڈ دنیا بھر میں مقبول اور قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار بتاتے ہیں کہ یہ کوڈ ابتداء میں گاڑیوں کے پرزے بنانے والی صنعت میں استعمال کرنے کے لیے ایجاد کیا گیا تھا۔ابتدائی شعبے میں کامیابی کے بعد یہ کوڈ دیگر شعبوں میں بھی جانچا گیا تو آسان استعمال، رفتار اور وسعت کے سبب کامیاب رہا۔اس کوڈ کے موجد کا کہنا ہے کہ وہ اس کوڈ کو مزید ترقی دے گا اور اسے بہتر بنا کر پوری دنیا میں پھیلائے گا تاکہ لوگوں کے لیے آسانی پیدا ہو سکے۔

امجد اسلام امجد جاپانی قوم کی عقل مندی اور دور اندیشی کی داد دیتے ہیں۔ ''چلو جاپان چلتے ہیں'' میں مصنف لکھتے ہیں کہ جاپانیوں نے اپنی صنعتی ترقی کے ابتدائی زمانے میں ہی اپنی یونیورسٹیوں میں ان زبانوں کی تعلیم کے شعبے شروع کر دیئے تھے جو آگے چل کر ان مصنوعات کی منڈی بننے والے تھے۔ جاپان کی بڑی تین یونیورسٹیوں میں اردو کا شعبہ موجود ہے۔ عامر بن علی اپنے مضمون ''جاپان کے اردو سائن بورڈ'' میں لکھتے ہیں کہ ۱۷۹۶ء میں اردو کی تاریخ اردو زبان کی لغت کی تیاری سے شروع ہوتی ہے۔ جاپان کی ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہان اور سٹاف کی اکثریت جاپانی النسل ہیں مگر اردو فراوانی سے بولتے ہیں۔ پاکستان کے تمام اساتذہ کرام تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہیں۔اردو زبان کا استعمال درس گاہوں کے باہر بھی کیا جاتا ہے۔ جاپان کے سائن بورڈ اردو میں لکھے گئے ہیں جو پڑھنے سے زیادہ دیکھنے میں دلچسپ لگتے ہیں۔ اردو زبان کی اہمیت اور وسعت کا اندازہ جاپان کے مختلف سائن بورڈز سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بورڈز کچھ سرکاری اور غیر سرکاری ہیں۔

جاپان میں انگریزی زبان کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو پاکستان میں ہے۔ جاپان میں دیگر یورپی زبانوں کی طرح انگریزی بھی فقط غیر ملکی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ پاکستان میں تاج برطانیہ کی عملداری سے آزاد ہونے کی وجہ سے رومن رسم الخط میں لکھی گئی ہر عبارت کو انگریزی ہی کہا جاتا ہے جبکہ جاپان میں رومن رسم الخط کی ہر تحریر اور حروف تہجی کو ''روماجی'' کہا جاتا ہے۔اس ملک میں روماجی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اس کی غیر موجودگی میں جاپان میں رہنے والے غیر ملکی ان پڑھ کہلاتے ہیں۔ عامر بن علی اپنے مضمون ''روماجی'' میں لکھتے ہیں:

"اگرچہ جاپانی رسم الخط تین طرح کے ہیں، مگر تینوں ایک سے بڑھ کر ایک مشکل ہے۔۔۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہاں پر تحریر ان تینوں رسم الخطوط کو ملا کر ہی لکھی جاتی ہے لٰہذا نستعلیق جاپانی پڑھنے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے" (۲۲)

عامر بن علی کہتے ہیں کہ دنیا میں انگریزی نے اپنی اہمیت کو منوایا ہے ویسے جاپان اس کی اہمیت کو مانتا ہے۔ یہاں کے تعلیمی اداروں میں انگریزی کو بطور لازمی مضمون پڑھایا جاتا ہے۔ دوسرے ممالک سے انگریزی اہل زبان اساتذہ کو بلوایا جاتا ہے لیکن پھر بھی جاپانی قوم انگریزی زبان سیکھنے کی کوشش میں ناکام ہی رہتی ہے۔ جاپانی خواتین غیر ملکی زبان سیکھنے کے لیے غیر ملکی مردوں سے شادی بھی کر لیتی ہیں لیکن پھر بھی جاپان میں انگریزی کا جاپان ممکن نہیں ہو سکا۔ سفر نامہ نگار کو انگریزی کی معلمہ نے بتایا کہ انگریزی سکھانا جاپان میں ایسے مشکل ہے کیوں کہ "جاپان بہت جاپانی ہے" اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کی سرحدیں ماضی میں تین صدیوں تک مکمل بند رہی ہیں جس کی وجہ سے جاپان میں غیر ملکی اثرات بھی بہت کم ہو گئے۔ ان صدیوں کی تنہائی کے اثرات لوگوں کے رویوں، نفسیات اور زندگی کے ہر شعبے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بے ساختگی اور بے تکلفی سے جاپان کے بارے میں اور جاپانی قوم کے بارے میں بیان کرتا ہے اور سفر نامہ میں طنز و مزاح کے ذریعے اپنی فنکارانہ آراستگی کو عروج تک پہنچایا ہے۔ سفر نامہ نگار کا اندازہ بیاں سادہ اور پُر لطف ہے۔

دنیا کی ہر بڑی تہذیب، ہر خطہ اپنے چند نمایاں اوصاف، خصوصیات کے باعث پہچانا جاتا ہے۔ ہر تہذیب کے اپنے اپنے رنگ اور اپنا ہی نظام حیات ہوتا ہے جو کہ دیگر ممالک دیگر تہذیب سے جدا اپنے کلچر کو فروغ دیتا ہے۔ عامر بن علی بھی اپنے دور صحافت میں ان تجربات سے دوچار ہوتے ہیں جن کا احوال انہوں نے یہاں چند ممالک کے اظہار سے کیا ہے۔ دور حاضر کی ترقی میں اردو کے ادیبوں کی کوشش رہی ہے کہ وہ اپنی زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ دیگر اقوام کے احوال سے اپنے لوگوں کو متعارف کروائیں اور اس کا سب سے بہترین نمونہ سفر نامہ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے ان ادیبوں کی فہرست میں عامر بن علی بھی شامل ہیں۔ وہ جن ممالک سے منسلک رہے وہاں کی تہذیب و ثقافت، سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی نظام سے حاصل کی اور اس کی روداد بیان کر کے اپنے لوگوں کو ان سے متعارف کروایا ان ممالک میں تھائی لینڈ، سری لنکا، قطر، ارجنٹائن، پیرو، چلی اور میکسیکو شامل ہیں۔ سفر نامہ نگار کی کتاب "جہاں گردی" کے حصہ دوم "ہفت اقلیم" (سات ممالک کے اسفار) انہی ممالک کی روداد پر مشتمل ہے جس میں سب سے پہلے تھائی لینڈ کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

تھائی لینڈ کے لفظی معنی "آزاد لوگوں کے رہنے کی جگہ" ہیں۔ تھائی لینڈ کا تاریخی نام "سیام" ہے۔ تاریخ میں یہ ملک کبھی بھی کسی قوم کا غلام نہیں بنا۔ تھائی لینڈ کا دارالحکومت بنکاک ہے اور سب سے زیادہ آبادی اس شہر میں ہے۔ اس

کے شمال میں لاؤس اور میانمار (برما) واقع ہیں۔اس کے جنوبی طرف تھائی لینڈ اور ملائشیا کی خلیج اور مشرقی جانب کمبوڈیا اور لاؤس واقع ہیں اور مغربی جانب انڈیمان سمندر واقع ہے۔ تھائی لینڈ کی سمندری حدود جنوب مغرب میں انڈونیشیا اور بھارت سے جنوب مشرق میں ویتنام سے ملتی ہے۔ ۲۰۲۲ء کی مردم شماری کے مطابق تھائی لینڈ کی کل آبادی ۶۹،۶۴۸،۱۱۷ ہے اور رقبے کے لحاظ سے ۵۱۳،۱۲۰ مربع کلو میٹر ہے۔

تھائی لینڈ کی آبادی کا ۶۸ فیصد حصہ گاؤں میں مقیم ہے اور ۳۲ فیصد حصہ شہروں میں ہے بنکاک شہر میں ۱۰ فیصد حصہ مقیم ہے۔ تھائی لینڈ کی سرکاری زبان ''تھائی'' ہے اور ملک میں ۴۰ فیصد حصہ ''تھائی'' زبان بولتا ہے۔ تھائی زبان حروف ابجد میں لکھی جاتی ہے۔ تھائی قوم نے دنیا کے ساتھ بہتر شناخت میں قدم ملایا اور ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑے ہو گئے۔

عامر بن علی نے تھائی لینڈ کا بیان بہت ہی دلچسپ اور دلکش انداز میں کیا ہے۔ سفر نامہ نگار ''تھائی لینڈ۔ دیس اچھا مگر بدنام بہت ہے'' میں اس ملک کے مذہب، تاریخ، کرنسی، کھانے اور آمدورفت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ تھائی لینڈ کا نام موسم کے لحاظ سے تھائی لینڈ ہی ہونا چاہیے یہاں کا موسم بہار کی طرح ہوتا ہے نہ گرم نہ سرد۔ ملکی اکثریت مذہب کے لحاظ سے بدھ مت ہے بدھ مت کے پیروہونے کی وجہ سے لوگ پُر امن، منکسر المزاج، خدمت گزار اور بردبار ہیں۔ تھائی لینڈ میں ۹۴ فیصد حصہ بدھ دھرم، ۵ فیصد مسلمان اور ۱ فیصد دیگر مذاہب کو ماننے والے ہیں۔

سفر نامہ نگار کے مطابق تھائی لینڈ اپنے نام کی طرح بدنام ملک ہے۔ اگر کسی نیک کام کے لیے بھی اس ملک جا رہے ہو تو اس کے بارے گمان کیا جاتا ہے کہ برے کام کے لیے جا رہے ہیں۔ سفر نامہ نگار بتاتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں جب کالج کے ہم مکتب ساتھیوں کے ساتھ پہلی بار جب تھائی لینڈ گیا تو بعض نے استفسار کیا کہ شریف آدمی بنکاک کیا کرنے جا رہے ہو؟ تھائی لینڈ کے تاثر کی وجہ یہ ہے کہ جب امریکی فوجیں ویت نام میں داخل ہوئیں تو تھائی لینڈ کو عشرت کدوں کے حوالے سے عالمی شہرت ملی۔ امریکی فوج ویت کے محاذ سے تھکے ہارے چھٹیاں منانے ہمسایہ ملک تھائی لینڈ آنے لگے، ان فوجیوں کی سیاحتی سرگرمیوں کے ساتھ مبینہ ہل چل بھی فروغ پانے لگی۔ غیر ملکیوں کی تفریح طبع کے لیے حکومتی سرپرستی اور قانونی تحفظ کی وجہ قائم کیے گئے مراکز نے باقاعدہ انڈسٹری کی شکل اختیار کر لی ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں تھائی لینڈ نے جاپان کا ساتھ دیا ساتھ دینے کی وجہ سے یہ معاہدہ طے ہوا کہ جن علاقوں میں برطانیہ اور فرانس نے قبضہ کر رکھا ہے جاپان بھی اسے آزاد کرانے میں تھائی لینڈ کی مدد کرے گا مگر جنگ میں شکست کے بعد معیشت بری طرح متاثر ہوئی تھائی لینڈ نے اپنی بدحال معیشت کو بحال کرنے کے لیے ویت نام میں امریکا کی آمد کو بھرپور استعمال کیا۔ اس طویل جنگ میں امریکا کو شکست ہوئی۔ تھائی لینڈ اس جنگ کے دوران معیشت اور سیاحتی انڈسٹری کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

تھائی لینڈ کی مقامی کرنسی ''بھات'' ہے جو تین پاکستانی روپے کے برابر ایک بھات ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے دوست کے ساتھ بنکاک کے ائیر پورٹ پر انتظار کر رہے ہوتے ہیں ایک بیلجیم لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ رسمی تعارف کے بعد بیلجیم لڑکی کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ سفر نامہ نگار کا تعلق پاکستان سے ہے پاکستان کا سن کر لڑکی پُر جوش ہو کر سفر نامہ نگار کا ہاتھ چوم لیتی ہے اور بوسہ دینے کے بعد کہتی ہے کہ ''آپ لوگ عظیم ہیں'' سفر نامہ نگار جب اس لڑکی سے عظیم ہونے کی وجہ پوچھتے ہیں تو وہ لڑکی کہنے لگی کہ آپ کے ملک جیسی چرس پوری دنیا میں کوئی نہیں بناتا ہے۔ سفر نامہ نگار تھائی لینڈ کے کھانوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ تازہ کوکونٹ اور اس کا فرحت بخش دودھیا رس ایسی چیز ہے جس کا نعم البدل پوری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ تھائی لینڈ کے بازاروں میں بھاؤتاؤ کا انداز پاکستان جیسا ہے دوکاندار جو قیمت طلب کرتا ہے اس سے کہیں کم قیمت پر فروخت کر دیتا ہے۔

عامر بن علی تھائی لینڈ کی تہذیب و ثقافت اور سماجی رویوں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی ثقافت اور رویوں کے مماثلتی عناصر پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ سفر نامہ نگار تھائی لینڈ کی آمد و رفت کا ذکر کرتے ہیں کہ یہاں کا روایتی رکشہ ٹک ٹک ہے جو آمد و رفت کا سب سے اہم ذریعہ بنکاک میں ہے۔ تھائی لینڈ واحد ملک ہے جہاں پبلک ٹرانسپورٹ میں موٹر سائیکل بطور ٹیکسی استعمال ہوتا ہے۔ تھائی لینڈ میں ٹریفک کا نظام پاکستان سے بھی بدتر ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا شہر ٹریفک کے بہاؤ کے اعتبار سے بنکاک کو کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا بنکاک میں ٹریفک بلاک میں پھنس گئے تو دو چار گھنٹے تو معمولی بات ہے۔ سفر نامہ نگار کے مطابق آٹھ دس گھنٹے بھی آسانی سے لگ سکتے ہیں۔ٹریفک کے حوالے سے ڈاکٹر یوسف زئی ''تھائی لینڈ کے رنگ'' میں لکھتے ہیں:

> **''اس ماحول میں ایک چیز ہم سب کے لیے بڑی حیرت کا سبب بنی کہ گاڑیوں کے اس قدر اژدھام کے باوجود ہارن کی آواز کہیں سنائی نہ دیتی تھی۔ میرے ایک ہم سفر دوست کا بے لاگ تبصرہ یہ تھا کہ شاید یہاں کی گاڑیوں کے ہارن ہوتے ہی نہیں''** (۲۳)

بنکاک کا بڑا مسئلہ فضائی آلودگی ہے تھائی لینڈ میں آئینی طور پر بادشاہت ہے اور پارلیمانی نظام آئین کا حصہ ہے جو برطانیہ اور جاپان جیسا ہے۔ یہاں لوگ بادشاہت سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ عامر بن علی تھائی لینڈ کے احوال کے بعد سری لنکا کے بارے میں بنیادی معلومات کا خزانہ پیش کرتے ہیں۔

سری لنکا جغرافیائی لحاظ سے جنوبی ایشیاء کا ایک ایسا ملک ہے جس کا پہلا نام سیلون تھا۔ یہ ایک جزیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ بحیرہ عرب کے جنوب مشرق، بحیرہ ہند اور خلیج بنگال میں واقع ہے۔اسے برصغیر سے آبنائے پالک اور خلیج منار سے الگ کیا گیا ہے۔ سری لنکا کی سمندری حدود مالدیپ اور بھارت کے ساتھ ملتی ہیں۔ سری لنکا کا قانون ساز دارالحکومت ''سری

چرورد ھنے پورہ کوئے'' ہے اور سب سے بڑا شہر اور مالی مرکز کولمبو ہے۔ سری لنکا کی کل آبادی ۲۰۲ ملین ہے۔ جب بھی کسی ملک یا کسی تہذیب کا ذکر آئے تو ہم اس خطے کی پہچان وہاں کی چند متنوع خصوصیات سے کرتے ہیں چاہے وہ آبادی کے لحاظ سے ہو یا کہ قدیم تاریخ یا ریاست و ترقی کے لحاظ سے ہو۔ ایشیاء کی حدود میں بیشتر ممالک اپنی اپنی چیدہ خصوصیات کے حامل ہیں۔ ایشیاء کے جنوب میں واقع سری لنکا نامی یہ ملک یا خطہ اپنے اندر انفرادیت کا حامل ہے۔ اس ملک کا ذکر کرتے ہوئے چند حوالے جو ذہن میں ابھرتے ہیں اس میں وہاں کی مقبول سیلون چائے، ریڈیو سیلون، کرکٹ اور کثیر تعداد میں عبادت گاہیں اور لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام نامی تنظیم ہے جسے عموماً تامل ٹائیگرز کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ہمارے دور جدید کے سیاح عامر بن علی سری لنکا کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ سے آشنا ہوتے ہوئے اپنے مضمون 'سری لنکا۔ امن اور خوشحالی کی راہ پر گامزن'' میں ان کا مختصر احوال بیان کرتے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے یہ زیادہ بڑا تو نہیں مگر جب وہاں کی تہذیب سے آشنائی حاصل کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مختلف مذاہب سے بھرپور تنوع اور اکثریت کا حامل ہے۔ یہاں کی تاریخ بتاتی ہے یہ خطہ کس کس مذہب سے کس کس طرح منسلک رہا۔ زیر نظر مضمون میں عامر بن علی سے اس کا حوالہ بڑے خوبصورت اور منفرد مختصر انداز میں پیش کیا ہے جیسا کہ انہوں نے بتایا یہاں کی آبادی اکثریت کے لحاظ سے بدھ مت ہے۔ بدھ مت مذہب کی شناخت رکھنے والے ایک تاریخی ورثہ رکھتے ہیں جس کا تعلق سری لنکا سے جوڑا جاتا ہے۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات کو کتابی شکل میں سب سے پہلے سری لنکا میں ہی تحریر کیا گیا۔ کتابی شکل میں تحریر کرنے کا مقصد اسلامی صحیفہ قرآن پاک جیسی بیان کی جاتی ہے۔ جس کی حقیقت نہیں معلوم کیا ہے۔ بدھ بھیگشو نے مہاتما بدھ کی تعلیمات کو اپنے حافظے میں محفوظ کر رکھا تھا۔ آفات اور وباؤں سے ان بدھ بھکشوں کی ہلاکت سے ان تعلیمات کے ناپید ہونے کا خدشہ بڑھ گیا جس کی بدولت اس خطہ میں ان تعلیمات کو پہلی مرتبہ قلمبند کیا گیا اور ان تعلیمات کا نفوذ یہاں بیشتر کیا جاتا ہے جس کے سبب یہاں بدھ مت مذہب کے ماننے والوں کی تعداد بہت کثیر ہے۔ عامر بن علی لکھتے ہیں:

> **''سری لنکا کی بدھ مت شناخت اور ورثے کے لحاظ سے یہ چیز قابل ذکر ہے کہ۔۔۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات کو کتابی شکل میں پہلی مرتبہ اسی جزیرے پر دی گئی تھی۔ اس سے قبل مہاتما بدھ کی تعلیمات سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو بدھ بھکشو منتقل کرتے تھے''**(۲۴)

سری لنکا میں بدھ مت کے بعد دوسرا بڑا مذہب ہندوؤں کا ہے جن کی تعداد آبادی کا کل ۱۳ فیصد ہے۔ ہندوؤں نے اس خطے پر اجارہ داری کرنے کی کوشش کی ہے۔ سفر نامہ نگار نے بھی ایک حوالہ یہاں دیا ہے جو کہ تامل ٹائیگرز کے ساتھ منسلک ہے لکھتے ہیں کہ تامل ٹائیگرز کی تنظیم کو فروغ دینے میں ہندوؤں کا کافی کردار ہے بسبب یہ کہ سری لنکا میں اپنی آبادی اور

اثر ورسوخ بڑھا سکیں کیونکہ اس مذہب کے پیشوا اور عقیدہ رکھنے والے بھی خود کو یہاں سے جوڑتے ہیں۔ مصنف کتاب عامر بن علی لکھتے ہیں:

**''مہابھارت میں لکھا ہے کہ راونڑ نے سیتا کو اغواء کر کے یہاں پر ہی قید کیا تھا جب رام نے سیتا کی رہائی کے لیے سری لنکا پر ہلہ بول کر اسے تہس نہس کر ڈالا تو وہیں سے '' لنکا ڈھانے''کا استعارہ تشکیل پایا''**(۲۵)

تیسرا بڑا مذہب اسلام ہے جس کی تعداد عامر بن علی نے ۱۰ فیصد بتائی اور یہ بھی آگاہ کیا کہ یہاں پر بدھ معبد۔ مندر اور کلیساؤں کی طرح مساجد کی بھی ایک کثیر تعداد موجود ہے جس کا شمار کرنا مشکل ہے۔ دوسرا اور اہم حوالہ حضرت آدمؑ کی جائے نزول کا ہے۔ سری لنکا میں ایک مقام کولمبو سے دو گھنٹے کی مسافت پر موجود ہے جو "Adam Peak" کے نام سے مقبول ہے جس پر عیسائی مذہب کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر حضرت آدمؑ اترے تھے اور چوٹی پر ان کے پاؤں کے نشانات بھی موجود ہیں جس میں ایک مبالغہ آرائی بھی کی جاتی کہ یہاں حضرت آدمؑ کے نہیں بدھا کے پاؤں کے نشان ہیں۔ ان واقعات کی زیادہ تر کڑیاں حضرت آدمؑ کے واقعے کی صداقت پیش کرتی ہیں۔

سری لنکا پر بات کی جائے اور اس کی تاریخ کا حوالہ نہ دیا جائے مثبت تاثر نہیں جاتا۔ کتاب کے مصنف نے بھی اس خطے کے تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ تاریخ میں جھانکنے سے معلوم ہوا کہ اس خطے کو دورِ قدیم میں ''سیلون'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ۱۵۰۵ء میں پرتگال کے اس جزیرہ نما ملک پر قبضوں کے بعد اس کا نام ''سائی لیون'' رکھا گیا۔ برطانوی جب اس خطہ پر قبضہ برآں ہوئے تو انہوں نے پھر ''سیلون'' نام کو ترجیح دی۔ ۱۹۷۲ء کے بعد اس کا نام ''سری لنکا'' تجویز کیا گیا۔ اس سلسلے میں قمر علی عباسی ' لنکا ڈھائے''میں لکھتے ہیں:

**''ایک زمانے میں اس کا سراندیپ تھا۔ اس کے بعد سیلون کہلایا، ہم پہنچے تو سری لنکا تھے۔ نام بدلنے کی رسم برصغیر میں اکثر بیدار ہوتی ہے۔ اس وجہ سے لاکھوں کی رقم خرچ ہوتی ہے۔ عوام وہی ایرا غیرا نتھو خیرا ہیں''**(۲۶)

تامل ٹائیگرز کا ذکر کرتے ہوئے عامر بن علی اختصار سے کام لیتے ہوئے اس موضوع سے سرسری گزر جاتے ہیں جس کی وجہ سے قاری کو اس تنظیم کی سمجھ بوجھ میں مشکل درپیش رہتی ہے۔ اس تشنگی کو پیرائے کرتے ہوئے جب تفصیل دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تامل ٹائیگرز درحقیقت ہے کیا؟ ''لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام'' نامی ایک تنظیم نے تامل سے منسلک لوگوں کو سری لنکا میں اپنے قیام اور افکار کے لیے وہاں گھریلو جنگوں کا طویل سلسلہ قائم رکھا۔ گھریلو جنگوں سے مراد ملک کے اندرونی اور خفیہ افراد کے ذریعے اس ملک میں فسادات برپا کرنا اور امن وامان قائم نہ ہونے دینا۔ تامل ٹائیگرز نامی یہ دہشت گرد تنظیم ایک تہائی سری لنکا پر قابض رہی ہے۔ ایک وقت تھا ہندوستانیوں نے سری لنکا میں اپنے قیام کے نفاذ

کی بدولت اس تنظیم کو پروان چڑھنے میں بھرپور حصہ ڈالا مگر یہ کامیاب نہ ہو سکے اور آخر کار اس ناسور سے سری لنکا کی جان پاک فوج نے چھڑائی جس کے لیے وہ ہمیشہ سے پاکستان کے مشکور رہے ہیں۔

یوں تو خود کش حملوں کا تعلق ہر خطے کی تاریخ میں ملتا ہے اور اس کی کڑیاں زمانہ قبل از مسیح سے جوڑی جاتی ہیں مگر سری لنکا اور خانہ جنگوں اور خود کش کا حملوں کا تو جیسے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ ملک شروع سے ان حملوں سے دوچار رہا ہے جس کی وجہ سے امن نصیب نہ ہو سکا اور نہ ہی یہ ملک دیگر ممالک کی طرح ترقی کی راہوں کو ہموار بنا سکا۔ طویل تر جنگوں کے چند سال پہلے ہی اختتام کے باعث یہ ملک بھی اپنی حکومت اور معیشت کو مضبوط کرنے کے درپہ ہے۔ عامر بن علی رقم طراز ہیں:

**"چند سال پہلے ہی تیس سالہ خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا ہے جس کے بعد سری لنکا معاشی ترقی کرتا نظر آرہا ہے"** (۲۷)

سری لنکا جیسے خوبصورت جزیرے کی جڑوں میں بیٹھی اس کی معیشت اور حکومت کو کمزور کرنے والی چند دیگر تنظیموں کا ذکر بھی عامر بن علی نے اپنے اس مضمون میں کیا ہے مثلاً تامل ٹائیگرز کے علاوہ "فارس تنظیم" اور جنوبی ایشیاء کے ممالک کی تنظیم سارک وغیرہ۔ کسی بھی ملک و قوم کی ترقی کا راز وہاں کی سرکار کی مرہونِ منت ہوتا ہے۔ صدارتی امور میں جتنی صداقت اور ایمانداری کا مظاہرہ کیا جائے اتنا ہی ملک ترقی کرتا اور معیشت کو مضبوط کرتا جاتا ہے جیسا کہ گزشتہ سطور میں ذکر کیا ہے کہ یہاں کی معیشت اور سرکار کی کمزوری کی اصل وجہ خانہ جنگی ہے۔ ریاست کا سرکاری نام تو سوشلسٹ جمہوریہ سری لنکا ہے مگر سوشلزم دیگر ممالک کی طرح مقبول اور آزاد نہیں رہی۔ یہاں بھی شمالی کوریا اور کیوبا کی طرح معیشت پر حکومت کی اجارہ داری نہیں بلکہ تنظیموں نے ہر چیز کو مسخ کر رکھا تھا۔ یہاں کی اکثریت سنہالی نسل سے تعلق رکھتی تھی جو عموماً بدھ مت کے پیروکار تھے۔ حکومتی ایوانوں میں بھی انہوں نے ڈیرہ ڈالے رکھا اور اس ملک کو کھوکھلا کرتے رہے۔ سنہالی کے بعد تامل زبان سے تعلق رکھنے والے آباد رہے جنہوں نے اس ملک کے امن وسکون کو برباد کیا اور انہی کی بدولت یہ ملک ترقی نہ کر سکا۔ یوں تو سرکاری جمہوریت نظام پر ہو تو زیادہ مقبول اور آزاد طرز پر ملک فروغ دیتے ہیں مگر یہاں نظام اور صورتحال مختلف رہی جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ سری لنکا میں بھی صدارتی نظام حکومت تھا جس کا دورانیہ پانچ سال کے عرصے پر محیط تھا اور زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ ہی اس عہدہ کا حامل ہو سکتا ہے۔ یہاں کی صدارت کو خانہ جنگیوں کا زیادہ سامنا کرنا پڑا اس لیے جنگ کا فاتح سیاست میں ناکام رہتا اور سیاست سے منسلک رہنے والا اقتدار کی ہوس سے دوچار۔ اور یہی ایشیائی ممالک کے صدارتی نظام کا سب سے بڑا المیہ ہے جو ہمیں اکثر درپیش رہا ہے۔

نظام کو غیر مستحکم ہونے کی بدولت عامر بن علی سری لنکا کو پاکستان کے ساتھ مماثل قرار دیا ہے کہ دونوں ممالک اندرونی دہشت گردی کا شکار رہے ہیں۔ اقتدار کی ہوس نے جیسا ہمارے دیش کو ترقی کی منازل سے دور رکھا اسی طرح سری

لنکا کے حالات کمزور کرنے میں انہوں نے کسر نہ چھوڑی۔ زیر بحث مضمون میں مصنف نے ایک مقبول ترین سانحہ کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق امریکا سے ہے۔ فارس تنظیم کی ایک خاتون گفتگو کے دوران ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء، نیویارک کے واقعہ کا ذکر آیا۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو آج زبان زد عام ہے اس کا ذکر انسانی حقوق کی پاسداری کی بدولت خاصا ضروری ہے کہ کس طرح انسانی حقوق کے علمبردار قوم نے انسانی حقوق کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

علاوہ ازیں اس میں ایک حوالہ بڑا تاریخی ہے کہ سری لنکا کو ایشیاء بھر میں اس اعزاز سے بھی نوازا جاتا ہے کہ وہ پہلا ملک ہے جہاں کوئی خاتون حکمران بنی تھی۔ چونکہ یہاں کی آبادی دوسرے ممالک کی نسبت بہت کم تھی اور ترقی کرنا آسان تھا مگر افسوس یہ ممکن نہ ہو سکا۔ دوسرا یہ کہ یہاں کی تعمیرات کا ذکر مصنف نے ایک خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جس کی بدولت یہ ملک سیاحت کا ایک مقام ضرور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ملک کو ریڈیو سیلون اور سیلون چائے کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔ سری لنکا کی چائے زر مبادلہ کا اہم ذریعہ ہے۔ ملک کا نام تبدیل ہونے کے باوجود بھی چائے کا نام سیلون استعمال کیا جاتا ہے۔ عامر بن علی نے اپنے مضمون میں ملک کے سیاسی حالات، تاریخ اور مذاہب کا بھرپور تعارف پیش کیا ہے۔

سری لنکا کے بعد سفر نامہ نگار قطر، ارجنٹائن اور پیرو کا سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں۔ اگر دنیا کے نقشے کو دیکھیں تو مملکت قطر سعودی عرب کے ساتھ ایسے جڑی ہوئی نظر آتی ہے جیسے ہتھیلی کے ساتھ انگوٹھا، یعنی انگوٹھا ہاتھ کا مددگار اور اس کی مدد کرتا ہے۔ یوں مملکت قطر ارض مقدس ہی ہے۔ اس کے حدود اربعہ کے مطابق اس کے مشرق میں بحیرہ عرب اور مغرب میں بحیرہ عرب اور سعودی عرب، اس کا جنوب مغربی حصہ سعودی عرب کے ساتھ جڑا ہوا ہے اس کے شمال میں بحیرہ عرب یعنی خلیج فارس، جنوب میں بھی خلیج فارس یا خلیج عرب ہے۔ یوں ایک مکمل جزیرہ نما ہے یعنی اس کے ایک طرف خشکی اور تین اطراف سمندر ہے۔ رقبے کے لحاظ سے قطر ۱۱۴۳۷ کلومیٹر ہے۔ قطر کی شکل بیضوی ہے مطلب دونوں سروں سے تنگ اور درمیان میں قدرے چوڑا۔ اس ملک کا دارالحکومت دوحہ ہے جو تمام تجارتی، معاشرتی اور صنعتی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ قطر کی کل آبادی ۶۲ لاکھ ہے اور یہاں اکثریت مسلمان ہیں یہاں کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔

عامر بن علی مجلس فروغ اردو اور ان سے منسلک شائقین فن دوحہ کی دعوت پر قطر کا دورہ کرتے ہیں اور اس ملک کی جھلک دکھاتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کے مطابق ڈیڑھ ہزار سال کی اسلامی تاریخ کے دوران تشکیل پانے والے تمام فنون کا خلاصہ ایک چھت کے نیچے یعنی قطر میں واقع اسلامی آرٹ میوزیم میں دیکھا جا سکتا ہے یہ ایک عظیم شاہکار ہے جس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی ہے۔ قطر کے شاہی خاندان کو آرٹ کے شعبے سے لگاؤ ہونے کی وجہ سے یہاں کی عمارت دیکھ کر فنکارانہ ماحول پیدا ہوتا ہے۔ قطر کی کل آبادی ۲۶ لاکھ میں صرف ۱۳ ہزار لوگ اس ملک کی شہریت کے حامل افراد ہیں اتنی کم آبادی کے باوجود بھی یہ ملک دوحہ عالمی معیار کا بڑا اور اہم شہر بن چکا ہے۔ یہ ملک قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ قطر میں

دنیا کے گیس اور تیل کے تیسرے بڑے ذخائر موجود ہیں اسی وجہ سے مشرق وسطی امریکا نے سب سے بڑا بحری اڈا قائم کیا ہے۔ یہ ملک اقتصادی اور معاشی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ برسوں پہلے بھی اس ملک کو امیر ترین ملک ہونے کا اعزاز ملا ہے۔ قطر میں کسی قسم کا کوئی ٹیکس نہیں اور تعلیم بالکل مفت دی جاتی ہے۔ شہریوں کو صحت کی تمام سہولیات مفت دی جاتی ہیں۔ اس ملک کی کرنسی ریال ہے جو پاکستانی تیس روپے کے برابر ہے۔

مصنف قطر کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ پہلے بدو قبائل یہاں حکمرانی کرتے تھے پھر بعد میں سلطنت عثمانیہ اور پرتگال کے قبضہ میں رہا۔ ۱۷۷۷ء میں یہ ملک ایران کے قبضہ میں چلا گیا۔ پھر بحرین اور قطر کی طویل جنگ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے برطانیہ نے اس ملک پر قبضہ کر لیا جو ۱۹۷۱ء تک رہا۔ عہد کے بدلنے کی وجہ سے ملک کی سرکاری زبانیں بھی بدلتی رہیں۔ انیسوں صدی میں شاہی خاندان نے اقتدار حاصل کیا تھا لیکن ان سے انگریز کے تعلقات بہت خوشگوار رہے ہیں جس کی وجہ سے مشرقی وسطی کا سب سے موثر انگریزی و عربی چینل الجزیرہ قطر میں قائم ہوا تھا۔ نشریاتی اداروں کی طرح یہاں کے ٹی وی کا ماحول بھی بہت آزادانہ اور خود مختارانہ ہے۔

عامر بن علی قطر کی جھلک دکھانے کے بعد ارجنٹائن کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ارجنٹائن دنیا کا آٹھواں بڑا ملک ہے اور جنوبی امریکا کا دوسرا بڑا ملک ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا رقبہ ۲۷۸۰۴۰۰ معبر کلو میٹر ہے۔ اس ملک کا سرکاری نام جمہوریہ ارجنٹائن ہے۔ ارجنٹائن ہسپانوی بولنے والے ملکوں میں سب سے بڑا ہے۔ ارجنٹائن کا دارالحکومت بیونس آئرس ہے اور اس ملک کا سب سے بڑا شہر بھی ہے۔ ۲۰۲۲ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی ۴۷۳۲۷۴۰۷ ہے۔ اس ملک کی کرنسی پیسیو ہے اور سرکاری زبان ہسپانوی ہے۔ سفر نامہ نگار جب ارجنٹائن کا دورہ کرتے ہیں تو بتاتے ہیں یہ سرزمین خوابوں جیسی حسین ہے صرف رقبہ کے لحاظ سے یہ دنیا کا آٹھواں بڑا ملک نہیں ہے بلکہ حسن اور ثقافت کی وجہ سے ہی دنیا کا آٹھواں براعجوبہ ہے۔ لاطینی امریکا کے رہنے والے لوگ بہت زیادہ جذباتی اور جذبات کے اظہار میں دلیر ہیں۔ یہ لوگ فن کے دلدار ہیں اور فن سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے سفر نامہ نگار اس بات کا انکشاف کرتے ہیں:

> **"ارجنٹائن پہنچ کر پہلی خوشگوار حیرت اس وقت ہوئی جب ہوٹل کے استقبالیہ پر کھڑے نوجوان لڑکے نے میرا پاسپورٹ دیکھتے ہی کہا کہ آپ کی میشا شفیع مجھے بے حد پسند ہے، کیا خوبصورت آواز میں گاتی ہے۔ حیرت کا پہلو یہ ہے کہ اس نوجوان کو سوائے ہسپانوی کے کوئی اور زبان نہیں آتی، اردو تو بالکل بھی نہیں آتی مگر موسیقی ایک عالمی زبان ہے، بول سمجھ میں نہ آسکیں پھر بھی آپ لطف اندوز ہو سکتے ہیں"** (۸۲)

سفر نامہ نگار کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ تھیٹرز کی تعداد اس ملک میں ہے جو ہر وقت لوگوں کے رش سے بھرے رہتے ہیں اور تھیٹر کے ذوق و شوق کی وجہ سے اس ملک کی ٹکٹ پاکستان کی ٹکٹ کے لحاظ سے بہت مہنگی ہے۔ انہوں

نے اپنے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو بہت سنبھال کر رکھا ہے۔ دن بھر شہر میں کسی نہ کسی چوک چوراہے میں "تانگو" رقص ہوتا رہتا ہے جیسے پاکستان میں مداری اور مجمع باز تماشہ دکھا کر دکھا کر مجمع اکٹھا کر کے آخر میں کوئی دوائی بیچتے ہیں بالکل اسی طرح یہاں لڑکے اور لڑکیاں مجمع اکٹھا کر کے "تانگو" رقص پیش کرنے کے بعد اپنی موسیقی کی بنائی ہوئی سی ڈی بہت کم قیمت میں فروخت کرتے ہیں۔

یہاں کے لوگوں کی مرغوب غذا گوشت ہے۔ یہاں کے دستر خوان کا بھنا ہوا گوشت لازمی جزو ہے۔ ان لوگوں کے صحت مند ہونے کی وجہ ان کی غذا اور کھیلوں سے رغبت ہے۔ یہاں ہر کھیل اعلیٰ معیار کا کھیلا جاتا ہے لیکن فٹ بال کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔ یہاں کے اسٹیڈیمز میں فٹ بال کی پوری تاریخ محفوظ ہے۔ ارجنٹائن کی سرزمین سے تین مقبول شخصیات کا تعلق ہے جو کہ معروف فٹ بالر میراڈونا، پاپائے روم فرانس، بائیں بازو کے انقلابی گوریلا چے گویرا ہیں۔ اگر مذہبی لحاظ سے دیکھا جائے تو کیتھولک دنیا میں سب سے زیادہ لاطینی امریکا میں پایا جاتا ہے۔ ایونجلیکل عیسائی کا تناسب ارجنٹائن میں ۹ فیصد ہے اور اس ملک میں ۱۱ فیصد لوگ لادین ہیں۔ اس ملک میں مسلمانوں اور یہودیوں کی تعداد برابر ہے۔ ارجنٹائن کا موسم پاکستان سے بالکل متضاد ہے یعنی جون سخت سردی اور دسمبر گرمی کا مہینہ ہے۔ سفر نامہ نگار نے ارجنٹائن کا مختصراً جائزہ لیا ہے اور اس کے اقدار زندگی، مذاہب، کھانوں اور تہذیب و ثقافت کا ذکر کیا ہے۔ ارجنٹائن کے سفر کے بعد عامر بن علی پیرو کے شہر تکنا کے شب و روز کے حوالے سے تذکرہ کرتے ہیں۔ پیرو کی کل آبادی تین کروڑ ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے ۴۹۶۲۲۴ مربع میل ہے اور ساحل ۱۵۰۰ میل ہے اس کے سرحدی ممالک بولیویا، برازیل، چلی، کولمبیا اور ایکواڈور ہیں۔ اس ملک کا دارالحکومت سیما ہے۔ لاطینی امریکا کا سب سے زیادہ آبادی والا پانچواں ملک ہے۔ یہ ملک قدیم تاریخ، متعدد سرپرستی اور کثیر آبادی کے لے جانا جاتا ہے۔

سفر نامہ نگار اپنے مضمون میں پیرو کی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہیں دو صدیاں پہلے ہسپانوی سلطنت سے آزادی حاصل کرنے کے بعد جدید پیرو کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ یہ ملک انسانی تاریخ کے قدیم ترین تمدن "ان کا" دارالحکومت تھا۔ پورے جنوبی امریکا میں یہ سلطنت حکومت کرتی تھی۔ اس ملک کا سربراہ اس کے شہر "ماچو ہیچو" میں دربار لگاتا تھا۔ اس ملک کے قبائلی علاقے میں "آماڑہ" اور "کیچوا" مقبول زبانیں ہیں۔ اس ملک کی سرکاری زبان سپینش ہے۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیب "ان کا" ہے جو سات ہزار سال پرانی اور میسوپوٹیمیا بھی ہے۔

عامر بن علی "پیرو کا تکنا" میں جنوبی امریکا کے ملک چلی کی سرحد پر واقع شہر تکنا کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس چھوٹے شہر کی پاکستانیوں کے ساتھ بہت خاص نسبت ہے۔ ماضی میں اس شہر میں پاکستانیوں کی تعداد دو تین سو کے قریب تھی اور اس شہر میں رہنے والے پاکستانیوں کا زیادہ تر تعلق جاپان کی ری کنڈیشنڈ گاڑیوں سے تھا۔ یہ پاکستانی اس شہر کی معیشت میں اہم کردار ادا کرتے تھے اور ہر محفل کی رونق ہوا کرتے تھے۔ یہاں کے پاکستانیوں کے مالی حالات بہت بہتر تھے۔ آئے دن ایک

دوسرے گھر دعوت دی جاتی تھی جسے یہاں عام زبان میں ''فیتا'' کہا جاتا تھا۔ اس شہر میں رہنے والے پاکستانی مہنگے ترین مکانوں میں رہائش پذیر تھے اور مہنگی ترین گاڑیاں استعمال کرتے تھے۔ حکومت نے شہر سے دس کلومیٹر دور ایک ٹیکس فری زون ''سٹی کوس'' کے نام سے قائم کر رکھا تھا جو کہ پاکستانیوں کی وجہ سے آباد تھا۔ یہ پاکستانی کاروباری حضرات تھے۔ شہر میں دو پاکستانی ریستوران تھے جہاں دیسی کھانے بنانے میں مہارت رکھنے والی خواتین کام کرتی تھیں۔ دور دراز علاقوں میں اس بات کا چرچا تھا کہ مالی حالت بہتر کرنا ہے تو پاکستانی کھانا بنانا سیکھ لو، پاکستانی بہت سخی اور مالدار ہیں زندگی بہتر ہو جائے گی۔

پیرو کی حکومت نے جب پرانی جاپانی گاڑیوں کی برآمد پر پابندی عائد کر دی تو زیادہ تر پاکستانی یہ شہر چھوڑ کر چلے گئے اور ہزاروں کی تعداد میں سو بھی نہ رہے، سٹی کوس کی رونق ختم ہو گئی اور یہ شہر اجڑ گیا۔ سفر نامہ نگار نے اس شہر کی ویرانی کو محسن نقوی کے مصرعہ کی مثال سے بیان کیا ہے:

**ع؛ اس دشت میں اک شہر تھا، وہ کیا ہوا؟ آوارگی**

آگے چل کر مصنف ان کی پاکستانیوں سے محبت کے متعلق رقم طراز ہیں:

**''بہر حال مجھے کسی اجڑے شہر کا نوحہ تو نہیں کہنا، اس نگر کے خوبصورت اور محبت کرنے والے لوگوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا جو آج بھی رنگ، نسل، مذہب، زبان کے اختلاف کے باوجود ہم پاکستانیوں سے محبت کرتے ہیں''** (۹۲)

مصنف نے پیرو سماج، ثقافت، ملک کی خوبیوں اور خامیوں کو عمدگی سے نمایاں کیا ہے۔ پیرو کے بعد جنوبی امریکا کے ملک چلی کے چند رنگ پیش کرتے ہیں۔

جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو چلی جنوبی امریکا کے مغرب میں اینڈیز پہاڑی سلسلے اور بحرالکاہل کے درمیان ایک طویل، تنگ، ساحلی پٹی پر واقع ملک ہے۔ یہ دوسرا جنوبی امریکی ملک ہے جس کی حدود برازیل سے نہیں ملتی ہیں۔ چلی کے شمال میں پیرو، شمال مغرب میں بولیویا، دور جنوب میں ڈریک راستہ اور مشرق میں ارجنٹائن ہے۔ اس ملک کا بحرالکاہل کا ساحل ۶۴۳۵ کلو میٹر ہے۔ چلی کی ملکیت میں بحرالکاہل کے جزائر، جوآن فرنانڈیز، سلاس واگو میز، دی سون چیپر اڈیس اور ایسٹر جزائر ہیں۔ جغرافیہ کے لحاظ سے چلی شمال و جنوب کا سب سے لمبا ملک بنتا ہے اس ملک کا دارالحکومت اس کا سب سے بڑا شہر ''سانٹیاگو'' ہے اور اس ملک کی کرنسی پیسو ہے اور یہاں زیادہ بولی جانے والی زبان ہسپانوی ہے۔ کتاب کے مصنف اس سیاحتی مضمون ''چلی'' میں ملک چلی کے سماجی احوال بتاتے ہیں۔ چلی کے شہروں کی خوبصورتی، ان کا جانوروں کے ساتھ سلوک اور اس ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں، فٹ بال کا قدیم ترین ٹورنامنٹ اور سیاسی حوالے سے تبصرے کرتے ہیں۔ چلی کے نقشے کے حوالے سے عامر بن علی اپنی کتاب ''جہاں گردی'' میں منظر آرائی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

**''پہلی مرتبہ چلی کا نام سن کر کسی ملک سے زیادہ سالم مرچ اور سرد موسم کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ ثابت سرخ مرچ کی شکل کا نقشہ اور سرد براعظم انٹار کٹکا کے ڈیڑھ لاکھ مربع میل کے علاقے پر دعویداری کے سبب چلی کے بارے ان ابتدائی خیالات کا آنا بے بنیاد بھی نہیں ہے''(۳۰)**

اس ملک کا رقبہ اس کی آبادی کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ اس ملک کے تقریباً ہر شہر میں سمندر کا ساحل موجود ہے جو چلی کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتا ہے۔ سفر نامہ نگار اس ملک کے زلزلوں کا تذکرہ یوں کرتے ہیں کہ میرے دورے آغاز کے ساتھ ہی زلزلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلی بار زلزلہ سینتتیا گو کے ایئر پورٹ پر اترتے ساتھ ہی آ گیا دوسری بار زلزلہ شہر اقیقے پہنچا تو پھر آن لیا اور آخری خطرناک زلزلہ جس کا ۳.۸ درجہ تھا اور دومنٹ سے بھی زیادہ دورانیہ تھا اس زلزلے نے صحیح معنوں میں میرا ''تراہ'' نکال دیا۔

قدرتی وسائل کے لحاظ سے چلی کا شمالی علاقہ تانبے کے ذخائر سے مالا مال ہے جس کی وجہ سے یہ ملک تانبے کی برآمد میں عالمی سطح پر سرفہرست ہے۔ پاکستان میں بلوچستان کے اندر بھی چلی کی آنتا فگا کمپنی نے ریکوڈک کے منصوبے میں بہت سرمایہ کاری کی تھی مگر سابق چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ معیشت چلانے کے شوق کی وجہ سے سارا منصوبہ کالعدم قرار دیا۔ اس فیصلے کے سبب دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات کو شدید دھچکا لگا۔

اگر سیاسی لحاظ سے دیکھا جائے تو چلی دائیں بازو اور ترقی پسند خیالات میں بٹا ہوا ہے اور یہ تقسیم معاشرے میں بڑی واضح اور گہری ہے۔ یہاں کے لوگ ہر موضوع پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں لیکن سیاست کے حوالے سے یہاں اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ اپنی بیوی سے پوچھا جائے کہ ووٹ کس کو دینا ہے یا کس کے حق میں دینا ہے۔ اس پس منظر کو عامر بن علی اس طرح پیش کرتے ہیں:

**''کئی سال پہلے صدارتی الیکشن کے دن ہمارے دوست اعجاز گوندل نے پنجابی روایات کے مطابق اپنے فرانس میں مقیم مالک مکان سے پوچھا کہ ووٹ کس کو ڈالو گے؟ فرانسیسی نژاد مکان مالک سوال سن کر حیران رہ گیا۔ حیرت زدگی کے عالم میں کہنے لگا کہ یہ سوال تو میں اپنی بیوی سے بھی نہیں پوچھ سکتا ہوں''(۳۱)**

فرانس کی طرح چلی میں بھی عوام نے اپنے بل بوتے پر اپنی جدوجہد سے جمہوری نظام کو حاصل کیا ہے اور دو مرتبہ سوشلسٹ رہنما محترمہ باچیلت کے والد ائیر فورس کے کے بریگیڈیئر تھے اور کمیونسٹ صدر سالوادور آیند کے قریبی دوست تھے۔ جب امریکی فضائیہ اور CIA کی مدد سے اور اپنی فوج کے ذریعے جنرل آگستو پنوچے نے صدر آیندے کا تختہ الٹ دیا تو فوج نے صدر باچیلت کے والد کو حراست میں لیا تھا اور ان پر روزانہ تشدد کیا جاتا تھا بالآخر اسی حراست میں ان کا انتقال ہو گیا اور وجہ دل کا دورہ بتائی گئی مگر وقت پھر پلٹ کر آیا باچیلت مرحوم کی بیٹی صدر منتخب ہوتی ہے اور

سالوادور آئندے کی بھتیجی ازابیل آئندے حلف برداری سے پہلے ان کے گلے میں ہار ڈالتی ہیں جبکہ حکمران جنرل آگستو ہنوچے جنہوں نے صدر سالوادور آئندے کو دھوکہ دیا ان کا نام لینے والا کوئی نہیں ہے۔

چلی کی سرزمین کو ایک اور اعزاز حاصل ہے کہ یہ شاعروں اور ادیبوں کا وطن ہے۔ گبریلا مسترال جو کہ چلی میں پیدا ہوئیں۔ لاطینی امریکا میں ادب کا پہلا انعام بھی انہی کو دیا گیا۔ گبریلا مسترال ۱۸۸۴ء میں چلی میں پیدا ہوئیں ان کا اصل نام ''وسپاوی ماریا'' تھا لیکن انہوں نے اپنے دو پسندیدہ شاعروں کے نام ملا کر اپنا نام گبریلا مسترال رکھ لیا۔ انہیں بچپن سے ہی دکھوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جب والد کا انتقال ہوا تو ان کی عمر تین سال تھی۔ ان کے والد کے بعد ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کی بڑی بہن نے سنبھالی لیکن کچھ عرصہ بعد ہی وہ چل بسیں۔ گبریلا کی والدہ چونکہ بیمار رہتی تھیں اس لیے صرف پندرہ سال کی عمر میں ہی یہ گھر کی واحد کفیل بن گئیں۔ مالی حالت کی وجہ سے یہ اپنی تعلیم پوری نہ کر سکیں چونکہ ان کے والد اور بڑی بہن تدریس کے شعبے سے تعلق رکھتے تھے اسی وجہ سے کم تعلیم کے باوجود انہیں معلمہ کی نوکری مل گئی۔ اس نوکری کے سبب وہ شہروں شہروں ہجرت کرتی رہیں۔ گبریلا مسترال نے پندرہ سال کی عمر میں ہی کئی یادگار نظمیں لکھیں اور وہ نظمیں شائع ہو کر سند کی مقبولیت حاصل کر چکی تھیں لیکن انہیں شاعری کے میدان میں پہلی کامیابی ۱۹۱۴ء میں چلی کے قومی ادب ایوارڈ کی صورت میں ملی۔ یہ ان کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔

عالمی سطح پر گبریلا تب متعارف ہوئیں جب نیویارک سے ۱۹۲۲ء میں ان کا شعری مجموعہ ''تنہائی'' اشاعت پذیر ہوا۔ مسترال گبریلا نے میکسیکو میں بھی تعلیم کے شعبے میں خدمات سرانجام دی ہیں۔ اسی سلسلے میں امریکا اور یورپ کا بھی سفر کیا۔ ان کی ساری زندگی جلاوطنی میں گزر گئی۔ گبریلا جب اپنے چلی واپس لوٹیں تو انہیں اس ملک کی سب سے بڑی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا گیا۔ ان کو بچوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ یہ اپنی زیادہ کتابوں کی کمائی جنگ سے متاثرہ بچوں کے لیے عطیہ کر دیتی تھیں۔ ان کی شاعری میں ان بچوں سے محبت اور شفقت واضح دکھائی دیتی ہے۔ اس کی بہترین مثال نظم ''اس کا نام آج ہے'' ہے اس نظم میں ان کی محبت اور مادری شفقت جھلکتی ہے۔ یہ عظیم نوبل انعام یافتہ شاعرہ ۱۹۵۷ء میں وفات پا گئیں۔

عامر بن علی گبریلا مسترال کے متعلق یوں بیان کرتے ہیں:

> **''گبریلا مسترال آزادی اور تہذیب کا حصول تعلیم اور خدمت کے ذریعے ممکن سمجھتی تھی اس مقصد کے لیے اس نے شاعری کے ساتھ ساتھ زندگی بھر آزادی اور تہذیب کی ترقی کے لیے تعلیم دینے اور انسانی خدمت کرنے کو ایک روحانی فریضہ سمجھتے ہوئے انجام دیا''** (۳۲)

اس خوبصورت دیس سے تعلق رکھنے والا ایک اور عظیم شاعر پلو نرودا بھی تھے جن کے ذکر کے بغیر عالمی ادب کا تذکرہ نامکمل ہے اس خوش قسمت شاعر کے بارے میں کہاجاتا ہے کہ ان کو نوبل انعام ملنے کی وجہ سے ان کی عزت میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ نوبل انعام کی تکریم بڑھ گئی چونکہ نرودا نے اسے قبولیت بخشی۔ دنیا میں چلی کی مقبولیت ایک وجہ نرودا ہے۔

پابلو نرودا چلی کے چھوٹے سے قصبے پالال میں ۱۹۰۴ء کو پیدا ہوئے ان کا اصل نام ''ریکاردو نیفتالی باسو آلتو'' تھا۔ ان کو بچپن سے شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ ان کی پہلی نظم دس سال کی عمر میں شائع ہوئی جب ان کی پہلی کتاب شائع ہوئی تو ان کی عمر صرف انیس سال تھی۔ پابلو نرودا کے والد کو ان کی شاعری کرنا پسند نہیں تھا۔ ان کی والدہ ان کو دو ماہ کی عمر میں چھوڑ کر چل بسی اسی وجہ سے ان کے مستقبل کے بارے میں بہت زیادہ احساس تھے۔ اپنے والد کو چکما دینے کے لیے انہوں نے اپنا نام ''پابلو نرودا'' رکھ لیا۔ اس نام کی وجہ چیک ری پبلک سے تعلق رکھنے والے شاعر ''نرودا'' سے ان کی محبت اور عقیدت تھی جس کی وجہ سے انہوں نے اس شاعر کے نام سے اپنا نام رکھا جب ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''محبت کی بیس نظمیں'' شائع ہوا تب ان کی عمر بیس سال تھی۔ اس کتاب نے پوری دنیا سے داد و تحسین سمیٹی۔ اس قدر شہرت کے باوجود بھی ان کی معاشی حالت سنور نہ سکی۔

پابلو نرودا نے دفتر خارجہ میں روزگار کی خاطر نوکری اختیار کر لی۔ ذہین اور محنتی ہونے کی وجہ سے بہت کم وقت میں ہی چلی سمیت بہت سے ممالک میں بطور سفارتکار خود کو منوالیا تھا اور ساتھ ساتھ تخلیقی عمل بھی جاری رکھا۔ پابلو نرودا کو بے شمار عالمی اعزازات ملے ۱۹۵۰ء میں بین الاقوامی امن ایوارڈ، ۱۹۵۳ء میں لینن امن ایوارڈ اور سٹالن امن ایوارڈ اور ۱۹۷۱ء میں ادب کے نوبل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پابلو نرودا پر اطالوی زبان میں ایک ایوارڈ یافتہ فلم "Postinol" بھی بنائی گئی۔ ان کی مقبولیت اور عظمت کا اندازہ عامر بن علی کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> **''پابلو نرودا بیسویں صدی کا کسی بھی زبان میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ تحسین کہ یہ الفاظ میرے نہیں بلکہ نوبل انعام یافتہ صحافی اور ادیب گبریل گارسیا مارکیز کے ہیں، جن سے کسی بھی صاحب مطالعہ شخص کا اختلاف کرنا آسان نہیں ہے۔۔۔ اس خوش نوا شاعر کا ذکر تب تک جاری رہے گا جب تک یہ دنیا اور اس میں ادب باقی ہے''**(۳۳)

گبریلا مسترال اور پابلو نرودا میں ایک ذاتی نوعیت کا رشتہ استاد اور شاگرد کا بھی موجود تھا جب مسترال تدریس کے شعبے سے کچھ عرصے کے لیے وابستہ تھی تب نرودا اس سکول کا طالبعلم تھا۔ دونوں کے شاعری نظریات مختلف تھے۔ گبریلا مسترال کو سیاست سے دور رہنا پسند تھا جبکہ پابلو نرودا کو سیاست سے بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنی سیاسی کاوشوں سے

ثابت کیا کہ اہل قلم کا صرف یہ کام نہیں کہ ارد گرد کے حالات سے متاثر ہو کر ان کو قلمبند کرے بلکہ اس پر یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ارد گرد کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرے۔ ہسپانوی زبان کے سب سے بڑے شاعر اور دانشور پابلو نرودا کی وفات مشکوک حالات میں ہوئی۔ عوام کے مطابق انہیں قتل کیا گیا ہے لیکن حکومت کے مطابق ان کی موت کی وجہ دل کا جان لیوا دورہ لیکن حقیقت ابھی تک سامنے نہ آسکی۔

اپنی تصنیف میں عامر بن علی بتاتے ہیں کہ انقلابی شاعر پابلو نرودا کے تین مکان تھے۔ تینوں مکانوں کو سیاحتی مقام میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ان گھروں میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی جیسے نرودا گھر چھوڑ کر گئے بالکل وہی ترتیب رکھی گئی ہے۔ یہ سرکاری عمارتیں نہیں ہیں اس لیے ان رہائش گاہوں میں داخلے پر بھاری ٹکٹ ہے۔ ایک غیر سرکاری ادارہ جس کا نام پابلو نرودا ہے وہ ان رہائش گاہوں کی دیکھ بھال کرتا اور انتظام چلاتا ہے۔ جس طرح رومان اور انقلاب کے نامور شاعر فیض احمد فیض کے گھر کو سیاحتی مقام میں تبدیل کیا گیا بالکل اسی طرح نرودا کی رہائش گاہوں کو بھی سیاحتی مقام میں تبدیل کیا گیا ہے۔

پابلو نرودا کی وصیت کے مطابق ان کے گھر صحن میں ہی ان کو دفن کیا گیا اور بعد میں ان کی بیوی ملتدرے کی بھی ان کے ساتھ ہی تدفین کی گئی۔ ان کی رہائش گاہوں کے متعلق عامر بن علی رقم طراز ہیں:

> **''یوں تو تینوں مکانات قابل دید ہیں مگر ان سیاحوں میں سے زیادہ مقبول دارالخلافہ سینٹاگو شہر میں واقع مکان ہے میرا اس شہر سے جب بھی گزر ہوتا ہے، میں اس آستانے پر حاضری کے لیے ضرور جاتا ہوں ہر بار حسن و آرٹ کا کوئی نہ کوئی نیا رخ آشکار ہوتا ہے''** (۳۴)

سینٹاگو شہر میں واقع رہائش گاہ کا نام نرودے نے اپنی محبوبہ کے بالوں کی نسبت ''لا چسکونا'' رکھا تھا جس کا لفظی مطلب الجھے ہوئے بالوں والی یا زلف پریشان بھی کیا جاسکتا ہے۔

پابلو نرودا ایک ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے ان کا تخلیق کردہ ادب پرانی وضع، دقیانوسی خیالات، رویوں اور طریقوں کو رد کر کے نئے فائدے، اسلوب، اصول، طرز، رجحانات اور پرانے انداز کو ترتیب دیا ہے اسی وجہ سے پابلو نرودا نے نہ صرف ادب کی دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کیا بلکہ دنیا بھر میں جدید دور کی شاعری کو اعلیٰ مقام دلوانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

اس دیس کی سرزمین میں فطرت کی رنگارنگی اور تنوع کی وجہ سے ایسے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے ہیں جن کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ اسی خطے سے تعلق رکھنے والی ایک نامور مصنفہ ازابیل آیندے ہیں جو چلی کے سابق انقلابی صدر آیندے کی بھتیجی ہیں۔ یہ دنیا بھر سے ہسپانوی زبان میں پڑھی جانے والی ادیبہ اور مصنفہ ہیں۔ اب تک پچاس کے قریب ممالک کی فہرست میں ازابیل آیندے کی پانچ کروڑ سے زیادہ کتب شائع ہو کر فروخت ہو چکی ہیں اور بیس سے زائد ناول لکھ

چکی ہیں اور بھی کئی دیگر کتب بھی تحریر کی ہیں۔ ۲۰۱۴ء میں صدر باراک اوباما نے ازابیل آیندے کو تمغہ آزادی سے نوازا۔ ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ عہد حاضر کے ادبی منظر نامے پر نظر ڈالیں تو چلی کی دس مقبول ترین مصنفین میں سے آٹھویں خاتون ہیں۔

چلی جغرافیائی اور حیاتیاتی اعتبار سے انتہائی متنوع ملک ہے۔ سفر نامہ نگار کے استاد جو گورنمنٹ کالج لاہور میں قائم شعبہ نباتات سے وابستہ تھے۔ اُن کی ''خواہش مرگ'' تھی کہ وہ کسی طرح چلی پہنچ جائیں یہ صرف لفظی باتیں نہیں بلکہ سائنسی لحاظ سے بھی دنیا بھر میں ایسی متنوع زمین، آسمان اور حیات کم کم پائی جاتی ہے جیسی اس سرزمین میں ہے۔ اس خوبصورت علاقے کے لوگوں کا مزاج بھی متاثر کن ہے۔ ان کا جانوروں کے ساتھ سلوک اس قدر محبت اور شفقت بھرا ہے کہ کسی مسلمان ملک میں بھی دیکھا گیا۔ مصنف کتاب ایک دلچسپ واقعے کے ذریعے اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ شام ڈھلے ساحل کے کنارے جب چہل قدمی کر رہے تھے تو ایک عجیب اور دلچسپ منظر دیکھا ایک گلڑ یا نسل کے بڑے کتے نے چھوٹے کتے کی کمر کو دبوچ رکھا تھا ارد گرد لوگوں کا بہت رش تھا جو چھوٹے کتے کو گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کتے کے مالک کو کرسی منگوا کر اس پر بٹھایا گیا۔ بہت کوششوں کے باوجود جب کتے کو آزاد کروایا تو چھوٹا کتا زخمی ہو چکا تھا چھوٹے کتے کی حالت کو دیکھ کر خواتین کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور کتے کو ہسپتال لے جانے کے لیے ٹیکسی روکنے کی سوچ بچار جاری ہو گئی اتنی دیر میں ادھیڑ عمر خاتون چم چم کرتی نئی مرسڈیز کار سے اتری اور چھوٹے روسی کتے اور اس کے بوڑھے مالک جس کا لباس بالکل معمولی تھا ان کو گاڑی کی اگلی سیٹ پر بٹھا کر ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔ یہ بلاشبہ دردناک منظر تھا لیکن ایسا منظر جو کسی مسلمان ملک میں بھی نہ دیکھا گیا۔

چلی کی مقبولیت کا ایک سبب فٹ بال کا قدیم ترین ٹورنامنٹ بھی ہے۔ اس فٹ بال کے پہلے ٹورنامنٹ کی ابتداء ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی۔ دنیا میں سب سے زیادہ دیکھے جانے والے کھیل کے مقابلے میں سے یہ ٹورنامنٹ ایک ہے۔ چلی میں ایک مہینہ گفتگو کا ہر جگہ واحد موضوع فٹ بال ہی رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ اس ٹورنامنٹ کو لے کر اس قدر دیوانے ہوتے ہیں کہ اس ٹورنامنٹ کے دوران کام کرنا گناہ کبیرہ تو نہیں گناہ صغیرہ ضرور سمجھتے ہیں۔ ملک کے اہم چوک، اہم شہروں اور ریستوران میں بھی بڑی بڑی سکریںز نصب کی جاتی ہے جہاں شائقین کی بڑی تعداد ہاتھوں میں پلاسٹک کے ہر سائز کے باجے اور پرچم کو لیے جمع ہوتے ہیں اور دلچسپ منظر پیش کرتے ہیں۔ لاطینی امریکا کے ممالک میں سڑکوں اور گلی محلوں کے نام اہم تاریخ کے نام پر رکھے جانے کا رواج بہت مقبول ہے۔ مثال کے طور پر ۱۵اگست، ۱۱ستمبر، ۱۶نومبر، یکم جنوری، ۲۵دسمبر وغیرہ، یہ سب چلی کی سڑکوں کے نام ہیں۔

مصنف کتاب نے غیر مسلم ملک کے تمدنی، تہذیبی اور سیاسی اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس ملک کی سیاحت کی روداد بیان کرنے کے بعد میکسیکو کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس ملک کا رہن سہن، انداز زندگی اور چند رنگ پیش کیے ہیں۔ جغرافیائی لحاظ

سے دیکھا جائے تو میکسیکو شمالی امریکا کے جنوبی حصے میں واقع ایک ملک ہے۔اس کی سرحد شمال میں ریاست ہائے متحدہ سے ملتی ہیں اور بحرالکاہل کے جنوب اور مغرب میں، مشرق میں خلیج میکسیکو ہے اور جنوب مشرق میں بیلیز، کیریبین اور گوئٹے والا سمندر ہیں۔ میکسیکو کا کل رقبہ ۱۹۷۲۵۵۰ مربع کلو میٹر ہے اور اس لحاظ سے یہ دنیا کا تیرھواں بڑا ملک بنتا ہے۔اس ملک کی آبادی تقریباً ۱۳ کروڑ ہے اور یہ آبادی کے مطابق دنیا کا دسواں بڑا ملک ہے۔اس ملک کا دارالحکومت میکسیکو سٹی ہے۔ میکسیکو متنوع آب وہوا، بھرپور ثقافتی اور حیاتیاتی ورثہ اور جغرافیہ کے لحاظ سے اہم سیاحتی مقام ہے۔سیاحوں کی آمد کے سبب دنیا کا چھٹا سب سے زیادہ دیکھا جانے والا ملک ہے۔اس ملک کی مقامی کرنی ''پیسو'' ہے۔ تیرہ پیسو ایک ڈالر کے برابر ہیں۔ میکسیکو کی ۳۷ ریاستیں ہیں لیکن اس ملک کا دارالحکومت میکسیکو سٹی ان ریاستوں کا حصہ نہیں ہے۔

میکسیکو ایک ایسی وادی ہے جس کے چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ اور اس کے وسط میں ایک بہت بڑی جھیل ہے اور جھیل کے مرکز پر ایک بہت بڑے جزیرے پر ایک خوبصورت شہر آباد ہے جس کا نام میکسیکو سٹی ہے اور یہ اس ملک کا نہ صرف دارالحکومت ہے بلکہ اس کا ثقافتی، اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی مرکز بھی ہے۔ میکسیکو کی کل آبادی میں ۲۰ فیصد اس شہر میں بستے ہیں۔اس شہر کی بلند و بالا عمارتیں پیرس کا منظر پیش کرتی ہیں۔ میکسیکو سٹی قوس قزح سے مزین رنگوں کا شہر ہے۔ اس شہر کے ہر گھر اور عمارت نے مختلف رنگوں کا لباس پہن رکھا ہے۔ان عمارات کو ان کے مکینوں نے اپنی مرضی اور پسند کے رنگوں کو گھر کے باہر کیا ہے۔ کسی عمارت کا رنگ نیلا ہے تو کسی کے در و دیوار گلابی ہیں کسی مکین نے سرخ رنگ کیا ہے تو اس کے ہمسائے نے گہرا سبز رنگ پسند کیا ہے کوئی بھی ایسا رنگ نہیں جو اس شہر کی دیوار پر نہ دیکھا جاسکے۔ تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میکسیکو قوس قزح کے رنگوں میں ڈوبا ہوا شہر نظر آتا ہے۔ دنیا میں ایسا رنگین مزاج شہر کہیں اور نہیں دیکھا جاتا ہے۔

اسی طرح میکسیکو سے تعلق رکھنے والی نامور مصورہ اور شاعرہ فریدا کاہلو کا گھر جسے ''نیلا آستانہ' کہا جاتا ہے اس گھر کی در و دیوار گہرے نیلے رنگ کی ہے جس کی نسبت اس کا نام نیلا آستانہ رکھا گیا اس کے گھر کا۔۔۔ سرخ رنگ کا ہے۔ فریدا کاہلو ۱۹۰۷ء میں اسی گھر میں پیدا ہوئی ان کا اصل نام ''مگدالینا کارمین'' تھا، چھ سال کی عمر میں پولیو کا شکار ہونے کی وجہ سے ان کی ایک ٹانگ سکڑ گئی۔اٹھارہ سال کی عمر میں ٹریفک حادثے کی وجہ سے ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ دو سال جب یہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہی تو انہوں نے فن مصوری کی طرف توجہ دی۔ اسی دوران ان کی ملاقات ڈیگوراویرا سے ہوئی جنہوں نے ان کی ابتدائی تصاویر سے متاثر ہو کر کہا کہ وہ قدرتی مصورہ ہیں۔ڈیگوراویرا نے فریدا کاہلو کو کٹر کمیونسٹ اور عظیم مصورہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈیگوراویرا اور فریدہ کاہلو نے شادی کی اور سال ۱۹۳۹ء میں ان کی طلاق ہوئی اور اگلے سال ان دونوں نے دوبارہ شادی کرلی۔ ڈیگوراویرا نے ''نیلا آستانہ'' فریدہ کی موت کے بعد اس شرط پر حکومت کو عطیہ کر دیا کہ اس گھر میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے۔ بوٹینکل گارڈن میں ''فن، باغ اور زندگی'' کے عنوان سے نمائش لگائی جاتی ہے

اس نمائش میں فریدہ کاہلو کی پینٹنگز کو بہت زیادہ داموں میں فروخت کیا جاتا ہے۔اس پینٹنگ کے حوالے سے عامر بن علی بتاتے ہیں:

**''گزشتہ برس فریدہ کاہلو کی بنائی ہوئی ایک پینٹنگ ۶.۵ ملین ڈالر یعنی ۶۵ کروڑ میں فروخت ہوئی جو کہ لاطینی امریکا کے کسی بھی مصور کی اب تک فروخت ہونے والی سب سے مہنگی ترین تخلیق ہے''(۵۳)**

اس نامور فنکارہ کی اہمیت کا اندازہ اس چیز سے لگایا جاسکتا ہے کہ پانچ سو کی کرنسی کے ایک طرف فریدہ کاہلو کی تصویر بنی ہوئی ہے اور دوسری جانب ان کے شوہر ڈیگوراویرا کی تصویر بنائی گئی ہے۔روس کے نامور انقلابی رہنما اور سوویت یونین کی فوج کے پہلے سربراہ لیون ٹراسکی کو جب جلاوطن کیا گیا تو وہ دو سال کے لیے اسی نیلے آستانہ میں رہائش پذیر رہے اور دو سال بعد اسی نیلے آستانہ کے قریب ہی ذاتی مکان میں منتقل ہو گئے بالآخر اسی مکان کے اندر اسٹالن کے کارندوں نے انہیں قتل کر دیا اور نیلے آستانے کی طرح ٹراسکی کے مکان کو میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ان کی رہائش گاہ کو ''سرخ نشیمن'' کہتے ہیں۔اس گھر کے پانچ کنال رقبہ کے کونوں پر مورچے بنے ہوئے ہیں،اس گھر میں ٹراسکی نے بہت سی مرغیاں پال رکھی تھیں، گھر کے باغیچے میں خود ہی گوڈی کرتے اور خود ہی تراش خراش کرتے تھے۔ٹراسکی کا کہنا تھا کہ سچے مارکسسٹ کو جسمانی طور پر کام کرنے کا عادی ہونا چاہیے۔ان کی وصیت کے مطابق یہودی عقیدے کی بناء پر ان کی وفات ان کو جلا کر راکھ کو اس گھر کے آنگن میں دفنایا گیا ہے۔اس آنگن کے ایک طرف دو منزلہ لائبریری اور ڈرائنگ روم ہے جبکہ دوسری جانب رہائش گاہ کا حصہ ہے۔رہائش کے کمروں حتیٰ کہ بیت الخلاء کے دروازے لوہے کی چادر سے بنے ہوئے ہیں اور یہ دروازے جیل کے دروازے سے بھی زیادہ موٹے ہیں۔ان کے باورچی خانے میں کھانے کی میز پر ایسی ہی پلیٹیں چنی ہوئی ہیں جسے ٹراسکی کی زندگی میں رکھی جاتی تھی۔یہ گھر میوزیم جیسا نہیں بالکل آباد گھروں جیسا گھر لگتا ہے۔فریدا کاہلو اور ٹراسکی دونوں ہی کٹر کمیونسٹ سے منسلک تھے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

**''چند برس پہلے ٹراسکی کے گھر سے ایک سرنگ دریافت ہوئی ہے جو مشہور زمانہ مصورہ فریدا کاہلو کے گھر جاتی ہے فریدا کا گھر چند سو میٹر کے فاصلے پر ہے جسے ''نیلا آستانہ'' کہا جاتا ہے وہ ٹراسکی کی محبوبہ تھی اور ابتدائی دنوں میں میزبان بھی تھی''(۳۶)**

عامر بن علی یہاں بھی پاکستان اور میکسیکو کے مماثلتی عناصر پر بات کرتے ہیں۔میکسیکو کی ایک اور چیز قابل دید ہے وہ اس سٹی کے بازار جو بالکل پاکستان کے بازاروں جیسے ہیں۔ان بازاروں میں وہی پاکستانی دوکانوں کا سائز،ویسے ہی گاہکوں سے بھاؤ تاؤ کیا جاتا ہے۔ میکسیکن کے بازار بالکل لاہور انار کلی کے بازار سے مشابہت رکھتے ہیں۔اس شہر کی میٹرو بس بھی رنگ

اور سائز کے لحاظ سے بالکل لاہور کی موٹر بس کی فوٹو کاپی ہے۔ میکسیکو کے بازاروں کے بارے میں ''اختر ریاض الدین'' اپنی تصنیف ''دھنک پر قدم'' میں لکھتے ہیں:

> **''میکسیکو کا سب سے بڑا لطف اس کے بازار ہیں لیکن دور اندرون شہر کے بازار بالکل ہماری ہی ترتیب اور غیر محفوظ، غلیظ لیکن ہمارے بازاروں سے پھر بھی بہتر انسان، جانور سب ایک ہی سڑک پر چل رہے ہیں کوئی گدھا گاڑی پر منڈی سے سبزی لایا ہے کوئی خچر پر کمہار کا پورا کھیپ وہی ریڑھیوں پر برتن کھلونے۔۔۔ ہماری طرح ان کے بازاروں میں بھی وہی خوشبوئیں''**(۳۷)

اس خطے کے کھانے بالکل پاکستانی کھانوں کی طرح ہیں وہی مرچ مصالحہ دار اور خوشبو رکھتے ہیں۔ لاطینی امریکا کے باقی ممالک کی طرح میکسیکو کے لوگ رقص و موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ بازاروں میں کئی جگہ پر رقص و موسیقی کرتے محفلیں نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں عامر بن علی میکسیکو کی منظر کشی کرتے ہیں:

> **''دنیا کے دیگر ممالک میں بیٹھ کر آپ کو یہ باتیں عجیب اور شاید کہاسی لگے مگر لاطینی امریکا ایسا ہی ہے، محبت کے رنگ میں گوڑھا رنگا ہوا موسیقی میں ڈوبا، رقص میں مبتلا اور آرٹ کا دل دادہ''**(۳۸)

میکسیکو میں معاشی اور معاشرتی تفریق کی عکاسی ہوتی ہے یہاں کی طرز زندگی سے امیر اور غریب کا فرق واضح ہوتا ہے۔ مصنف کتاب نے اس ملک کے حالات و واقعات، سیاسی و سماجی زندگی اور تہذیب و ثقافت کے چند رنگ دکھائے ہیں۔

سفر نامہ نگار نے براعظم ایشیاء کے غیر مسلم ممالک کی سوسائٹی اور کلچر کی عمدہ تصویر پیش کی ہے۔ جب ایک سفر نامہ نگار کسی ملک کا سفر کم مدت کے لیے کرتا ہے تو اسے وقت کی کمی کے سبب اس ملک و قوم کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے مخصوص دریچے کھولنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ عامر بن علی بھی ان ممالک کی سیاحت کے دوران جن شہروں، علاقوں اور مقامات کی سیر کی، انہیں حتی الامکان بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن قلیل مدت قیام کی وجہ سے سرسری انداز میں بیان کیا ہے اور ان ممالک کی سماج اور ثقافت کے چند پہلو دکھائے ہیں۔

کتاب کا تیسرا حصہ رسمی سفر نامے سے بہت مختلف ہے جو انھیں روایتی سفر نامہ نگاروں سے منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ یہ حصہ ہم مختلف ذیلی عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں جو ہیئتی اعتبار سے اس سفر نامہ کو روایتی سفر ناموں سے مختلف کر دیتا ہے۔ یہ سفر نامہ یادداشتوں، شخصی خاکوں اور ادبی محافل کی خوبصورت یادگار بن جاتا ہے۔ تیسرے حصے کے عنوانات کچھ یوں تقسیم کیے جا سکتے ہیں:

الف۔ شخصی یادداشتیں

ب۔ ادبی کتب کی تقاریب رونمائی

ج۔ صحافتی نظریات اور میڈیا کی آزادی

د۔ متفرق موضوعات

سب سے پہلے سفر نامہ نگار احمد فراز کی شخصیت و فن پر تبصرہ پیش کرتے ہیں۔ احمد فراز کا شمار اردو شاعری کے اہم شعراء میں ہوتا ہے اپنی منفرد شاعری اور اسلوب کے باعث احمد فراز نے جو شہرت کی بلندیاں حاصل کیں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

پروین شاکر نے اپنے ایک مضمون ''محبتوں کا شاعر'' میں بجا طور پر لکھا تھا کہ :

**''فراز نے کوہاٹ میں پیدا ہو کر اردو ادب میں ڈومیسائل کے تصور کو نابود کر دیا''**(۹۳)

عامر بن علی احمد فراز کی شخصیت کے حوالے سے قلمبند کرتے ہیں :

**''احمد فراز سے دوستی کا دعویٰ تو مجھے ہر گز نہیں مگر ان سے نیاز مندی ضرور ہے، ان کی میزبانی کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔۔۔ فراز صاحب کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تو یہ تھا کہ وہ اپنی شاعری میں جس محبت اور وفا کا پرچار کرتے تھے وہ خود بھی اس کا عملی نمونہ تھے''**(۹۰)

میاں چنوں میں عالمی مشاعرے کے اہتمام میں سفر نامہ نگار کے ہاں پاکستان کے تمام بڑے شعراء تشریف لائے تھے، ان میں احمد فراز بھی شامل تھے۔ احمد فراز مشاعرہ باز شاعر نہیں تھے لیکن دوستوں سے ملاقات کے لیے مشاعروں پر ان کی دعوت پر چلے جاتے تھے۔ مصنف کتاب احمد فراز کے حوالے سے دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ فراز صاحب عطاء الحق قاسمی کے ساتھ ہی تشریف لائے تو قاسمی صاحب نے بیگ سے اپنے کپڑے نکال کر عامر بن علی کو دیے کہ انہیں مشاعرے میں پہننے کے لیے استری کروا کر لاؤ۔ فراز صاحب نے بھی بکس میں سے بنت انگور کی بوتل نکال اور عامر بن علی سے کہا کہ ایک گلاس اور برف لاؤ اور بعد میں قاسمی صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ ''آپ اپنا بیرون بدلیں، ہم اپنا اندرون بدلتے ہیں''

فراز صاحب سچے ترقی پسند شاعر تھے اور صرف نعرے بازی کی حد تک ہی نہیں بلکہ جمہوریت کے قیام اور فروغ کے لیے بڑی جدوجہد کی اور شدید صعوبتیں بھی اٹھائیں۔ ضیاء الحق کی آمریت میں کچھ عرصہ جیل میں بھی گزرا اور جلاوطنی میں بہت زیادہ عرصہ گزارا۔ فراز صاحب کے بچوں کے نام بھی ان کے نظریات کے آئینہ دار ہیں جو کہ سعدی، شبلی اور سرمد ہیں۔ احمد فراز وہ شخص ہیں جنہیں خالصتاً ان کی صلاحیتوں کی بنیاد پر ہلال امتیاز، ستارہ امتیاز، نگار ایوارڈ اور بے شمار قومی اور عالمی اعزازات سے نوازا گیا۔ بقول احمد فراز :

؎ اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا(۴۱)

احمد فراز کی طرح اسلم کولسری بھی ایک نامور سراپا محبت شاعر تھے۔ ان کی نہ صرف تحریریں لاجواب تھیں بلکہ شخصیت بھی باکمال تھی۔ اسلم کولسری جیسے لوگوں کو دیکھ کر آدمیت اور انسانیت کا معیار قائم کیا جاتا ہے۔ اسلم کولسری کی ساری زندگی اہل دنیا کو محبت کا سلیقہ اور جینے کا ممکنہ خوبصورت طریقہ سکھاتے گزر گئی۔ ان کی ساری زندگی سخت محنت، جدوجہد اور مشکلوں سے بھری ہوئی تھی لیکن ان کی مسکراہٹ دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان کو کوئی غم بھی ہو سکتا ہے، ان کی مسکراہٹ رسمی اور بناوٹی نہیں تھی بالکل اجلی اور اصل مسکراہٹ تھی۔

اسلم کولسری اگست ۱۹۴۶ء کو نواحی گاؤں کولسر میں پیدا ہوئے، ان کی اردو شاعری مجموعے میں ''نخل جہاں، کاش، ویرانہ اور پنچھی'' شامل ہیں اور پنجابی مجموعہ ہائے کلام میں ''نیند، عنبر، برسات، جیون اور کومل'' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے غیر ملکی زبانوں کی شاعری کے تراجم بھی کیے۔ اسلم کولسری نے ابتدائی زندگی میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ مزدوری بھی کی۔ کولسر سے لاہور آنے کے بعد اسلم کولسری روزنامہ مشرق سے وابستہ ہو گئے تھے اس کے بعد اردو سائنس بورڈ میں بھی خدمات انجام دیں اور اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد روزنامہ دینا جوائن کر لیا۔ اسلم کولسری کا یہ شعر عالمی سطح پر ان کی پہچان بنا:

؎ شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا(۴۲)

اسلم کولسری باکمال شخصیت کے بارے میں مصنف کتاب بتاتے ہیں:

> **''وفات سے چند روز قبل لاہور میں واقع ان کی رہائش گاہ پر تیمارداری کے لیے حاضری دی تو وہ چھڑی لے کر، بیٹے عمران اسلم کا کاندھا پکڑ کر، بڑی مشکل سے بستر سے اٹھ کر بیٹھک تک پہنچے، ان کی اجلی مسکراہٹ اور اس کی زندگی وتازگی پر جسمانی نقاہت کا ذرا بھی اثر نہیں تھا۔۔۔ واللہ چہرے سے نور برستا تھا جو ان کی عمر بھر کی نیکیوں کا ثمر تھا''**(۴۳)

اسلم کولسری جیسے بلند پایہ اور خوبصورت شاعر ہند، سندھ میں کم کم ہی پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے منکسر مزاج شاعر تھے کہ خود کو فقط شاعر کہتے ہوئے بھی شرماجاتے تھے۔ اسلم کولسری سمیت پوری دنیا بھر میں بے شمار فنکار اپنا تعارف اپنے فن کے حوالے سے کرواتے ہوئے شرماتے ہیں۔ سفر نامہ نگار اپنے مضمون ''فن اور فنکار'' میں اس بات کا انکشاف کرتے ہیں

کہ وہ بہت سارے ادیبوں کو بھی جانتے ہیں جو کہ بہت اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں لیکن انہوں نے اپنا کلام کبھی شائع نہیں کروایا۔

مصنف کتاب نے اس کی دو وجوہات بتائی ہیں، ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ فنکار اپنی شخصیت کو بڑا سمجھتا ہے اور فن کو چھوٹا یا پھر فنکار خود کو چھوٹا اور فن کو بڑا سمجھتا ہے لیکن جو فنکار بڑا اور پختہ ہوتا ہے وہ کبھی بھی اپنے فن کو ناپختہ اور کم درجہ نہیں سمجھتا ہے ہاں البتہ بعض اوقات ایسی صورت بھی سامنے آتی ہے کہ فنکار تو بڑے اچھے ہوتے ہیں مگر وہ ذاتی طور پر ارتقاء کے ابتدائی مراحل اور خود شناسائی کے عہد سے گزر رہے ہوتے ہیں اور ان مراحل سے گزر کر ایک کامیاب فنکار کے طور پر دنیا کے سامنے آتے ہیں۔ ایسی ہی ایک نامور شاعرہ، صحافی، ادیبہ اور فلم رائٹر رخسانہ نور جنہوں نے اٹھاون سال کی مختصر عمر میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔ رخسانہ نور سیالکوٹ ضلع کے علاقے پسرور میں پیدا ہوئیں مگر بعد میں ان کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے ابلاغیات کرنے کے بعد روزنامہ جنگ میں بطور فیچر رائٹر کام کیا۔ اُس وقت رخسانہ آرزو کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ ۱۹۸۴ء میں فلم ساز سید نور سے شادی کے بعد رخسانہ نور کہلائیں۔ رخسانہ نور کا شعری مجموعہ ''الہام'' کے نام سے شائع ہوا اور بہت سی سپر ہٹ فلموں کے سکرپٹ بھی لکھے جن میں لڑکی پنجابن، چوڑیاں، مجاجن، جھومر، دوپٹہ جل رہا ہے، سنگم، مہندی والے ہتھ، ناگ اور ناگن کے علاوہ بھی ایک لمبی فہرست ہے۔ رخسانہ نور کو بہترین فنی خدمات پر بہت سے ایوارڈز سے بھی نوازا گیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض بھی سرانجام دیئے ہیں۔

رخسانہ نور اس قدر شہرت کے باوجود اعلیٰ ظرف کی مالک تھیں۔ غرور اور تکبر ان کو چھو کر بھی نہ گزرا تھا۔ رخسانہ نور کی شخصیت کے حوالے سے مصنف کتاب لکھتے ہیں:

> **''فلمی دنیا کو عالمی طور پر تصنع، رنگ و روغن اور جھوٹ کی دنیا سمجھا جاتا ہے۔۔۔ مگر اتنی ساری ہٹ فلمیں کرنے کے باوجود رخسانہ نور پر تو فلمی دنیا کی ان قباحتوں کی پر چھائی تک نہ تھی تصنع اسے چھو کر بھی نہ گزرا تھا اور ایسی بے دریغ سچ بولنے والی شخصیات تو میں نے اپنی زندگی میں کم کم ہی دیکھی ہیں جیسی رخسانہ نور تھی''** (۴۴)

رخسانہ نور کی موت سے جو علمی و ادبی حلقوں میں خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی بھی پورا نہ ہو سکے گا لیکن ان کی خوبصورت شاعری اور تحریریں ہمارے ساتھ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ دنیا میں ایک شاعر، مصنف یا ادیب وغیرہ کو اصل مقام ان کی تحریروں کی وجہ سے ملتا ہے ایسی ہی دو تخلیقات کا تذکرہ مصنف اپنے مضمون ''دو کتابیں'' میں کرتے ہیں۔ کئی لحاظ سے منفرد اور بے مثال کے۔ اشرف کا سفر نامہ ''اسرائیل میں چند روز'' اردو قارئین کے لیے ایک منفرد تحفہ ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ کے۔ اشرف پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے اسرائیل کا سفر نامہ لکھا، کئی ناول، افسانہ نگاری اور

شاعری تو ان کی پہچان پہلے سے تھی لیکن سفر نامہ ''اسرائیل میں چند روز'' کی تصنیف کے بعد سفر نامہ میں بھی ان کا معتبر حوالہ بن گیا ہے اور دوسری کتاب اسد عباس اسد کی پانچ شعری مجموعوں پر مشتمل دیوان ''دشت وفا'' ہے۔اسد عباس اس سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور پیشہ کے اعتبار سے قانون دان ہیں لیکن ان کی شاعری سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ اصل میں تو سرتاپا شاعر ہیں باقی سب کچھ محض اتفاقات ہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ اتنی کم سنی میں ان کا کلیات شائع ہوا لیکن فن کو معیار و مقدار سے ماپا جاتا ہے ماہ و سال سے نہیں۔ ان کی شاعری کے مجموعے میں مختلف موضوعات پر مبنی شعر ہیں جس کے سبب ان کی شاعری میں قوس قزح کے سارے رنگ نظر آتے ہیں۔اسد عباس اسد کی شاعرانہ انداز دھنش کا یہ رنگ ملاحظہ ہو:

**پہلے میں قتل کیا جاؤں گا بے دردی سے**
**پھر میرے خون سے تحریر لکھی جائے گی**(۴۵)

اگر مغربی دنیا کی کتابوں کو دیکھا جائے تو حقیقی معنوں میں فرانسیسی ماہر معاشیات تھامس پیکیٹی کی تحریر کردہ کتاب ''اکیسویں صدی میں سرمایہ'' نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ یہ کتاب امریکا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا بنیادی موضوع آمدن اور دولت کی تقسیم ہے۔ مصنف کتاب اس کتاب کے بارے میں انکشاف کرتے ہیں:

> **''اس کتاب کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار پندرھویں صدی عیسوی کا ہندوستانی شاعر تلسی داس یاد آتا رہا، رامائن کو دور جدید سے ہم آہنگ سنسکرت زبان میں منتقل کرنے اور ہنومان چالسیہ تحریر کرنے کے سبب تلسی داس کو ہندو دھرم میں ایک مذہبی عقیدت بھی حاصل ہے''**(۴۶)

عامر بن علی ناصر ناکا گاوا اور ان کی تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بعض اوقات ایسے بھی ادیب اور مصنف ہوتے ہیں جو اپنی کتاب کی فروخت بڑھانے کے لیے بے جا بہتان طرازی کرتے پائے گئے ہیں لیکن کسی بھی مصنف کی پہچان ان کی باتوں سے نہیں بلکہ تحریروں سے ہوتی ہے۔ایسے ماحول میں سفر نامہ ''دنیا میری نظر میں'' تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ ناصر ناکا گاوا کے اس سفر نامے ''دنیا میری نظر میں'' میں شامل اکثر تحریریں اردو نیٹ جاپان کے پلیٹ فارم کے ذریعے بھی قارئین تک پہنچتی رہی ہیں۔ ناصر ناکا گاوا کا پہلا سفر نامہ ''دیس بنا پردیس'' ہے۔ یہ دونوں سفر ناموں میں ناصر ناکا گاوا نے سماج کا گہرائی میں مشاہدہ کیا ہے اور اسے عمدہ مہارت سے بیان کیا ہے۔ناصر ناکا گاوا کے سفر نامے کے بارے میں عامر بن علی رقم طراز ہیں:

> ''اردو ادب میں جہاں خود نمائی کے نقطہ نظر سے لکھے گئے سفر ناموں کی بھرمار ہے
> وہاں ''دنیا میری نظر میں'' ایک منارہ نور اور روشن مثال ہے کہ سفر نامے کو
> انسانیت کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر تحریر کیا جاسکتا ہے''(۴۷)

ناصر ناکاگاوا کا تعلق پاکستان سے ہے انہوں نے جاپان میں رہتے ہوئے ہمیشہ ہم وطن پاکستانیوں کی علمی اعتبار سے مدد کی ہے اور اپنی قائم کردہ ویب سائیٹ اردو نیٹ کے ذریعے جاپان میں مقیم پاکستانیوں کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر رہے ہیں۔ ناصر ناکاگاوا پاکستان کے لیے باعث فخر ہیں۔

پاکستان میں چند نمایاں نام ایسے ہیں جن کی ماہرانہ کارکردگی پر قوم کو فخر ہے۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے تین افراد جن کو اب تک نوبل انعام دیا گیا ہے۔ پہلا انعام ہر گوبند کھرانہ، دوسرا انعام ڈاکٹر عبدالسلام اور تیسرا انعام ملالہ یوسف زئی کو دیا گیا ہے لیکن ان تینوں افراد کو جب نوبل پرائز سے نوازا گیا تو یہ پاکستان چھوڑ کر بیرون ملک جا چکے تھے۔ سفر نامہ نگار اپنے مضمون میں خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ اب چوتھے اور پانچویں پاکستانی کو نوبل انعام سے نوازا جائے تو اسے ترک وطن نہ کرنا پڑے تاکہ پاکستان کو ان باصلاحیت افراد سے فائدہ پہنچ سکے۔ جاپان کی طرح پاکستان میں بھی نوبل انعام یافتہ افراد کو ایسا ماحول مہیا کرنا چاہیے جس میں وہ پر سکون زندگی گزار سکیں۔

اس سفر نامے کے آخر میں عامر بن علی میڈیا کے حوالے سے اپنی معلومات اور مشاہدات کو بیان کرتے ہوئے ایک صحافی کے طور پر سامنے آتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ایک پر سکون اور پرامن ماحول میں میڈیا اہم کردار ادا کرتا ہے کیونکہ پورے عالم میں اخبار میں چھپے ہوئے حرفوں اور ریڈیو، ٹی وی پر دیکھی سنی ہوئی باتوں کو لوگ معتبر مانتے ہیں اور ان پر یقین کر کے انہیں اپنا ہیرو سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات تو سادہ لوگ اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ ان کی نقالی کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اس لیے میڈیا کو مثبت کردار ادا کرنا چاہیے۔ مصنف کتاب نے پاکستانی میڈیا کی نئی خامی کی نشاندہی کی ہے کہ ہمارے نیوز چینلز اور ٹاک شوز کے دوران دانشور گفتگو کے آداب کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے ہیں۔ پاکستانی میڈیا آزاد ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی لحاظ سے پست بھی ہو چکا ہے۔۔ جہاں میڈیا کے آزاد ہونے کی وجہ سے بے شمار مثبت اثرات دیکھے جا سکتے ہیں وہاں منفی پہلو بھی ہیں۔ عامر بن علی اس کتاب میں شعبہ صحافت سے منسلک افراد کو تلقین کرتے ہیں کہ چوتھی جماعت میں اردو کا سبق ''گفتگو کے آداب'' کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس خامی پر قابو پایا جا سکے۔ ہمارے دین اسلام میں بھی اس چیز کو سخت ناپسند کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح بھارتی میڈیا برطانیہ کا سب سے اہم ادبی ایوارڈ ''بکر ز پرائز'' حاصل کرنے والی خاتون ارون دتی رائے کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ہندوستانی میڈیا ارون دتی رائے کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ انہیں ہندوستان میں کوئی چیز اچھی نظر نہیں آئی جس کے جواب میں ارون دتی رائے کہتی ہیں کہ بھارتی میڈیا اتنا معصوم ہے کہ اسے ستر ہزار بے قصور مارے جانے والے کشمیریوں کی قبریں نظر نہیں آتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

**''اس بار ارون دتی رائے پر ہونے والی تنقید کی وجہ کیرالا میں منعقد ہونے والی ایک تقریب میں اس کا خطاب ہے جس میں دیگر باتوں کے علاوہ اس نے کہا کہ گاندھی جی نے ذات پات کے نظام کو مضبوط کیا ہندوستان میں چھوت چھات کو فروغ دیا اور در حقیقت گاندھی عدم تشدد میں یقین نہیں رکھتے ہیں نیز ان کا عدم تشدد کا فلسفہ فقط ڈھونگ تھا''**(۴۸)

ان کے خطاب کے بعد بھارتی میڈیا نے ان پر تنقید کے نشتر چلے جو ایک منفی پہلو ہے میڈیا کو حق اور سچ کا ساتھ دینا چاہیے جس طرح ارون دتی رائے گاندھی جی کے رویے کو ڈھونگ قرار دے کر اس بیان کے حق میں بہت سارے تاریخی شواہد بھی موجود ہیں اسی طرح میڈیا کو تنقید کرتے وقت ہر پہلو سے جانچ پڑتال کرنا ضروری ہے۔

عامر بن علی کی کتاب کا حصہ سوم معلومات سے بھرپور ہے۔ایک مضمون ''بٹوے کا درد'' میں ایک موذی مرض کا انکشاف کرتے ہیں کہ یہ مرض پینٹ کی پچھلی جیب میں بٹوہ رکھ کر بیٹھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ایک مقبول عالمی سائنسی جریدے ''نیچر'' کے مطابق طویل عرصے تک پینٹ کی پچھلی جیب میں بٹوہ رکھنے سے کولہے اور کمر درد مستقل نکل سکتا ہے۔اس کا سائنسی نام ''پری فورمس سینڈروم'' اور یہ بیماری بٹوہ کی وجہ سے ہوتی ہے اس لیے اسے ''موٹے بٹوے کی بیماری'' کہتے ہیں۔اس بیماری سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے چاہیے اور بٹوہ پینٹ کی پچھلی جیب کی بجائے قمیض یا جیکٹ کورٹ وغیرہ میں رکھنا چاہیے۔

ایک مضمون ''دنیا کے ٹاپ ٹین بنک اور بینکاری کی ابتداء'' میں بتاتے ہیں کہ جدید بینکاری کی ابتداء اٹلی سے ہوئی تھی اور تاریخی اعتبار سے سلطنت روم سے یہودیوں نے کیا تھا کہ تاجر اپنا رومال بازار میں بیٹھے ہوئے یہودی کے پاس رکھوا کر جاتے اور بدلے میں اس سے رسید لے لیتے اور جس جگہ سودا بن جاتا اس جگہ یہودی کی جاری کردہ رسید تھما کر کہتے کہ یہودی سے جا کر سامان وصول کر لو۔آہستہ آہستہ تاجروں اور دیگر لوگوں کا یہودیوں پر اعتبار بڑھتا چلا گیا جس کے سبب روم شہر کے تاجروں کا سارا سامان شہر کے دروازوں پر چوبی بینچوں پر بیٹھے ہوئے یہودیوں کے پاس جمع رہتا اور ان کی جاری کردہ رسیدوں پر شہر میں لین دین شروع ہو گیا۔لاطینی اور اطالوی زبان میں بنچ کو ''بانکو'' کہتے ہیں اور ان بنچوں پر بیٹھے ہوئے یہودیوں کو بھی ''بانکو'' کہا جانے لگا اور انگریزی زبان میں جا کر بینک ہو گیا اور امریکی ادارے فوربز ۲۰۱۷ء کے مطابق دس بڑے بینکوں میں چار بڑے بینک چین سے تعلق رکھتے ہیں اور دو بینک امریکا اور دو بینک جاپان سے تعلق رکھتے ہیں ایک برطانیہ کا بینک بھی فہرست میں شامل ہے۔کچھ سال پہلے ٹاپ ٹین بینک کی فہرست میں چین کا کوئی بینک بھی شامل نہ تھا لیکن اب اس شعبے میں چین عالمی سطح پر لیڈر بن چکا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس باب میں عامر بن علی نے جاپان، سری لنکا، تھائی لینڈ، ارجنٹائن، پیرو، چلی، میکسیکو اور قطر کے سفری احوال کے ساتھ ساتھ شخصی خاکے بھی بیان کیے ہیں۔ یہ سفر نامہ قاری کے لیے معلومات کا بے بہا خزانہ ہے۔ ہمارے مصنف عامر بن علی نے اپنی اس کتاب میں اپنی صنف کے اصول و ضوابط کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ایک مکمل تحریر پیش کی ہے اور یہ کہنا بھی کچھ غلط نہ ہو گا کہ ان کی اس کتاب میں تجربوں، تبصروں اور مشاہدات میں جو گہرائی ملتی ہے اس بیان کی نظیر اردو ادب میں اس موضوع پر ملنا ناممکن ہے۔

## حوالہ جات


۱۔ عطاء الحق قاسمی، فلیپ، محبت چھو گئی دل کو از عامر بن علی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۰۹ء

۲۔ محمد کامران، ڈاکٹر، گ سے گڑیا ج سے جاپانی، لاہور: ماورا پبلشرز شرکت پرنٹنگ پریس، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۵

۳۔ عامر بن علی، جہاں گردی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، سال ۲۰۱۱ء، ص ۱۸

۴۔ ایضاً، ص ۲۴

۵۔ ایضاً، ص ۳۲ تا ۳۳

۶۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۳۳

۷۔ ناصر کاظمی، دیوان، لاہور: مکتبہ خیال ۱۹۸۱ء، ص ۳۹

۸۔ سید راس مسعود، روح جاپان، مطبوعہ دار الطبع سرکار عالی حیدر آباد دکن: ۱۳۴۵ء، ص ۱۸ تا ۱۹

۹۔ محمد کامران، ڈاکٹر، گ سے گڑیا ج سے جاپانی، ص ۸۶

۱۰۔ عامر بن علی، جہاں گردی،، ص ۲۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷

۱۲۔ آصف محمود جاہ، ڈاکٹر، چڑھتے سورج کے دیس میں (جاپان) لاہور: فنکشن ہاؤس، ۲۰۰۹ء، ص ۵۸

۱۳۔ عامر بن علی، جہاں گردی، ص ۴۸

۱۴۔ محمد کامران، ڈاکٹر، گ سے گڑیا ج سے جاپانی، ص ۱۲۹

۱۵۔ الطاف شیخ، گیشاؤں کے دیس میں، لاہور: جہانگیر بک ڈپو، س۔ن، ص ۸۸۔

۱۶۔ عامر بن علی، جہاں گردی، ص ۱۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۵۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۸

۲۰۔ سید راس مسعود، ایضاً، ص ۳۶

۲۱۔ الطاف شیخ، گیشاؤں کے دیس میں، ص ۶۶

۲۲۔ عامر بن علی، جہاں گردی،، ص ۴۷

۲۳۔ الطاف یوسف زئی، ڈاکٹر، تھائی لینڈ کے رنگ، فیصل آباد: مثال آباد پبلشرز، ۲۰۱۶ء، ص ۶۳

۲۴۔عامر بن علی، جہاں گردی، ص۹۵تا۹۶

۲۵۔ایضاً، ص۸۹

۲۶۔قمر علی عباسی، لنکا ڈھائے، کراچی: ویلکم بک پورٹ،۲۰۱۱ء، ص۱۲۳

۲۷۔عامر بن علی، جہاں گردی، ص۸۸

۲۸۔ایضاً، ص۱۰۳

۲۹۔ایضاً، ص۱۱۶

۳۰۔ایضاً، ص۱۱۷

۳۱۔ایضاً، ص۱۱۹

۳۲۔ایضاً، ص۱۶۵

۳۳۔ایضاً، ص۱۲۶

۳۴۔ایضاً، ص۱۲۷

۳۵۔ایضاً، ص۱۷۵

۳۶۔ایضاً، ص۱۷۳

۳۷۔اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، لاہور: نسیم بک ڈپو کچہری روڈ، ۱۹۷۴ء، ص۵۷

۳۸۔عامر بن علی، جہاں گردی، ص۱۲۰

۳۹۔پروین شاکر، محبتوں کا شاعر، ماہنامہ چہار سو، احمد فراز نمبر، راولپنڈی: جنوری فروری ۱۹۹۵ء، ص۶۲

۴۰۔عامر بن علی، جہاں گردی، ص۱۸۷

۴۱۔بہ حوالہ ایضاً، ص۱۹۰

۴۲۔ایضاً، ص۲۲۰

۴۳۔ایضاً، ص۱۹۹

۴۴۔ایضاً، ص۲۲۳

۴۵۔بہ حوالہ ایضاً، ص۲۱۹

۴۶۔ایضاً، ص۲۲۵

۴۷۔ایضاً، ص۱۹۴

۴۸۔ایضاً، ص۲۱۲

باب پنجم:

(الف) نگر نگر اِک نظر

(ب) مشرق کی طرف دیکھ

## (الف)

سیر و سیاحت انسان کا فطری ذوق ہے۔ کائنات میں موجود ہر شے سفر میں ہے اور یہی سفر ازل سے ابد تک جاری رہے گا۔ ہر انسان خالق کائنات کی ثنائی کے بہترین نمونے دیکھنے کے لیے دیہاتوں، شہروں، پہاڑوں، جنگلوں، دریاؤں، سمندروں، صحراؤں اور آبشاروں میں سر گرداں ہے۔ سفر کے ہی بدولت کائنات کے مخفی رازوں کا انکشاف ہوتا ہے اور انسان کی ترقی کا راز بھی سفر میں ہی مضمر ہے۔ انسان سفر کے ذریعے اپنے جذبہ تجسس کو تسکین پہنچاتا ہے۔

انسان کی طرح ادب بھی ایک با معنی تخلیق ہے جو انسانی نفس یا روح انسان کی ترجمانی اس انداز سے کرتا ہے کہ اس کے فضائل باطنی یا کمالات معنوی کا مکمل نقش کسی تحریر یا موضوع اظہار میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ غیر افسانوی ادب میں شامل ایک دلفریب ادبی تخلیق سفر نامہ ہے۔ انسان چونکہ مسافر ہے اور مسافر کے لیے دنیا عجائب خانہ ہے جسے دیکھنے کے لیے انسان ہر وقت متجسس اور کوشاں رہتا ہے اور سفر اختیار کرتا ہے۔ انسان کے سفر کی داستان، سفر نامہ ہے۔ ایک سیاح سفر نامے کے ذریعے ہی چشم دید واقعات اور مشاہدات کو قاری کے سامنے تحریری طور پر پیش کرتا ہے۔ سفر نامے کا بنیادی مقصد ہی اپنے تجربات و مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ ایک کامیاب سفر نامہ وہ ہوتا ہے جس میں افسانوی فضا، داستانوی رنگ، ناول کی چاشنی، ڈرامے کی سی منظر نگاری، جگ بیتی کی سی لذت اور آپ بیتی کا سا حسن پایا جائے۔ ایک کامیاب سفر نامہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ سچا سیاح ہو، سیاحت کا جذبہ اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہو اور سچا سیاح ہونے کے ساتھ ساتھ مظاہرِ فطرت اور مظاہرِ انسانی سے دلچسپی رکھتا ہو۔ اگر جدید سفر نامہ نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ان میں عامر بن علی کا نام بہت نمایاں ہے۔ عامر بن علی کا یہ خاصہ ہے کہ مختلف ممالک کی سیر کرتے ہیں اور وہاں کے مناظر کو صرف دیکھتے ہی نہیں بلکہ انہیں انتہائی پُرکشش انداز میں بیان بھی کرتے ہیں۔ عامر بن علی کے سفر نامے متنوع خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں ایک دستاویزی فلم کی طرح معلومات بھی موجود ہوتی ہیں۔ عامر بن علی اپنے سفر ناموں میں جغرافیائی اور تاریخی مقامات اور پتھر کی عمارتوں کے ساتھ ساتھ انسان کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں وہ اپنے سفر ناموں میں ظاہری رنگینیوں کو ہی کو بیان نہیں کرتے بلکہ حقیقت کا رنگ اُبھارنے کے لیے کرداروں کو شامل کرتے ہیں یوں وہ مناظرِ فطرت سے ہی نہیں بلکہ مظاہرِ انسانی کے اندر رچی ہوئی تجلی کو بھی بخوبی دیکھتے اور عمدگی، پختگی سے قلمبند کرتے ہیں۔ عامر بن علی کے سفر ناموں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے تمام سفر ناموں میں زبان کی سادگی کو مقدم رکھا ہے سلاست و روانی ہر جگہ برقرار ہے۔ اسد اللہ غالب عامر بن علی کے سفر نامہ ''نگر نگر اِک نظر'' میں مصنف کتاب کے بارے لکھتے ہیں:

''ثقہ ادیب اور معتبر صحافی ہونے کے سبب زبان وبیان پر انہیں دسترس ہے۔ مگر لکھنے کا انداز عام فہم اور سادہ ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو وہ اپنی بات سمجھا سکیں''(۱)

زیر تحقیق کتاب ''نگر نگر اک نظر'' ایک مختلف نوعیت کا سفر نامہ ہے۔ اس سفر نامے کو مختلف تحاریر کا گلدستہ بھی کہا جا سکتا ہے جس کے متفرق موضوعات سے قاری کے ذوق کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ عامر بن علی کا تیسرا سفر نامہ ہے جو ۲۰۲۱ء میں نستعلیق مطبوعات لاہور کے زیر اہتمام زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ یہ کتاب ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز اسد اللہ غالب کے دیباچے سے کیا گیا ہے جس کا عنوان ''محبتوں کے سفیر کا سفر نامہ'' جلی حروف میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد حصہ اول ''جہان تازہ'' کے عنوان پر مشتمل ہے جس میں اٹھائیس مضامین بیان کیے گئے ہیں جن کی ترتیب یوں ہے:

- ❖ تاراپاکا گاؤں
- ❖ احتجاج کے لاطینی طریقے
- ❖ نرودا کے دیس میں نیا سال
- ❖ لاتیرنا کا عرس
- ❖ ہمبر سٹون
- ❖ قطر کا صحرائی گلاب
- ❖ سوویت انقلاب کے سو سال
- ❖ ویسٹ انڈیز میں کیا دیکھا
- ❖ بس ڈرائیور کے تین بچے
- ❖ دوبئی کی ایک جھلک
- ❖ متحدہ عرب امارات کا پاکستان
- ❖ نیا امریکی صدر اور امن کی امیدیں
- ❖ صنفی برابری میں پاکستان کی حالت
- ❖ اس بلا سے نجات ممکن ہے
- ❖ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں
- ❖ بھارت کا اقتصادی مستقبل اور پاکستان

- نگران حکمرانوں کا امتحان
- اساں دل نوں مرشد جان لیا
- کروناوائرس کے عالمی پھیلاؤ کا آنکھوں دیکھا حال
- ابن عربی اور ارطغرل
- کرونا زدہ عید
- ملن کا موسم
- شہر سخن
- تعلیم کی اہمیت اور پاکستان
- میاں چنوں کا یادگار عالمی مشاعرہ
- مزاحمتی ادب اور تیز ہوا کا شہر
- ارژنگ کا ارتقاء
- سائیں، صاحب

عامر بن علی نے حصہ اول میں مختلف ممالک کی تہذیب و تمدن، اقدار و عادات اور عقائد و رسومات کا بیان کیا ہے جن کا تعلق ان کے معاشرتی شعور اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ اس حصے میں سیاسی موضوعات پر بھی تذکرہ کیا گیا ہے اور مذہبی موضوعات پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ کہیں مختلف ممالک کی تہذیب و ثقافت کا بیان ملتا ہے تو کہیں تعلیمی، علمی و ادبی حوالے سے بات کی گئی ہے۔ یہ حصہ مختلف ممالک کی سماجی و ثقافتی معلومات سے بھرپور ہے۔

''نگر نگر اک نظر'' کا حصہ دوم ''تراب آفتاب کا منظر'' کے عنوان پر مشتمل ہے اس حصہ میں چوبیس مضامین شامل ہیں جو درج ذیل ہیں:

- بازیچہ سنگ و تذکرہ جنگ
- خزاں کے رنگ
- شہزادی کی شادی
- موسم بدلا رت گدرائی
- ایٹمی بموں اور سونامی کے بچوں پر اثرات
- والدین بے خبر ہیں
- صحافی خود خبر نہ بنیں

- جاپانیوں کی دیانتداری
- بیک پیکر صحافی
- صدر ٹرمپ کا دورہ جاپان
- جاپان روس سرحدی تنازعہ
- حلال نیل پالش
- تاج پوشی
- اک نئے عہد کا آغاز
- عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے
- مائی بگ چیلنج
- ایٹمی بمباروں کی یادیں اور خطرات
- یادگار تقریب رونمائی
- سال نو اور جاپان
- جاپان کا اردو بازار
- ڈرون سے اخبارات کی تقسیم
- وزارتِ تنہائی
- چین مخالف اتحاد
- محنت کی عظمت

حصہ دوم میں عامر بن علی جاپانی قوم کی ترقی، نظم و ضبط اور ان کی ایمانداری کو بخوبی متعارف کرواتے ہیں اور اس حصہ میں جاپان کی ترقی کے پیچھے پوری قوم کی انفرادی توجہ، محنت اور وقت کی پابندی جیسی خوبیوں کا بیان نظر آتا ہے۔اس حصے میں روایتی جاپان کی موجودہ دور کی سماجی عکس کشی کی گئی ہے۔

تحقیق طلب کتاب ''نگر نگر اک نظر''کا حصہ سوم نو مضامین پر مشتمل ہے جس کا عنوان فیض احمد فیض کے شعری مصرعے ''جو بچا مقتل شہر میں'' سے کیا گیا ہے۔یہ الفاظ جلی حروف میں لکھے گئے ہیں۔مضامین کی ترتیب درج ذیل ہے:

منو بھائی، وہ مرد قلندر چھوڑ گیا

- مشکور حسین یاد کی یادیں
- میجر منصور کی شہادت

- مشتاق احمد یوسفی کا عہد
- پاش پاش ہو کے بکھرا ہوا وہ لہو
- منیر نیازی کا بذلہ سنجی
- مظہر بخاری۔ شمع محفل تھا وہ شخص
- احمد ندیم قاسمی۔ تجھ سا کہاں سے لائیں
- شیشوں کا مسیحار خصت ہوا

کتاب کے حصہ سوم میں ان لوگوں کی یادگاری فہرست شامل کی ہے جو لوگ بچھڑ گئے ہیں۔ دراصل یہ ایک دکھ کی کیفیت ہے مصنف کتاب مضامین قلمبند کر کے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ یہ ان کی یادوں کا خزانہ ہے جو ان تحریروں میں بکھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عامر بن علی جس خطے یا علاقے کا سفر کرتے ہیں وہاں کی بود و باش سے خصوصی لگاؤ رکھتے ہیں حالات و واقعات کا ذکر معلومات افزاء انداز اور بڑے مؤثر پیرائے میں کرتے ہیں۔ انہوں نے معاشرے کے بنیادی موضوعات کے ساتھ ساتھ عمومی موضوعات کا ذکر بھی اتنے پر کشش انداز میں کیا ہے کہ معاشرے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ایک حقیقی سیاح کی طرح عامر بن علی نے پر کیف ادبی لب و لہجے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ تاریخی، جغرافیائی، سیاسی و سماجی معلومات کا دامن تھامے ہوئے قارئین تک معلومات پہنچائی ہیں۔

ایک ادبی سیاح فطری طور پر کائنات کے حسن میں دلچسپی رکھتا ہے اور ادیب ہی کی بدولت موجودات کی اہمیت سے آگاہی مہیا ہوتی ہے۔ ایک مصنف جب سفر نامے کی صنف پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ اس سے پہلے کسی بھی علاقے کا سفر اختیار کرتا ہے۔ ادباء نے اندرون ملک کے ساتھ ساتھ بے شمار بیرون ممالک کا سفر بھی کیا اور دوران سیاحت پیش آنے والے حالات و واقعات کو موضوع بنایا جس سے قاری گھر بیٹھے بے شمار ممالک کی سیر بھی کر لیتا ہے اور وہاں کی بود و باش سے بھی واقف ہوتا رہتا ہے۔ دیگر ادباء کی طرح عامر بن علی نے بھی چلی، پیرو، قطر، دوبئی، جاپان اور پاکستان کا سفر کیا تو ان ممالک کی سیاحت کے دوران انہوں نے وہاں کی سیاست، تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور ان ممالک کے اہم واقعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ مصنف کتاب سفر کی حسین یادداشتوں کو نہایت شرح و بسیط کے ساتھ سفر نامے کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

زیر تحقیق کتاب ''نگر نگر اک نظر'' کا حصہ اول کا جائزہ لیں تو چند ایک ممالک کا مشترکہ بیان کیا ہے۔ پاکستان سمیت دوسرے ممالک کے مختلف موضوعات پر بات کی ہے۔ اس تصنیف میں تہذیبی و ثقافتی، تعلیمی، علمی و ادبی اور سیاسی موضوعات کو دلچسپ انداز میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ وبائی موسم کی روداد بھی رقم کی گئی ہے۔

ادب چونکہ اجتماعی انسانی زندگیوں کا ترجمان ہوتا ہے اسی لیے عامر بن علی اپنی ادبی تحریروں کے ذریعے جس ملک کی سیاحت کی داستان کو پیش کرتے ہیں تو وہاں کی تہذیب و ثقافت اور سماجی زندگی کا نقشہ بھی قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں تو وہ قاری ان دیکھی دنیا کو اپنے لیے اجنبی محسوس نہیں کرتا اور یوں نگر نگر کی تہذیب سے واقف ہو جاتا ہے۔اس حوالے سے مظفر علی سید یوں رائے دیتے ہیں:

**''اردو زبان کئی صدیوں سے ہماری اجتماعی زندگی کا آئینہ دار اور ہمارے تہذیبی کمال اور بے کمال کا مظہر رہی ہے۔آج بھی ہم اس آئینے میں اپنا چہرہ ملاحظہ کریں تو دھوکہ نہ دے گا''**(۲)

عامر بن علی اس تعریف پر پورا اترتے ہوئے اپنی تحریروں میں تہذیب و ثقافت کے اہم مظہر نظر آتے ہیں۔ مختلف ممالک کی سیاحت کے دوران مصنف کتاب وہاں کی تہذیب و کلچر کو مد نظر رکھتے ہیں اور پھر جب وہ سفر نامہ تحریر کرتے ہیں تو واضح طور پر وہاں کی تاریخ اور تہذیب کو بیان کرتے ہیں۔

مصنف چلی کے گاؤں تاراپا کے بارے میں ایک مضمون قلمبند کرتے ہیں کہ اس گاؤں میں تقریباً تین سو مکانات سے بھی کم ہوں گے اور چھوٹے گاؤں کی نسبت سے زیادہ ''تاراپا'' کہلاتا ہے۔یہ گاؤں ہسپانوی طرز کا شاہکار ہے کیونکہ یہ گاؤں سپین سے آئے مبلغین اور فاتحین نے بسایا تھا۔اسی وجہ سے قدم ہسپانونی طرز تعمیر یہاں بے حد نمایاں ہے۔اس گاؤں کے ذریعہ معاش کے دو طریقے ہیں ایک تو ہریالی کے سبب یہاں کچھ لوگ مویشی پال لیتے ہیں اور پھر انہیں پروان چڑھا کر فروخت کر کے کچھ منافع کما لیتے ہیں اور دوسرا ذریعہ آمدن عیسائی بزرگ سان نورانسو کی درگاہ سے وابستہ چھوٹے بڑے ٹھیلے چھابے ڈھار ہیں جو حاضری کے لیے آنے والے زائرین کو بنیادی ضروری اشیاء اور سامان خورد و نوش فروخت کرتے ہیں۔اس گاؤں کی سالانہ مذہبی تقریبات یا برسی کے موقع پر چند دن کے لیے حالت بدل جاتی ہے۔لوگوں کی بہت سی تعداد اس مزار پر حاضری دینے کے لیے جمع ہوتے ہیں۔گاؤں کے مقامی لوگ اپنے گھروں کو کرائے کے لیے میلوں میں حاضری دینے والے معتقدین کو دیتے ہیں اور فائیو سٹار ہوٹل کے نرخوں پر قیمت وصول کرتے ہیں۔میلے کے دوران اس گاؤں میں جنگل میں منگل کا سماں ہوتا ہے، مذہبی مناجات کے ساتھ روحانی موسیقی اور رقص پیش کیا جاتا ہے۔گاؤں کے وسط میں گرجا گھر کے باہر سینٹ لورانسو کے عقیدت مند بہت سے لوگ چرچ میں اکٹھے ہوتے ہیں، زیادہ تر لوگ صحت یابی و شفا کے لیے حاضری بھرنے آتے ہیں اور لنگر میں مچھلی سے تیار کردہ ''بیچے'' دیا جاتا ہے جو پیرو کا قومی کھانا ہے۔اس گاؤں کی خوبصورتی کی وجہ یہاں کی طرز تعمیر اور آثار قدیمہ ہیں۔سفر نامہ نگار ''تاراپا گاؤں'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

**''تاراپا گاؤں میں داخل ہوتے ہی آثار قدیمہ نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔نیم منہدم مکان، سرائے، کہنہ بازار، مگر خوبصورتی یہ ہے کہ اس سارے منظر کا رنگ،**

**ڈھنگ بالکل ہسپانوی ہے، لگتا ہے میڈرڈ یا قرطبہ کے کسی نواحی گاؤں میں آ نکلے ہیں''**(۳)

عامر بن علی اس گاؤں کی خوبصورتی کا ایک پہلو یہ بھی بتاتے ہیں کہ عمارتوں کے محراب اور گھروں کے برآمدوں میں بھی لکڑی کے محراب بنائے گئے ہیں۔ ان عمارتوں کا نقشہ اسی طرح کا ہے جو اسلامی آرٹ اور فن تعمیر کا حصہ ہے۔ سالانہ تقریبات میں اس چھوٹے سے گاؤں میں بہت رونق اور گہما گہمی ہوتی ہے اور بہت خوبصورت منظر پیش کرتا ہے، اسی طرح جنگل میں منگل کا سماں ''لاتیرانا کا عرس'' پیش کرتا ہے۔ اس عرس میں زائرین میں بہت زیادہ تعداد جوانوں کی ہوتی ہے، ماحول انتہائی جذباتی ہوتا ہے، زیادہ تعداد حاضرین میں لڑکے اور لڑکیاں رو رو کر عبادات اور مناجات میں مشغول ہوتے ہیں اس جگہ کا نام ''لاتیرانا'' ہے اور وہ ہستی ''لاتیرانا'' جو دنیا کی قدیم تہذیب ''ان کا'' سے تعلق رکھنے والی شہزادی تھی جہاں لاتیرانا نے محبت میں جان دی تھی یہ معبد اسی جگہ قائم ہے جہاں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور بڑے جذباتی انداز میں نم آنکھوں سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں۔ لاتیرانا کے میلے پر ہر عمر کے افراد اپنی مراد پوری ہونے کی آرزو لے کر تمام دن گلیوں میں طبل و علم لے کر رقص کرتے ہیں اور اس طریقہ کو بڑی تکریم حاصل ہے۔ ہزاروں لوگ ٹولیوں کی شکل میں رنگ برنگے لباس پہن کر موسیقی کی دھنوں پر رقص کرتے ہوئے شہر بھر چکے لگاتے ہیں۔ یہ تاریخی معبد جہاں لاتیرانا نے جان دی تھی مقامی ثقافت اور کیتھولک روایات کی باہمی آمیزش کا عمدہ نمونہ ہے۔ لاتیرانا جنگجو شہزادی کو ویٹی کن سٹی میں ''خدا کی ولی'' مانا جاتا ہے۔

سفر نامہ نگار قاری کو یہ معلومات دیتے ہیں کہ اس معبد سے ستر کلومیٹر ساحل سمندر پر واقع شہر اقیقی ہے جہاں مقیم پاکستانیوں کی تعداد تقریباً ۲۰۰ ہے جو کاروبار سے منسلک ہے کیونکہ یہ شہر فری زون ہے انہی پاکستانی مسلمانوں نے اس شہر میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی، اس مسجد کا نام ''مسجد بلالؓ'' رکھا گیا۔ مسجد کے تھوڑے ہی فاصلے پر مسلمانوں کا قبرستان بھی موجود ہے جہاں ایسی خاتون کو بھی اس کی وصیت کے بعد مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا گیا جو مطالعہ کے بعد عیسائیت سے مسلمان ہوئی۔ مصنف کتاب بتاتے ہیں کہ جب اس علاقے میں جاتے ہیں تو اس قبرستان ضرور جاتے ہیں کیونکہ ان کے دوست اس قبرستان میں دفن ہیں۔

سفر نامہ نگار کاتیرانا کے بعد قطر کا اسلامی آرٹ، میوزیم کے بارے میں آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ قطر کا عجائب گھر کی پانچ منزلہ بے ستون عمارت بذات خود فن تعمیر کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اس عجائب گھر کا بڑا کارنامہ ڈیڑھ ہزار سال ارتقا پذیر ہونے والا اسلامی آرٹ کو ایک چھت کے نیچے جمع کر لینا ہے۔ یہ پانچ منزلہ عمارت کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح قطر کا ایک اور شاہکار نیا نیشنل میوزیم ہے۔ اس عجائب گھر کے خالق شاہی متصل سے فرانس سے تعلق رکھنے والے عہد ساز ماہر تعمیر جین نوبل ہیں۔ عجائب گھر کا نام ''زہراۃ الصحرا'' رکھا گیا جس کا مطلب صحرا کا گلاب۔ اس پچپن ہزار مربع فٹ

رقبے پر پھیلے میوزیم کی عمارت دس سال میں مکمل کی گئی۔اس میوزیم کی عمارت کے ساتھ ساتھ مصنوعی جھیل اور پارک بھی بنوایا گیا ہے۔سفر نامہ نگار ''زہراۃ الصحرا'' کے متعلق لکھتے ہیں:

**''دوحہ شہر میں جب اس عمارت کے سامنے پہنچا تو سمجھ میں آیا کہ اس کا نام خالق نے "Desert Rose" کیوں رکھا ہے عمارت کیا ہے گویا صحرا کا گلاب سامنے رکھا گیا ہے''** (۴)

اس میوزیم کی ٹکٹ پچاس ریال ہے اور جدید ٹیکنالوجی کا استعمال بہت زیادہ اور خوبصورتی سے اس میوزیم میں کیا گیا ہے۔ قطر کے مقامی لوگوں کا اس میوزیم میں داخلہ مفت ہے۔ اسی طرح جنوبی امریکا کے بحرالکاہل کے ساتھ چلی کی حدود میں واقع پیرو اور بولیویا کی سرحد کے قریب ''ہمبر سٹون'' جدید طرز کا شہر ہے اس پورے شہر کو عظیم الشان میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس شہر میں آثار قدیمہ کا بہت بڑا میوزیم ہے یہاں کوئی آبادی بستی نہیں ہے۔ اس دیار کا نام صرف انگریزی نہیں بلکہ طرز تعمیر بھی برطانوی ہے۔ اس شہر کے اجڑنے اور بسنے کی کہانی عامر بن علی یوں بیان کرتے ہیں کہ پوری دنیا میں ایک صدی پہلے زمین کی زرخیزی برقرار رکھنے کا باعث نائٹریٹ کھاد ۶۵ فیصد اس فیکٹری میں اس فیکٹری میں تیار کی جاتی تھی یہ فیکٹری ''ہمبر سٹون'' نامی برطانوی شہری اور سائنسدان نے قائم کی مگر اس کے بعد چند اور فیکٹریاں بھی بن گئیں مگر پھر بھی سائنسی بنیادوں پر اس مقام کو نائٹریٹ کی پیداوار کے لیے چننے کا سہرا ان کے سر پر بندھتا ہے۔

لاطینی امریکا کے مقامی باشندے فصلوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے طویل عرصے سے سوڈیم نائٹریٹ کا استعمال کرتے رہے تھے ۱۸۳۰ء میں جب سائنسدانوں نے تجربات کے بعد تصدیق کیا کہ واقعی سوڈیم نائٹریٹ زمین کی زرخیزی بڑھانے کے لیے کارگر ہے تو اس نائٹریٹ کی صنعت نے مزید رفتار پکڑ لی۔ پہلی جنگ عظیم جو پیرو اور چلی کے درمیان ہوئی اس جنگ میں برطانیہ نے چلی کا ساتھ دیا اور برطانیہ کی خواہش پر چلی نے سوڈیم نائٹریٹ کی برآمد بند کر دی، یہ جنگ اس شہر کی بربادی کی وجہ بنی۔ ایک تو اس کے نتیجہ میں جب جرمنی کو نائٹریٹ کی فراہمی مکمل طور پر بند ہو گئی تو نتیجہ ایجاد کی صورت میں سامنے آیا، جرمنی میں لیبارٹری میں مصنوعی سوڈیم نائٹریٹ ایجاد کی گئی۔ دنیا بھر میں استعمال کی جانے والی سوڈیم نائٹریٹ کا دو تہائی حصہ ۱۹۱۰ء میں ہمبر سٹون میں پیدا ہوتا تھا جو اگلے برس صرف دس اور ۱۹۵۰ء میں فقط تین فیصد رہ گیا تھا۔ ۱۹۰۶ء تک ہمبر سٹون مکمل طور پر اجڑ گیا تھا، ۱۹۷۰ء میں سلواڈور آیندے کی سوشلسٹ حکومت نے اسے قومی ورثہ قرار دیا، ۲۰۰۵ء میں اس شہر کو کھول کر مکمل طور پر میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو نے اسے عالمی ورثہ قرار دیا ہے۔ مصنف کتاب ہمبر سٹون کی طرز تعمیر کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

**''کھاد فیکٹری کا رہائشی علاقہ قابل دید ہے، ساڑھے تین ہزار نفوس پر مشتمل یہ ایک جدید شہر کا نمونہ تھا۔ ٹینس، باسکٹ بال، بیڈ منٹن کے علاوہ وہ فٹ بال کا وسیع و**

عریض میدان، اتنے سارے کھیلوں کا اہتمام کہ گنوانا مشکل ہے۔ اسپتال، سینما تھیٹر، اوپیرا ہال مختصر یہ کہ ایک جدید شہر میں جو سہولیات آ سوچ سکتے ہیں وہ تمام یہاں پر مہیا کی گئی تھیں"(۵)

یہ شہر اجڑنے کے بعد دوبارہ کھول دیا گیا ہے اور سیاحوں کا اس نگر آمد و رفت کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا ہے۔ ہمبر سٹون شہر کی سیاحت کے بعد سفر نامہ نگار ویسٹ انڈیز کا رخ کرتے ہیں۔ ویسٹ انڈیز براعظم شمالی اور جنوبی امریکا کے چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ہے۔ امریکی ریاست فلوریڈا کے ساحل سے جنوبی امریکا تک پھیلا تین ہزار میل کا علاقہ جن میں تین درجن سے زیادہ جزائر پر مشتمل ممالک ہیں، ان جزائر کی مشترکہ کرکٹ ٹیم اور کرکٹ بورڈ ہے۔ ۱۹۶۰ء میں تاج برطانیہ نے اپنے زیر اثر جزائر کو ملا کر ویسٹ انڈیز کے نام سے ایک ریاست تشکیل دی تھی، مگر یہ کوشش برطانوی نو آبادیائی عہد کی ناکام ہو گئی اور بعد میں اس ملک سے کئی نئے ممالک بن گئے مگر کرکٹ بورڈ آج بھی قائم ہے۔ ان جزائر میں سے چار جزائر برطانیہ کے قبضہ کچھ فرانس اور ہسپانیہ کے پاس تھے جبکہ کرہ ارض پر ویسٹ انڈیز نام کا کوئی ملک سرے سے نہیں ہے۔ اس علاقے کا مقبول میوزک ''چٹنی'' ہے۔ برصغیر کی موسیقی جیسا گانے کا انداز ہے۔ بول انگریزی ترنم اور سر اردو گانے جیسے ہوتے ہیں۔ ''سوگا'' جو کہ افریقی روایتی موسیقی بھی یہاں بہت مقبول ہے۔ ویسٹ انڈیز میں افریقی نسل اور برصغیر پاک و ہند کے والدین کے باہمی امتزاج سے پیدا ہونے والی اولاد کو ''دوغلا'' کہا جاتا ہے جو کہ اس ملک کی ثقافت میں ایک مثبت اظہار ہے۔ جبکہ پاکستان کی ثقافت میں لفظ ''دوغلا'' منفی سمجھا جاتا ہے۔ عامر بن علی کے سفر ناموں میں تقابلی انداز بے شمار جگہوں پر ملتا ہے لیکن خاص طور پر بیرون ممالک کے سفر نامے لکھتے وقت عامر بن علی جہاں کہیں بھی کوئی ایسا مقام دیکھتے ہیں جو ہمارے ملک سے مشابہت رکھتا ہے تو مصنف کتاب کو قلم موازنہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

عامر بن علی جہاں جہاں بھی جاتے ہیں جن ممالک کی سیاحت کرتے ہیں تو وہاں کی تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی اشیاء و مظاہر سے قلب و نظر کو بھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور بڑے خوبصورت اور منفرد انداز میں وہاں کے رسوم و رواج، رہن سہن، عادات کو بیان کرتے ہیں جہاں سفر نامہ نگار مختلف ممالک کی تہذیب و ثقافت کا ذکر کرتے ہیں وہیں پر میڈیا کے حوالے سے پاکستانی مقبول ڈرامے ''ارطغرل'' کا تذکرہ بھی ایسے سنہرے الفاظ میں کرتے ہیں کہ قاری اس مقبول ڈرامہ کی تاریخ سے حقیقی معنوں میں آگاہ ہو جاتا ہے۔ مصنف کتاب اپنے مضمون ''ابن عربی اور ارطغرل'' میں اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ مقبول ڈرامے کا ہیرو ارطغرل اہم کردار ابن عربیؒ کا تعلق افسانوی یا فرضی نہیں ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے دونوں کا ایک ہی عہد ہے۔ ابن عربیؒ ۱۱۶۵ء میں پیدا ہوئے اور ۷۵ برس کی عمر میں ۱۲۴۰ء میں وفات پا گئے جبکہ ارطغرل کی تاریخ وفات ۱۲۸۰ء ہے۔ ترک قوم سے اغوز نسل کے لوگوں کے قائی قبیلے میں پیدا ہونے والے ارطغرل کی زندگی کے

ہر اہم موڑ پر ابن عربیؒ کی مدد اور رہنمائی شامل رہی ہے یہاں تک ارطغرل کی قائم کردہ سلطنت جو تقریباً آٹھ صدیاں قائم رہی ابن عربیؒ نے اس طویل حکمرانی کی نوید اپنی زندگی میں ہی سنا دی تھی۔

متذکرہ ڈرامے میں ابن عربیؒ کے کردار کو شیخ کہہ کر پکارتے ہیں جس کی وجہ ابن عربیؒ کا لقب ''شیخ الاکبر'' ہے، ابن عربیؒ جو کہ فلسفی، شاعر، محقق اور عالم دین نے اپنی مختصر سی زندگی میں آٹھ سو سے زائد کتابیں لکھیں، انہوں نے ساری زندگی سفر کو وسیلہ ظفر سمجھا اور بہت سی مشکلوں اور کٹھن حالات میں حجاز سے لے کر مراکش، حلب اور ایران، عراق سے لے کر ترکی، مصر اور یروشلم تک سفر در سفر تلاش حق، تبلیغ اور ریاضت میں وقت گزارا اور یہی ان کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اس عظیم ہستی سے منسوب آٹھ سو کتابیں موجود ہیں۔ یہ کتابیں چند صفحات پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ ان کی تحریر کردہ کتاب جو تصوف کے موضوع پر بیان کی گئی ہے ''الفتوح المکیہ'' کی سینتیس جلدیں ہیں، ان کے پانچ شعری مجموعے بھی محفوظ ہیں جنہیں ''دیوان'' کے نام کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ بارہ اماموں کے اوپر لکھی گئی ابن عربی کی کتاب اثناء عشری شیعہ حضرات کے نزدیک ان موضوع پر معتبر ترین تحریروں میں شامل ہے۔ ابن عربیؒ کا ایک منفرد انداز یہ بھی ہے کہ ''مشکوۃ الانوار'' کے نام سے ۱۰۱ احادیث قدسی کو جمع کر کے شائع کی۔ اس ولی اللہ نے مشاہدات الاسرار کے نام سے چودہ مکالمے تحریر کیے۔ ابن عربیؒ شام کے شہر دمشق میں مدفون ہیں۔ سفر نامہ نگار جب عظیم ہستی کے مزار پر جاتے تو اس منظر کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> **''جیسے جیسے سیڑھیاں اترتے ہیں اور مزار کے قریب پہنچتے ہیں رحمتوں کی رم جھم دل پر گرتی محسوس ہوتی ہے۔۔۔ابن عربیؒ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صوفی سنی تھے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ سنی اور شیعہ مسلک کے پیروکاروں میں یکساں مقبولیت رکھتے ہیں''**(۶)

جدید تقاضوں کے پیش نظر عامر بن علی نے خوبصورت تصویر کشی کر کے ایک خاص طرز تحریر کو سامنے لایا ہے۔ مصنف کتاب بیشتر مقامات پر ایک مصور کے روپ میں سامنے آئے ہیں اور اپنے الفاظ کے ذریعے جذبات و احساسات کی تصویر کاغذ پر ثبت کرتے ہیں۔ ایک مصور کی طرح وہ واقعات کو اس طرح تخلیق کرتے ہیں کہ ان کی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ دوران مطالعہ قاری ان مناظر میں ایسے کھو جاتا ہے کہ الفاظ اس کے لیے ایک اشارہ نہیں رنگ و بو کا ایک جہاں بن جاتے ہیں۔

ایک حقیقی سیاح کی طرح عامر بن علی نے بہر کیف ادبی لب و لہجے میں معلومات فراہم کی ہیں اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ تاریخی، جغرافیائی، تہذیب و ثقافت، سیاسی اور تعلیمی، علمی و ادبی حوالے سے بات کی ہے۔ مصنف کتاب میں چنوں میں ہونے والے مشاعرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ پاکستان میں گزشتہ برسوں سے اعلیٰ پائے کا مشاعرہ میاں چنوں میں منعقد کیا جاتا

ہے۔ اس شہر کو اہل ذوق پنجاب کا لکھنو بھی کہتے ہیں۔ پاکستان کے بہت سے نامور شعراء کرام مشاعرہ میں شرکت کرتے ہیں اور مقامی شاعر بھی شامل ہوتے ہیں، ہزاروں کی تعداد میں سامعین کی تعداد شرکت کرتی ہے اور یہ مشاعرہ کیبل ٹی وی اور فیس بک پر لائیو چلایا جاتا ہے۔ مشاعرے کا آغاز ''حمد'' سے کیا جاتا ہے اور ''نعت'' کے بعد باقاعدہ مشاعرے کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اس مشاعرے میں شاعر حسن عباس کے اس شعر پر سامعین سے بہت داد ملی ہے:

**اُس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے**
**محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے**(۷)

عامر بن علی بتاتے ہیں کہ اس مشاعرے میں نہ صرف پاکستان سے تعلق رکھنے والے شعراء تشریف لائے بلکہ فرانس، قطر سے بھی شعراء نے شرکت کی۔ ملکی اور غیر ملکی شعراء کی آمد پر ڈھول، تاشوں اور میوزک بینڈ کے علاوہ آتش بازی کا مظاہرہ کیا گیا۔ تمام مشاعرہ گاہ کو دلن کی طرح سجایا گیا اور شعراء کرام کو پھولوں کے ہار پہنانے کے ساتھ ساتھ گل پاشی بھی کی گئی۔ مشاعرے میں شاعر علی رضا، ابرار ندیم، حسن عباسی، مزاحیہ شاعر خالد مسعود خاں، ممتر رضا شہر، رضی الدین رضی، فاخرہ انجم، بسمل صابری، ندیم بھابھہ، فرتاش سید، لبنیٰ صفدر، طاہرہ سرا، علی زریون، فہیم ضیاء، جواد شیخ، آفتاب وڑائچ، ایاز محمود ایاز، تیمور حسن تیمور، سہیل عابدی، زاہد شمس، طاہر نسیم، نوخیز اختر، ڈاکٹر صغریٰ صدف، صوفیہ بیدار، رخشندہ نوید، شاہدہ دلاور، نیلما ناہید درانی، رجا نیئر، غافر شہزاد، سعود عثمانی، زیب النساء زیبی، عباس تابش، حکیم راشد شہزاد، بابا نجمی، اختر شماں، اقبال راہی، عزیز احمد، شکیل راؤ، ڈاکٹر انعام الحق جاوید، خالد شریف، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور انور مسعود نے شرکت کی اور مشاعرے کو چار چاند لگائے۔ مشاعرے کی صدارت عظیم شاعر ظفر اقبال نے کی اور یہ یادگار عالمی مشاعرہ بھی صبح صادق تک جاری رہا۔

عامر بن علی اس یادگار عالمی مشاعرہ کی روداد کے بعد مختلف ادباء کی کتاب رونمائی کے حوالے سے بھی لکھتے ہیں اور مصنفین کی تحاریر کو داد بھی دیتے ہیں۔ سب سے پہلے ایسے ہی نایاب اور تازہ شعری مجموعہ ''اساں دل نوں مرشد جان لیا'' ہے کے بارے میں لکھتے ہیں جس کے تخلیق کار پنجابی اور اردو زبان کے مقبول شاعر، کالم نویس، مزاح نگار اور براڈکاسٹر ابرار ندیم ہیں۔ عامر بن علی اس کتاب کی رونمائی کے حوالے سے یوں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

**''ابرار ندیم کلاسیکی شاعری کی اسی روایت کا امین ہے جس میں عشق حقیقی کو مجاز کے پیراہن میں پیش کیا جاتا ہے''**(۸)

مصنف بتاتے ہیں کہ ابرار ندیم اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں جو ان کی شاعری میں وفا اخلاقی خوبیاں جھلکتی ہیں وہ ان کی شخصیت کا حصہ ہیں۔ ان کا فن اور شخصیت دونوں ایک جیسے ہیں۔ یہ شاعر اپنی شاعری کی طرح اجلا اجلا، نکھرا نکھرا اور بناوٹ سے پاک انسان ہے اور ایک سچے شاعر کی یہ ہی خوبی ہے کہ وہ سنگ دل دنیاداروں کو

انسانیت کا احساس دلائے اور بناوٹی شاعری نہ کرے بلکہ شاعری دلوں میں اترنے والی اور حق سچ پر مبنی ہو جیسا کہ استاد دامن شاعر کی تعریف کرتے تھے:

**میرے خیال اندر او شاعر ہندا**

**جیہڑا کھنڈ نوں کھنڈ تے زہر نوں زہر آکھے**

**جیہڑا ندی نوں ندی تے نہر نوں نہر آکھے**(۹)

ابرار ندیم کا شعری مجموعہ ''اساں دل نوں مرشد جان لیا'' استاد دامن کے قائم کردہ معیار پر بالکل پورا اترتا ہے۔اس تصنیف کا سرورق ضیاء انجم نے بنایا ہے اور الخیال پبلشرز نے لاہور سے شائع کیا ہے اس کتاب کے ۱۶۰ صفحات ہیں اور قیمت تین سو روپے ہے۔ عہد حاضر کے نامور شعراء کرام کی آراء کو بھی شامل کر کے شائع کیا گیا ہے جن میں عطاء الحق قاسمی، منیر نیازی، عباس تابش، یونس اختر، جمشید مسرور، ڈاکٹر ناصر رانا، سعد اللہ شاہ، محمد احسن راجہ، فوزیہ بھٹی اور ڈاکٹر جواز جعفری شامل ہیں۔اس شعری مجموعے کا شعر ملاحظہ ہو:

**دو تن قسماں تے کجھ سفنے**

**اپنے دے وچ آندا کیہ اے**(۱۰)

ابرار ندیم کا شعری مجموعہ ''اساں دل نوں مرشد جان لیا'' ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔اس کے بعد سفر نامہ نگار معروف شاعرہ، ادیبہ و دانشور نیلما ناہید درانی کی نئی شائع ہونے والی کتاب ''تیز ہوا کا شہر'' کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصہ سفر نامہ پر مشتمل ہے جو کہ آذر بائیجان سے متعلق ہے، دوسرا حصہ مضامین پر اور تیسرے حصے میں افسانے شامل کیے گئے ہیں اور یہ تینوں کتاب کے حصے معیاری او دلچسپ تخلیقات کے حامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے ادارہ زر ہفت پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔اس کتاب کی مصنفہ نیلما ناہید درانی پولیس میں اعلیٰ افسر تھیں۔لاہور میں ایس پی سپیشل برانچ کے علاوہ پولیس ٹریننگ سکول کی مدار المہام بھی تھیں۔ ''تیز ہوا کا شہر'' کے خوبصورت سرورق پر آذر بائیجان کے شہر باکو کی تصویر کے ساتھ سابق آئی جی پولیس ناصر خان درانی کا اظہار خیال نظر آتا ہے۔اس کتاب کا دیباچہ طاہر انور پاشا نے لکھا ہے۔ان کے علاوہ سلمیٰ اعوان کی رائے بھی اشاعت کی گئی ہے۔ کتاب کا انتساب سال ۲۰۱۹-۲۰ء COVID کے نام کیا گیا ہے اور تصنیف کی قیمت تین صد روپے ہے۔ عامر بن علی اس کتاب کی منصنفہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

**''نیلما ناہید درانی ان دنوں لندن میں مقیم ہیں مگر اس تازہ تحریر نے ان کی عدم موجودگی کے احساس کو ادبی حلقوں میں کافی حد تک کم ضرور کیا ہے''**(۱۱)

کتب کی رونمائی کیا حوال کے بعد عامر بن علی دوبئی کے تعلیمی وادبی نظام کے بارے میں قاری کو آگاہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی جاپان، پاکستان اور دوبئی کے تعلیمی نظام کا موازنہ بھی کرتے ہیں۔ اردو کتابوں کا سب سے بڑا ذخیرہ دوبئی میں نیاز مسلم لائبریری میں موجود ہے جو کہ پاکستان سینٹر میں قائم ہے۔ دوبئی کی آبادی کا زیادہ حصہ بنگالیوں پر مشتمل ہے اور ان سے کم ہندوستانی ہیں اور کچھ پاکستانی بھی آباد ہیں۔ مقامی عرب مجموعی آبادی کا صرف بیس فیصد ہیں۔ اس ملک کو متحدہ عرب امارات کے دارالحکومت ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ یہ سینٹر لاہور کا کوئٹے انسٹیٹیوٹ، برٹش کونسل اور امریکی سینٹر سے زیادہ کشادہ، متنوع اور کئی لحاظ سے بہتر ہے۔ اس سینٹر میں سب سے زیادہ متاثر کن قائم کردہ اردو لائبریری جہاں بیٹھ کر پاکستان کی مہک محسوس کی جاسکتی ہے اس کشادہ لائبریری میں بہت اعلیٰ معیار کے ادبی اجتماع منعقد کر کے پاکستانی شعراء کو مدعو کیا جاتا ہے اور نامور شعراء کا کلام سنا جاتا ہے۔ سفر نامہ نگار پاکستان سینٹر کا نقشہ یوں بیان کرتے ہیں:

> **"پاکستانی ایسوسی ایشن دوبئی کے زیر اہتمام پاکستان سینٹر میں داخل ہوں تو سامنے قائداعظم، علامہ اقبال اور مقامی حکمرانوں کی تصاویر کے ساتھ ساتھ پاکستانی پرچم دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اس ادارے کا استقبالیہ اعلیٰ معیار کے بین الاقوامی نجی اداروں جیسا ہے جس میں انتظار گاہ ایسی خوبصورت ہے کہ دل چاہتا ہے گھنٹوں کتابوں اور پاکستانی رسالوں کا یہاں بیٹھ کر مطالعہ کیا جائے"** (۱۲)

یہ پاکستان سینٹر دریار غیر میں ایک خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے۔ پاکستانی اسکول کی تعداد دوبئی میں گیارہ ہے جہاں معیاری تعلیم کے ساتھ ساتھ یہ سارے ادارے پاکستانی ثقافت کے فروغ کے لیے بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس پاکستان میں تعلیم کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جو کہ دوسرے ممالک میں نظر آتی ہے۔ جس کی ایک وجہ پاکستانی حکومت ہے۔ ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات میں تعلیم کا شعبہ شاید نہیں ہے۔ اس دور میں جب ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے وہاں پاکستان ایجوکیشن کا بجٹ کم کر دیا گیا ہے۔

عامر بن علی جاپان میں ٹوکیو یونیورسٹی اور دیگر درس گاہوں کا تقابل پنجاب یونیورسٹی اور جامعہ کراچی سے کرتے ہیں کہ دنیا بھر میں کرونا وباء کے عالمی پھیلاؤ کی وجہ سے معیشت متاثر ہوئی مگر ان ممالک نے معاشی مشکلات کا حل تخلیقی انداز میں نکالنے کی کوشش کی ہے۔ جاپانی حکومت نے جاپان کی سب سے بڑی یونیورسٹی ٹوکیو یونیورسٹی میں گراوٹ کا رجحان دیکھتے ہوئے کچھ مراعات اور رعایتیں ختم کر کے اقتصادی قوانین میں نرمی پیدا کر دی کہ مارکیٹ میں یونیورسٹیاں اپنے "بانڈز" فروخت کر سکتی ہیں جس کا فائدہ یہ ہوا کہ ٹوکیو یونیورسٹی نے تیس ارب مالیت کے یونیورسٹی بانڈز جاری کر دیئے۔ جو قومیں تعلیم کو اہم سمجھتی ہیں تو وہاں تدریس کے شعبے میں محض بجٹ سے کٹوتی کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ متبادل راہ تلاش کی جاتی ہے۔

انسان اور جانور میں بنیادی فرق ہی تعلیم ہے کہ جانور اپنی زندگی سے ہر نفس خود سیکھتا ہے اور اپنی زندگی کے خاتمے کے ساتھ ہی اپنے تجربات اور علم کو بھی لے جاتا ہے جبکہ انسان اپنے تجربات اور علم ہزاروں، لاکھوں سال سے اپنی اگلی نسلوں کو منتقل کرتا ہے۔ عامر بن علی ''تعلیم کی اہمیت اور پاکستان'' میں علم کی اہمیت ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں:

**''آج جو انسان کا بچہ پیدا ہوتا ہے وہ پوری انسانی تاریخ کا علم لیکر پیدا ہوتا ہے، باالفاظ دیگر بنی انسان آج کی تاریخ تک جو علم حاصل کیا ہے وہ آج جنم لینے والے بچوں کی دسترس میں ہے''**(۱۳)

پاکستان اگر ادب کا شہر دیکھا جائے تو وہ لاہور ہے جو اقوام متحدہ کا ادارہ برائے تعلیم و ثقافت جو یونیسکو کے نام سے جانا جاتا ہے اس ادارہ کی جانب سے لاہور کو ادب کا شہر قرار دیا گیا ہے۔ پاکستان کا پہلا شہر لاہور ہے جسے یونیسکو سے یہ اعزاز ملا ہے یہ عالمی ادارے کی جانب سے مستحسن اقدام کے ساتھ تاریخ وصف کا اعتراف بھی ہے۔

ملکہ نور جہاں کا تعلق بھی لاہور سے ہے ان کے ساتھ ساتھ بہت سے نامور ادباء اور شعراء جن میں علامہ اقبال، فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو، منو بھائی، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین، اشفاق احمد، منیر نیازی، استاد دامن، حبیب جالب، ساغر صدیقی، ناصر کاظمی، پطرس بخاری، ن م راشد وغیرہ دبستان لاہور کو اپنے فن کی رونق بخشی۔ سفر نامہ نگار اس شہر سخن اور اس کے سخنوروں کے ہمیشہ شاد و آباد کی دعا کرتے ہیں۔

عامر بن علی جہاں لاہور کے مثبت پہلوؤں پر بات کرتے ہیں وہاں ہی لاہور میں ہونے والے افسوس ناک واقعات کی مذمت بھی کرتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کے تین بزرگ پروفیسرز کو ہتھکڑیاں پہنا کر پولیس کے حصار میں نیب کی عدالت میں پیش کیا جا رہا تھا۔ ان تینوں پروفیسرز حضرات کی عمر بھی تقریباً ۷۰ سال کے قریب تھی۔ نیب کے پاس جتنے بھی مضبوط ان پر وفیسر حضرات کو بری طرح گرفتار کرنے کے دلائل ہوں مگر معلمین کی تذلیل کے مناظر شرمندگی کا باعث ہیں۔ اسلام نے معلم کا مقام و مرتبہ بہت اعلیٰ قرار دیا ہے لیکن یہ گرفتاری کا منظر روح گھائل کر دیتا ہے۔ عامر بن علی اس واقعے کی مذمت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

**''نیم خواندہ پولیس اہلکاروں سے تو کوئی شکوہ نہیں ہے جو انہیں زنجیروں میں کھینچ رہے ہیں کہ ان بے چاروں کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ مصنف ہونے کا مطلب کیا ہے۔۔۔ نیب کے اعلیٰ حکام کو تو یقیناً اندازہ ہو گا کہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ سرگودھا یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ہتھکڑیاں لگواتے وقت ان کی تعلیمی قابلیت اور تدریسی اہلیت و حوالہ انہیں یقیناً معلوم ہو گا''**(۱۴)

اسلام میں استاد کو روحانی باپ کا درجہ دیا گیا ہے اور جس معاشرہ میں معلم کو ذلیل کیا جائے اُس قوم کا مقدر بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں افسوس کا پہلو یہ ہے کہ یہاں سزا پہلے دی جاتی ہے اور مقدمے کی سنوائی بعد میں ہوتی

ہے جیسا کہ اساتذہ گرامی کو جس تذلیل کے ساتھ لایا جاتا ہے اور اگر وہ باعزت بری ہو جائیں تو کیا ان کی کھوئی ہوئی عزت واپس آ جائے گی؟ کیا سرعام ہونے والی توہین کا کوئی مداوا ہو سکے گا؟ کیا ان کے ماتھے سے تذلیل کے داغ دھل جائیں گے؟

زیر تحقیق کتاب ''نگر نگر اک نظر'' میں سفر نامہ نگار سفر نامے کے آغاز میں مختلف ممالک کی تاریخ، تہذیب و ثقافت، تعلیمی، علمی و ادبی حوالے سے بات کرتے ہیں چونکہ یہ سفر نامہ مختلف تحریروں کا گلدستہ ہے اس لیے مصنف وبائی موسم کی روداد بھی بیان کرتے ہیں اور کرونا وائرس کے عالمی پھیلاؤ کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں۔ کرونا کی حالیہ اندوہناک تباہی سے ہر کوئی باخبر ہے۔ عہد گزشتہ کی کسی بھی متعدی بیماری سے نہ صرف شدت زیادہ رہی بلکہ دنیا کا ہر ملک اس کی لپیٹ میں آیا اور ہر انسان کسی نہ کسی طرح متاثر ہوا۔ اس موذی وباء نے معیشت سے سیاست تک ہر میدان کے نقش کو گہنا کر کے رکھ دیا، بہت سے روزگار اجڑے، مریضوں سے ہسپتال بھرے، جنازے اٹھے یہاں تک کہ بہت سے لوگ اپنے پیاروں کی آخری رسومات میں شامل بھی نہ ہو سکے۔ اس گھمبیر صورتحال میں معاشرے کے سب سے زیادہ حساس طبقے یعنی ادباء و شعراء کا خاموش رہنا بعید از قیاس ہے۔ اس وجہ سے اس ضمن میں بہت کچھ تحریر کیا گیا اور عامر بن علی نے بھی اپنے سفر نامے میں اس موذی وباء کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔

سفر نامہ نگار بتاتے ہیں کہ جنوری کے آخری ہفتہ جب یہ میکسیکو شہر میں تھے یہاں تب اس وباء کا نام و نشان تک نہ تھا، سینما میں فلم دیکھنے والے شائقین سے ہال کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے، شہر میں ہر جگہ لوگوں کی بھیڑ تھی حالانکہ اس وباء کا آغاز دسمبر کے وسط میں ہو چکا تھا لیکن تمام دنیا نے ابتداء میں اسے چینی مسئلہ خیال کرتے ہوئے توجہ نہ دی۔ یورپی ممالک اور امریکا نے اس وباء سے بچنے کے لیے چین سے ناکہ بندی کر دی۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اور برطانوی وزیر اعظم ابتداء میں باقاعدہ اس وباء کا مذاق اڑاتے ہوئے نظر آئے۔ امریکی صدر تو اس وائرس کو چینی وائرس کا نام دیتے تھے۔ فروری میں اس موذی وباء کو زیادہ سنجیدہ نہ لیا گیا۔ مارچ کے ابتدائی دو ہفتے پوری دنیا کو یہ باور کروانے میں بالآخر کامیاب ثابت ہوئے کہ کرونا صرف چین کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ پوری دنیا اس وباء کی لپیٹ میں ہے۔ اس وباء نے مارچ کے آخری عشرے میں پورے یورپ میں شدت اختیار کر لی جس میں بہت سے ممالک فرانس، اٹلی، سپین، انگلستان اور جرمنی سمیت اور بھی ممالک اس وباء کی لپیٹ میں آ گئے۔ دنیا نے اس وباء کو سنجیدگی سے کسی بھی ملک میں زیادہ کرونا سے متاثرہ مریض اور اموات کی تعداد سے لیا اور دنیا بھر میں لاک ڈاؤن شروع ہو گیا۔ کریانہ اور فارمیسی کے سوا تمام دوکانیں بند، تمام فلائٹس کینسل۔ عامر بن علی اس وباء کے بارے میں لکھتے ہیں:

> **''یہ مرض اس کرہ ارض پر بسنے والے ساڑھے سات ارب انسانوں کے لیے بالکل نیا اور ناقابل یقین لگتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بنی نوع انسان کو اتنا بے بس نہیں**

**دیکھا۔ دس لاکھ سے زیادہ مریض اور پچاس ہزار افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں مگر تا دم تحریر کوئی دوا اس مرض کا علاج نہیں کر سکتی''**(۱۵)

کرونا وائرس نے تہواروں کو بھی بری طرح متاثر کیا۔ رمضان المبارک میں بھی روایتی مذہبی رونقیں کرونا وائرس کی وجہ سے ماند پڑ گئیں اور عید پر بھی بیماری اور موت کا خوف چھایا رہا۔ عید کا مطلب ہی لوگوں سے گلے مل کر مبارکباد دینا ہے لیکن کرونا کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا۔ اس موذی وباء کے سبب بغیر ہاتھ ملائے، گلے ملے گھر پر عید نماز ادا کی گئی۔ یہ صورتحال جاپانی شاعر کے شعر سے ملتی جلتی نظر آئی

**لوگوں سے ملے تم سینہ بہ سینہ** ؎
**ہم سے ملائے خالی ہاتھ**
**سچ پوچھو تو عید منائی لوگوں نے**(۱۶)

نہ صرف پاکستان میں بلکہ جاپان میں بھی ان کے تہواروں کو کرونا نے بری طرح متاثر کیا۔ جاپان میں چیری کے پھولوں کی دید کا تہوار جسے مقامی زبان میں ''ہنامی'' کہتے ہیں یعنی ''پھول کا تکنا''۔ جاپان کے ہر شہر میں چیری کے درختوں کا ایک باغ ضرور ہے جسے دیکھنے کے لیے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اور باغ میں کھاتے پیتے اور موج مستی کرتے ہیں لیکن اس موذی وائرس کرونا کے سبب باغ اجڑ گئے کیونکہ پھولوں کے حسن کی داد دینے والے اور گلشن میں سیر کو آنے والے نہیں ہیں وہ گھروں میں قید ہو گئے ہیں۔ یہ چیز مکمل طور پر بند ہو گئی۔ اس وباء نے انسان کو احساس دلایا ہے کہ اتنی ترقی کے باوجود آج بھی مجبوری کی حالت میں وہیں کھڑا ہے جہاں ایک صدی پہلے کھڑا تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

**''بڑی معذرت کے ساتھ کہ لاک ڈاؤن بھی بے سود ثابت ہو گا۔ لگتا ہے آنے والے لوگ بھی ہم پر ایسے ہی ہنسیں گے، جیسے گزرے زمانے کے انسانوں کی لاچارگی پر ہم ہنستے تھے''**(۱۷)

ایک سفر نامہ نگار کی حیثیت سے عامر بن علی اپنی ذمہ داری نبھاتے ہیں۔ جس علاقے یا خطے میں جاتے ہیں وہ اس معاشرے اور ماحول میں ایسے سما جاتے ہیں کہ یوں لگتا ہے کرداروں کی زبان میں ان کی تحریروں کو وہاں کی معاشرت کو دوبالا کیا جا رہا ہے۔ ان کے سفر نامے میں مقامیت کا اثر جا بجا نظر آتا ہے۔ کرداروں کی زبان ان کے قلم سے یوں ٹپکتی ہے کہ شائبہ تک نہیں ہوتا کہ مصنف یہ جملے اس ماحول اور معاشرے کو مد نظر رکھ کر خود تخلیق کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی بھی پہلو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ کسی بھی علاقے کا رخ کرتے ہیں تو وہاں کی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج، تعلیمی، علمی و ادبی حوالے اور وبائی موسم کی روداد کے ساتھ ساتھ وہاں کی سیاست کا بھی پاکستان سے تقابل کرتے ہیں کہ برطانیہ میں پاکستانی نژاد برطانوی رکن پارلیمان ساجد جاوید کو وزیر داخلہ مقرر کیا ہے۔ ساجد جاوید کے والدین جن کا تعلق پنجاب کے علاقے

ساہیوال سے تھا بسلسلہ روزگار ترک وطن کر کے برطانیہ پہنچے تو ایک لمبے عرصہ تک وہاں بس ڈرائیوری کرتے رہے اور ان کی والدہ کپڑوں کا سٹال لگایا کرتی تھی جو کہ بہت مشقت والا کام ہے۔ان کے بیٹے پہلے وزیر خزانہ اور کئی دیگر محکموں کے وزیر کے بعد اب برطانیہ کے وزیر داخلہ مقرر ہوئے ہیں۔ سفر نامہ نگار بس ڈرائیور کے بیٹے کو وزیر داخلہ مقرر کرنے پر اس بات کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کیا ایسے محنت کش والدین کا بچہ پاکستان میں بھی وزیر داخلہ بن سکتا ہے ؟اس کی کیا وجہ ہے ؟اگر ایسا نہیں تو پاکستان میں برطانیہ کی طرح پارلیمانی طرز جمہوریت رائج ہے۔اسی طرح برطانوی دارالامراء اور کابینہ کی پہلی رکن سعیدہ وارثی کے والد بھی بس ڈرائیور تھے۔ صادق خان جو لندن شہر کا مئیر ہے اب کے والد بھی بس ڈرائیور ہیں لیکن پاکستان میں مئیر بننے کا ڈرائیور کا بچہ سوچ بھی نہ سکتا ہے۔عامر بن علی اس سلسلے میں اپنی سوچ کا اظہار کرتے ہیں:

> **''اگر پاکستانی بس ڈرائیوروں کے بچے برطانیہ میں جا کر اعلیٰ ترین حکومتی عہدوں پر پہنچ سکتے ہیں تو یہ پاک سرزمین پر بھی ممکن ہے۔ برطانیہ تو پرایا دیس ہے، پاکستان تو ان محنت کشوں کا اپنا دیس ہے''**(۱۸)

حال میں پاکستان کی معیشت شدید بحرانوں کا شکار نظر آئی۔ مجموعی قومی پیداوار سے لے کر شرح نمو تک، کرنسی کی شرح تبادلہ سے لے کر اسٹاک مارکیٹ کی گراوٹ تک ہر جگہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان دن بہ دن قرضوں میں ڈوبتا جا رہا ہے جس کے برعکس ہمسایہ ملک بھارت کی معیشت کا حجم بڑھ رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ جنگی ساز و سامان کی خریداری میں اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے۔ دنیا میں آج اسلحے کا سب سے بڑا خریدار ہندوستان ہے۔ پاکستان کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کیونکہ یقیناً ان کا حدف سرحد پار پاکستان ہے۔ لیکن ہمارے مالی حالات اس قدر خراب ہیں کہ ضروری اخراجات کم کرنے کے متعلق سوچتے ہیں جبکہ دفاعی ضروریات کو بڑھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ مصنف ان حالات کا تجزیاتی جائزہ دیتے ہیں:

> **''تیس سال بعد اگر واقعی بھارت اتنی بڑی معاشی طاقت بن گیا جیسی دنیا بھر میں پیشین گوئیاں ہو رہی ہیں تو کیا ہم موجود دفاعی صلاحیت کے ساتھ اس کا مقابلہ کر سکیں گے؟''**(۱۹)

ہمیں اپنے ملک کے دفاع کے لیے خود کو اس قابل بنانا ہو گا کہ دوسرے ممالک کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ پاکستان کی حالت صنفی برابری میں بھی بدتر ہے۔ صنفی امتیاز سے متعلق سالانہ رپورٹ جسے ''گلوبل جینڈر گیپ'' کہا جاتا ہے۔ان تمام ممالک کی فہرست میں ۱۴۹ ممالک میں سے پاکستان ۱۴۸ اویں نمبر پر رکھا گیا ہے صرف ایک یمن سے پاکستان قدرے بہتر ہے۔ دنیا کے باقی ممالک میں بدتر قرار دیا گیا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب پاکستانیوں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیے اور یہ نگران حکمرانوں کا امتحان بھی ہے کہ موجودہ صورتحال کو بہتر کیا جائے۔

حکمرانوں سے یہ عوام کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں جیسا کہ عامر بن علی امریکی صدر جو بائیڈن کے متعلق لکھتے ہیں اس صدر کا عہد امن کا دور کہلائے گا کیونکہ اس سے پہلے صدر ٹرمپ بد تمیز، مغرور، نسلی تعصب رکھنے کے ساتھ ساتھ اور بہت سی خامیوں کا مالک تھا اس لیے نئے صدر سے امیدیں وابستہ ہیں۔ ملک میں امن بحال نہ ہونے کی صورت میں احتجاج کرنا کسی بھی ملک کے عوام کا بنیادی حق ہوتا ہے۔ مختلف ممالک میں احتجاج کرنے کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ کئی ممالک میں احتجاج باورچی خانے میں دھات کے بنے ہوئے برتن بجا کر کیا جاتا ہے۔ لاطینی امریکا میں احتجاج کا مقبول طریقہ سلور سائیکلنگ ہے جس میں مظاہرین سائیکلوں پر سوار ہو کر منہ میں سیٹی دبا کر شاہراؤں پر آ جاتے ہیں۔ کئی علاقوں میں پرانا فرنیچر گھروں سے لے کر چوراہے میں جلایا جاتا ہے اور میوزک چلا کر رقص کیا جاتا ہے جسے مصنف بڑے دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں:

> **''نامراد ٹریفک میں پھنسے ہوئے لوگوں کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ مل کر رقص کریں خلاف ورزی کی صورت میں چونکہ گاڑی کو نقصان پہنچانے کی دھمکی دی جاتی ہے، اس لیے مظاہرین کے ساتھ متاثرین بھی موسیقی کی بلندے اور تان پر رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں''**(۲۰)

پاکستان سمیت بہت سے ممالک میں ملازمین گیٹ کے سامنے بیٹھ کر دھرنا دیتے ہیں۔ مصنف چلی میں ہونے والے احتجاج کے بارے میں لکھتے ہیں جس میں تقریباً ۱۰۰ افراد ہلاک ہو چکے ہیں دس ہزار سے زائد زخمیوں کی تعداد اور یہی تعداد مظاہرین کو جیل بھیج دیئے گئے ہیں۔ اس عوامی احتجاج کی وجہ سے غیر ملکی شہریوں کو بھارتی شہریت دینے کا قانون ہے جس کے مطابق مسلمان کو انسانی ہمدردی کے تحت ہندوستان شہریت نہیں دے گا جبکہ بصورت دیگر بھارتی حکومت میں اگر دوستی بیدار ہوئی تو شہریت سے نواز دیا جائے گا۔ اس قانون کے بعد یہ احتجاج ہندوستان سے ہوتا ہوا پوری دنیا کے کونے کونے میں پھیل چکا ہے۔ ان احتجاجی تحریکوں کی قیادت کوئی سیاسی جماعت نہیں کرتی بلکہ وہ لوگ بھی احتجاج میں شامل ہوتے ہیں جو کسی سیاسی پس منظر اور نظریے کے حامی نہیں ہیں۔

کامیاب سفر نامہ نگار وہی ہوتا ہے کو قاری کا نباض ہو۔ عامر بن علی نے انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں کو توازن کے ساتھ بیان کیا ہے اور واقعات کی تدریجی اٹھان سے قاری کی دلچسپی کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ سفر نامہ نگار کی فنکارانہ کوشش اور یہی شعور انہیں قاری کے قریب کرتی ہے۔ عامر بن علی نے تحقیق طلب کتاب ''نگر نگر اک نظر'' کے حصہ دوم میں جاپان کی ترقی، جاپانیوں کی دیانت داری، تہذیب و ثقافت، دوسری جنگ عظیم، جاپانیوں کا مارکیٹنگ کی دنیا میں انقلاب اور کتاب کی رونمائی کا تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ اس حصے میں روایتی جاپان کی موجودہ دور کی سماجی عکس کشی بیان کی گئی ہے۔ جاپانی

ایک زندہ شناس قوم ہے۔اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ جاپان کے شہر ہیروشیمااور ناگاساکی جیسے بھیانک واقعات کے کچھ عرصے بعد ہی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو گیا۔

جاپان میں ہونے والی دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں لاکھوں بے گناہ لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ یہ ایسی تباہی ہے کہ جس کی مثال انسانی تاریخ میں اس سے پہلے دنیا میں کہیں نہیں ملتی، نہ ہی اس کے بعد انسانی بستی نے ایسی بربادی کا سامنا کیا۔ایٹمی بمباری کے نتیجے میں لاکھوں لوگ لقمہ اجل بن گئے اور زندہ بچ جانے والے ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئے۔ایٹمی تابکاری کے اثرات کی وجہ سے برسوں بعد پیدا ہونے والے کئی بچے معذور پیدا ہوتے رہے۔ جیسا کہ مصنف کتاب ''ایٹمی بمباری کی یادیں اور خطرات''میں بتاتے ہیں:

> **''اس مرگ انبوہ کا مشاہدہ کرنے والے بہت سارے لوگوں نے وحشت کی وجہ سے کئی دہائیوں تک ایک لفظ بھی منہ سے نہیں بولا، پیہم خاموش رہے۔ خوف، دہشت اور کرب کے اثرات زندہ بچ جانے والوں ۷۵(پچھتر) سال بعد، آج بھی دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں''**(۲۱)

عامر بن علی ''ایٹمی بمباری اور سونامی کے بچوں پر اثرات'' میں لکھتے ہیں کہ ہیروشیمااور ناگاساکی پر ہونے والے امریکی ایمی بمباری کے متاثرہ بچے پیہم خاموش رہے اور بہت عرصہ بعد اس واقعہ کے متعلق اپنی زبان کھولی اور تفصیلات بیان کی ہیں۔ بہت سارے بچوں نے ہمیشہ کے لیے اپنی قوت گویائی ہی کھو دی۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانی قوم نے جس بربریت اور قیامت صغریٰ کا سامنا کیا ہے اسے ضبط تحریر میں لانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ایک لمبا عرصہ گزرنے کے بعد آج بھی جب جاپانی قوم کے خلاف جنگ اور امن کے حق میں بات کرتے ہیں تو اس کا بنیادی محرک یہی ہولناک منظر ہوتا ہے۔

جاپان میں اگست کا مہینہ مرنے والوں کو یاد کرنے کے لیے مخصوص ہے جیسے مسلمان محرم الحرام میں زیادہ تر اپنے پیاروں کی قبروں کی صفائی ستھرائی کے لیے جاتے ہیں ویسے ہی جاپان میں ماہ اگست میں ہر شخص اپنے آبائی علاقے میں قبروں پر حاضری دینے اور دیکھ بھال کے لیے ضرور جاتے ہیں۔اس حوالے سے سفر نامہ نگار اپنے مضمون ''بازیچہ سنگ وتذکرہ جنگ''میں رقم طراز ہیں:

> **''معبد کے مرکزی عمارت کے سامنے پتھروں کے باغیچے کے پہلو میں لوگ یہاں اپنے پیاروں کے نام تلاش کر رہے تھے۔ حاضرین کی کثیر تعداد کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس تاریخ فضائی بمباری سے شہر کا شاید ہی کوئی گھر ہو گا جو اس ہولناک تباہی کے اثرات سے محفوظ و مامور رہا ہو گا''**(۲۲)

جاپانی قوم نے ہیروشیما اور ناگاساکی کی راکھ پر بیٹھ کر گریہ وماتم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود کو اقوام عالم میں صنعتی انقلاب کا لوہا منوایا ہے۔ اس حوالے سے بیگم اختر ریاض الدین ''سات سمندر پار'' میں لکھتی ہیں:

**''دوسری عالمگیر جنگ ۱۹۴۵ء کی شکست جاپان ایشیاء بھی دراصل جاپان کی فتح تھی کہ اگر یہ شکست مخلوط نہ ہوئی تو شاید جاپان کی صنعتیں اتنی تیز رفتاری سے ترقی نہ کر سکتیں''**(۲۳)

جاپان نے دوسری جنگ عظیم کے ملبے سے خود کو نکالا اور معاشی ترقی کے لیے دنیا کے لیے ایک مثال بن گیا۔ ان کی معاشی ترقی کی وجہ سخت محنت اور جاپانیوں کی دیانتداری ہے۔ جاپانی قوم اس قدر دیانتدار ہے کہ وہاں چوری کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ جاپانی قوم اپنے روایتی مکانات کے دروازے پر کنڈی نہیں لگاتے، تالے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جاپان میں کھیتوں اور باغات کے کنارے پھل اور سبزیاں رکھ کر ان پر قیمت کا پرچہ آویزاں کیا جاتا ہے اور پھلوں کے ساتھ ہی پیسوں کا ڈبہ رکھ دیا جاتا ہے لوگ پھل سبزیاں خرید کر قیمت ڈبے میں ڈال دیتے ہیں۔ جاپانی قوم کی دیانتداری کی مثال دنیا میں کہیں نظر نہیں آتی۔

عامر بن علی اپنے مضمون ''جاپانیوں کی دیانتداری'' میں جاپانی قوم کی دیانت کی وجوہات بتاتے ہیں کہ بچوں کو شروع سے ہی سکول میں تربیت دی جاتی ہے کہ اگر کہیں بھی سر راہ کوئی معمولی سی چیز بھی لاوارث پڑی ملتی ہے تو اسے قریب ترین پولیس اسٹیشن میں جمع کروا دیا جائے۔ جاپانی اسی تربیت پر عملدرآمد کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جاپان میں دیانتداری کا معیار زیادہ بلند ہے۔ ''گیشاؤں کے دیس میں'' کے مصنف الطاف شیخ جاپانیوں کی ایمانداری کے بارے کہتے ہیں:

**''جاپانی محنتی، ایماندار اور عزت و ساکھ کا خیال رکھنے والے لوگ ہیں۔ وہ اس طرح کسی کو ''چیٹ'' نہیں کرتے''**(۲۴)

جاپانیوں میں ایمانداری، دیانتداری رچی ہوئی ہے اور اس قوم کی ترقی کا راز بھی دیانتداری اور ان کی سخت محنت ہے۔ عامر بن علی کے بقول جاپانی ترقی کے پیچھے پوری قوم کی انفرادی توجہ، یکسوئی سے کام اور محنت جیسی خوبیاں کارفرما ہیں۔ کوئی بھی قوم بلاوجہ ترقی نہیں کرتی بلکہ اس ترقی کے پیچھے ان کی دن رات کی سخت محنت ہوتی ہے۔ جاپانی قوم اپنے تمام ملازمین کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھتی ہے۔ یہ سماج محنت پر یقین رکھتا ہے یہاں مالک نوکر کا راج نہیں ہے۔ مصنف اپنے مضمون ''محنت میں عظمت ہے'' میں تحریر کرتے ہیں کہ جاپان میں کسی بھی پیشے سے منسلک آدمی کو صاحب کا لاحقہ لگا کر بلایا جاتا ہے مثلاً موچی صاحب، نائی صاحب، مکینک صاحب، خاکروب صاحب اور دھوبی صاحب وغیرہ، اگر صاحب کا لاحقہ ہٹا دیا جائے تو انتہائی بدتمیزی اور بدتہذیبی شمار کی جاتی ہے۔ یہ جاپانی سماج کا رویہ ہے حکومت کا لاگو کردہ قانون نہیں ہے۔ جاپان میں وزیراعظم سے لے کر عام مزدور تک یکساں سلوک کیا جاتا ہے۔ جاپان میں بے روزگار انسان کو حقارت کی نظر

سے دیکھا جاتا ہے معاشرے میں اس شخص سے کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ جاپانی قوم ہمت نہیں ہارتے، کام جیسا بھی ہو مشکل یا آسان، دورانیہ چاہے جتنا بھی طویل ہو یہ جلد اکتاتے اور گھبراتے نہیں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ کام میں مگن رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چند برس قبل جنگ میں شکست کھانے والا جاپان آج الیکٹرونک آلات میں دنیا کا مقابلہ کر رہا ہے۔

مصنف جاپانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جاپانی قوم سائنسی شعور کی مالک، ترقی یافتہ اور جدید قوم ہے۔ جاپانیوں کی جدید ایجاد ڈرون سے اخبارات کی تقسیم ہے۔ اس ڈرون کی ایجاد کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی ناگہانی صورت مثلاً طوفان، جنگ، زلزلہ، سیلاب یا آسمانی آفت آجاتی ہے تو زمینی رابطہ لوگوں کا ختم ہو جاتا ہے تو ایسی صورتحال میں ڈرون سے اخبارات کی ترسیل سب سے مفید ذریعہ ہے۔ عامر بن علی اپنے مضمون ''ڈرون سے اخبارات کی تقسیم'' میں اس کا طریقہ کار بتاتے ہیں:

> **''ڈرون پر اخبار گول رول کی شکل میں لپیٹ کر مومی لفافے میں لوڈ کر دیا جائے گا۔ بغیر پائلٹ کے ڈرون طیارے کے کمپیوٹر میں تمام گاہکوں کے ایڈریس کی تصدیق کر کے اخبار کو ایسے پھینکے گا جیسے جہاز بم گراتا ہے''**(۲۵)

عامر بن علی تحریر کرتے ہیں کہ جاپان نے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے میدان میں بہت ترقی کی ہے۔ جاپان کی بلٹ ٹرین رفتار کے اعتبار سے پوری دنیا میں سب سے زیادہ سرعت رفتار ریل گاڑی ہے۔ جاپان میں اس تیز رفتار ٹرین کے بعد ایک نئے عہد سے متعارف کروایا ہے وہ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم جدید ترین برقی گیٹ ہیں۔ ان گیٹوں پر نصب کیمرے کی مدد سے انسان کے چہرے کی شناخت ہوتی ہے اور تمام معلومات کمپیوٹر کی تصدیق کے بعد گیٹ خود بخود کھل جاتا ہے۔ مصنف کتاب ''ایک نئے عہد کا آغاز'' میں لکھتے ہیں کہ اوساکا کے ریلوے اسٹیشن پر اس نئی دریافت کا افتتاح کیا گیا اور سینکڑوں افراد اور کمروں کی تعداد ''باب چہرہ شناسائی'' یا روشنائی کے دروازے میں سے چند افراد کی آزمائشی آمدورفت کا جائزہ لے رہے تھے جن کا ڈیٹا برقی گیٹ کے کمپیوٹر میں ڈالا گیا تھا اور ریکارڈ درست ہونے کی صورت میں بآسانی ٹرین پکڑ سکتا تھا بلاشبہ جاپانیوں کی ایک بڑی دریافت ہے۔

عامر بن علی جاپانیوں کی ترقی کے حوالے سے نہ صرف بنیادی موضوعات پر بات کرتے ہیں بلکہ عمومی موضوع ''حلال نیل پالش'' کے بارے میں بھی آگاہ کرتے ہیں کہ جاپان میں ''ہینومی گوتو'' نامی خاتون نے حلال نیل پالش ایجاد کر لی ہے اس نیل پالش کو لگا کر خواتین بار بار وضو کر سکتی ہیں۔ یہ نیل پالش وضو کی وجہ سے جلد نہیں اترتی بلکہ ایک ہفتے تک ناخنوں پر اپنے رنگ کا رچاؤ، جاذبیت اور خوبصورتی برقرار رکھتی ہے۔ اس حلال نیل پالش کی ایجاد کی وجہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا خواتین ہیں۔ کیموتھراپی کی وجہ سے ناخن بدرنگ اور بدنماد کھائی دیتے ہیں اس لیے مریض خواتین میں زندگی کے امنگ

ابھارنے کے لیے ہاتھوں کی صفائی کر کے نیل پالش لگا دی جاتی ہے لیکن دستیاب حلال نیل پالش جلد اتر جاتی تھی تو اس جاپانی خاتون نے ایک بہت بڑی جستجو اور تلاش کے ساتھ حلال نیل پالش دریافت کی تاکہ مریض خواتین کی ذہنی صحت کو بہتر بنایا جا سکے۔ جاپانیوں کا یہ خاصہ ہے کہ بہتر سے بہترین کی جستجو میں مگن رہتے ہیں، جاپانی ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔

حال ہی میں جاپان نے ایک نیا قانون نافذ العمل کیا ہے جس کے مطابق کسی بھی چیز کی خریداری کے ساتھ پلاسٹک شاپنگ بیگ کی قیمت ادا کی جائے گی۔ یہ قانون نافذ کرنے کا مقصد ماحولیاتی آلودگی کو کم کرنا ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے مضمون ''مائی بگ چیلنج'' اس قانون کو نافذ کرنے کی وجہ بتاتے ہیں:

**''سمندروں، دریاؤں اور جنگلوں میں پلاسٹک بیگ کی وجہ سے جو آلودگی پھیل رہی ہے اس سے قدرتی مناظر کا حسن نہ صرف گہنا رہ گیا ہے بلکہ آبی جانوروں کی زندگی بھی خطرے سے دوچار ہو رہی ہے۔۔۔ کہیں آبی بہاؤ میں رکاوٹ کا سبب ہے تو کہیں مچھلیاں اس کی وجہ سے موت کا شکار ہو رہی ہیں''** (۲۶)

جاپان میں جیسا بھی قانون نافذ ہو جائے اس کی صد فیصد عملداری یقینی ہوتی ہے۔ جاپانی قوم ''مائی بگ چیلنج'' کے تحت پلاسٹک بیگ کی جگہ کپڑے کا بیگ یا کسی اور میٹریل سے بنائے گئے بیگ کا استعمال کرنے لگے ہیں تاکہ ماحولیاتی آلودگی کو ختم کیا جا سکے۔ جاپانیوں کی خوبیوں کی طرح ان کی خامیاں بھی اپنی انتہا کو پہنچتی ہیں۔ دنیا کے تمام ممالک کی نسبت سب سے زیادہ خودکشیاں جاپان میں ہوتی ہیں یہاں خودکشی کا رواج عام ہے۔ جاپانی قوم کے افراد کسی کام یا منصب میں غلطی یا ناکامی کی صورت میں عذر پیش کرنے کی بجائے معافی کے ساتھ خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔ جاپانیوں میں خودکشی کی یہ رسم ''ہاراکاری'' کہلاتی ہے۔ الطاف شیخ خودکشی کی اس رسم کی تفصیل یوں بتاتے ہیں:

**''جاپان کی روایتی خودکشی کے مطابق چھری سے اپنا پیٹ پھاڑ کر مر جانا۔۔۔''** (۲۷)

عامر بن علی اپنے مضمون ''وزارت تنہائی'' میں آگاہ کرتے ہیں کہ خودکشی کی شرح میں مسلسل اضافے سے نمٹنے کے لیے ایک خصوصی وزارت بنائی گئی ہے اس وزارت کو وزارت تنہائی کا نام دیا گیا ہے۔ وزیر تنہائی کو یہ ٹاسک دیا گیا ہے کہ وہ حکومتی پالیسیوں کے ذریعے شہریوں میں تنہائی اور لوگوں کے درمیان الگ تھلگ رہنے کے رجحان میں کمی لائے اور ساتھ ہی وزیر تنہائی کے پاس بچوں کی پیدائش میں کمی سے نمٹنے کا قلمدان بھی ہے کیونکہ جاپان آبادی میں کمی کا شکار ملک ہے جہاں پاکستان میں بڑھتی ہوئی آبادی ایک اہم مسئلہ ہے وہاں جاپان میں آبادی کی قلت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ پاکستان میں بے شمار مشکلات کے باوجود خودکشی کرنے کی شرح بہت کم ہے جس کی تین بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک تو مذہب اسلام میں خودکشی حرام ہے، دوسرا مشترکہ خاندانی نظام ہے جس کی وجہ سے تنہائی کا شکار ہونے سے بچا رہتا ہے جبکہ جاپان میں اس

تنہائی کے تدارک کے لیے ایک وزارت بنائی گئی ہے جس کے لیے اربوں روپے خرچ کیے گئے ہیں۔ جاپانی ایک مہذب قوم ہیں اور ہر طرح سے یہ قوم مثبت سرگرمیوں کو بڑھانے میں مصروف رہتی ہے۔

جاپانی قوم کی سماجی بنیادیں زراعت کے شعبے سے جڑی ہوئی ہیں اور صنعتی ترقی کے علاوہ زراعت کے شعبے میں بھی جاپانی قوم محنت کش ہے جاپانی کسان زمین کا ایک انچ بھی ضائع نہیں کرتے اور چپے چپے سے چیز اگاتے ہیں۔ پنجاب کی طرح گندم کی کٹائی کے موقع پر جیسے ''وساکھی'' منائی جاتی ہے ویسے ہی بالکل جاپان میں چاول کی کٹائی کے موقع پر تہوار کا منظر نظر آتا ہے گلی گلی میں روایتی لباس پہن کر جلوس نکالے جاتے ہیں، ان جلوسوں میں ڈھول اور بانسری کے ساتھ ساتھ نعرے بلند کیے جاتے ہیں۔ ان جلوسوں کے آگے خوفناک شکل والا بھوت یا کسی جانور کی شبیہ بڑے سائز میں استعمال کی جاتی ہے جس کی وجہ بدروحوں کو ڈرانا ہے کیونکہ جاپانی قوم روحوں اور بھوت پریت پر ابھی بھی یقین رکھتے ہیں۔ ان جلوسوں کے حوالے سے عامر بن علی رقم طراز ہیں:

> **''جلوسوں کی منزل قریب ترین معبد ہوتے ہیں وہاں دعا کر کے شرکاء گھروں کا رخ کرتے ہیں''**(۲۸)

ہندوستان کی طرح جاپان میں چار سماجی درجے تھے پہلا درجہ بادشاہ اور اس کے خاندان کا تھا جو کہ سب سے بلند درجہ تھا۔ دوسرے درجے پر سمورائی اور اس کے جنگجو سپاہی ہوتے تھے۔ تیسرے درجے پر کسان جو سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور چوتھے درجے پر کاروباری لوگ تھے۔ پہلے درجے کے بادشاہ کو زمین پر خدا کا اوتار مانا جاتا تھا اور اس کی پوجا کی جاتی تھی بادشاہ کر عام لوگوں کی طرح مرنے کے بعد بھی جلایا نہیں بلکہ اسے زمین میں دفن کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور اس کے خاندان کو جاپانی مذہبی تکریم اب تک حاصل ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی شکست کے بعد بادشاہ ''ہیرو ہیتو'' نے عوام سے خطاب میں صاف الفاظ میں بیان کیا کہ بادشاہ عام انسان ہیں، یہ عبادت کے لائق نہیں لیکن اس کے باوجود بھی بادشاہ کو ابھی تک بے حد مذہبی تقدس حاصل ہے۔ عامر بن علی ''شہزادی کی شادی'' میں شاہی خاندان کے بارے میں انکشاف کرتے ہیں:

> **''اپنے طویل قیام کے دوران میں نے کسی جاپانی کے منہ سے شاہی خاندان کے متعلق تنقید کا ایک لفظ نہیں سنا، میں نے ہی کیا آج تک میں کسی ایسے آدمی سے زندگی میں نہیں ملا جس نے کبھی کسی جاپانی کے منہ سے قصر شاہی سے متعلق نازیبا یا ناگوار بات سنی''**(۹۲)

جاپانی میں بادشاہ کو مذہبی تکریم حاصل ہے۔ یہاں بادشاہ کے لیے جو لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب خدا کا نمائندہ و خلیفہ یا خدا کی کرسی پر بیٹھا اس پروردگار کا پرتو شخص ہے اور بادشاہ کسی غلطی یا کوتاہی کی صورت میں عوام سے معافی مانگ کر

عہدے سے دستبردار ہو جاتا ہے کیونکہ ان کی خوشی بھی عوام کی ترقی ہے۔اس حوالے سے رفیق ڈوگر ''جاپان نورد'' میں اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہیں:

> **''بہت سے لوگ شہنشاہیت پر اب بھی جان چھڑکتے ہیں اور شہنشاہ کی سب سے بڑی خوشی اپنے عوام کی ترقی اور خوشی ہے''**(۳۰)

حال ہی میں شہنشاہ ''اکی ہیتو'' کے تخت سے دستبردار ہونے کے بعد نئے شہنشاہ کی رسم تاج پوشی کا انعقاد کیا گیا جس میں پاکستان سمیت ۱۸۰ ممالک کے خصوصی نمائندگان نے شرکت کی۔جاپان میں نئے بادشاہ کی تاج پوشی کے ساتھ ہی کلینڈر تبدیل ہو جاتا ہے اور ایک نئے سال کا آغاز ہوتا ہے۔

جاپان میں سیاسی نظام بھی جمہوریت اور بادشاہت کے امتزاج سے ترتیب پایا ہے۔یہ نظام بہت مستحکم ہے اور سیاسی نظام کے استحکام کے اثرات جاپان میں دیکھے جا سکتے ہیں۔جاپانیوں کی ترقی کا راز بھی یہی ہے کہ یہ قوم دنیا کے بہتر سے بہترین نظام سیاست کو اپنی سیاست میں تبدیل کر کے ایک طریقہ زندگی اپنے ملک میں رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جاپانیوں نے دوسری جنگ عظیم کو فراموش کر کے قومی مفاد کی خاطر حال ہی میں امریکا سے دوستی کر لی ہے کیونکہ جاپانیوں کا ماننا ہے کہ تباہی جنگ کے نتیجے میں آئی ہے اس لیے جنگ سے نفرت کرنی چاہیے اور امن کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔اس سلسلے میں مصنف مضمون ''صدر ٹرمپ کا دورہ جاپان'' میں رقم طراز ہیں:

> **''صدر ٹرمپ کی جاپان میں مصروفیات کافی رنگا رنگ قسم کی ہیں۔جاپان کے روایتی کھیل سومو کے چیمپئن شپ فائنل کے فاتح پہلوان کو صدر ٹرمپ کے ہاتھوں سے انعام دلوایا گیا''**(۳۱)

جاپان اور امریکا کے تعلقات دوسری جنگ عظیم کے بعد خوشگوار ہو چکے ہیں لیکن روس اور جاپان کے تعلقات ابھی تک حالت جنگ میں ہیں جس کی وجہ دوسری جنگ عظیم کے دوران روس کے زیر قبضہ چلے جانے والے چار جاپانی جزائر ہیں۔روس نے دوسری جنگ عظیم کے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے جاپان کے چار جزائر پر قبضہ جما لیا۔سفر نامہ نگار کے مطابق روس اور جاپان کے تعلقات مثبت ہونا بہت مشکل ہیں کیونکہ وہ ان جزائر کا ایک انچ بھی جاپان کو نہیں دیں گے روس ان جزائر پر اپنا عسکری اثر و رسوخ دن بدن بڑھا رہا ہے۔ہر ملک اپنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتا ہے نہ ہی کوئی دیس مستقل دوست ہے اور نہ ہی کوئی ملک مستقل دشمن رہتا ہے مشترکہ مفادات مشترکہ دشمن ممالک کو قریب کر دیتے ہیں اور بعض اوقات دوسری کی وجہ بھی بنتے ہیں جیسا کہ پاکستان کی چین کے ساتھ دوستی کی وجہ بھارت سے مشترکہ دشمنی ہے اور یہ تعلقات معاشی لحاظ سے سب سے اہم ہے۔معیشت کی وجہ سے ہی امریکا اور چین کی باہمی مخاصمت کے باوجود

تعلقات بہتر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دنیا بالخصوص مغربی دنیا نے چین کے معاشی ابھار سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔اس بارے میں عامر بن علی ''چین مخالف اتحاد''میں آگاہ کرتے ہیں:

**''آسٹریلیا، بھارت اور چین کا معاشی انحصار چین پر بہت زیادہ ہے چین جاپان کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار ہے۔۔۔اور بھارت کا بھی سب سے بڑا تجارتی ساجھے دار چین ہی ہے''**(۳۲)

چینی قوم ہمت نہیں ہارتی اسی وجہ سے معاشی لحاظ سے مضبوط قوم ہے چینی قوم کی طرح جاپانی قوم بھی سخت جان ہے اپنا کام ہر کوئی خود کرنا پسند کرتا ہے یہاں تک کہ جاپان میں لفٹ تک مانگنے کا رواج نہیں ہے۔ عامر بن علی ''بیک پیکر صحافی'' میں ایک دلچسپ واقعے کے ذریعہ صحافت کے طالبعلم کی روداد سناتے ہیں کہ عموماً شرمیلے پن کی وجہ سے جاپانی لفٹ نہیں مانگتے لیکن صحافت کا طالبعلم لفٹ لے کر میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھتا ہے اور بتاتا ہے کہ تجربے اور ذہنی وسعت کے لیے وہ بیس لوگوں سے لفٹ لے کر یہاں پہنچا ہے تاکہ وہ مختلف لوگوں سے انٹرویو لے جب وہ عملی میدان میں اترے تو وہ مکمل تیار ہو اور یہی محنت ہی جاپانیوں کی کامیابی کا راز ہے۔ یہ طالب علم بیس سال کی عمر میں یونیورسٹی کے بعد میوزیکل گروپ میں پارٹ ٹائم نوکری بھی کرتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ طالب علم کا مستقبل روشن ہے کیونکہ کامیابی اس قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہے جو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ جاپانی معاشرے میں کوئی بھی طبقہ اور کسی بھی پیشے سے منسلک افراد سب یکساں سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔ عامر بن علی چونکہ خود ایک صحافی ہے اس لیے صحافت کے ذریعے اس کی مثال دیتے ہیں کہ پاکستان میں اگر کوئی صحافی دہشتگردوں کے ساتھ ٹھہرا ہو تو اس کے عزیز و اقارب اس کی واپسی پر فخر کریں گے وہ سب کی نظروں میں ہیرو ہوگا لیکن جاپان میں اس کے بالکل برعکس ہے صحافی کو خود خبر بننے کی بنا پر ساری قوم کے سامنے معافی مانگنی پڑتی ہے اور سب معیوب نظروں سے دیکھتے ہیں کیونکہ اخبار نویس کا کام خبر ڈھونڈ کر شائع کروانا ہے صحافی کا خود خبر بننا ایک منافی رویہ ہے۔اس بارے میں ''صحافی خود خبر نامہ''میں مصنف کتاب کہتے ہیں:

**''چونکہ یہ معاشرے کی ذہنیت ہے کہ ایسے صحافی سماج کو نقصان پہنچاتے ہیں، لہٰذا قصوروار ہیں''**(۳۳)

جاپانی قوم ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی ہے اگر کاموں سے فارغ ہو جائے تو یہ قوم کتاب بینی میں مصروف ملتی ہے۔ سفر کے دوران بھی کتب بینی کے شائقین ہیں۔ کتاب بینی کے شائقین کے سبب دنیا میں کتابوں کی فروخت کا سب سے بڑا مرکز ٹوکیو میں واقع ہے جس میں تقریباً دس لاکھ سے بھی زائد عنوانات پر کتابیں موجود ہیں۔ جاپان کے ''کھاندا'' پرانی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی بہت سی دوکانیں ہیں۔ سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی فروخت کے لیے تنظیم فروشوں نے ایک کتابچہ چھاپا گیا ہے جو کہ پورے جاپان میں ہر بکسٹال پر موجود ہے۔

عامر بن علی جاپانیوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ جاپانی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جیسے جسم کو اچھی خوراک ضروری ہوتی ہے اسی طرح دماغ کو بھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت مطالعے سے پوری کی جاتی ہے۔ کتاب سے دوستی کی جائے تو معاشرے کی بہت سے خامیاں ختم ہو سکتی ہیں اور بہت سی آسانیاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ کتاب ہی کے ذریعہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جانا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں ضیاء شاہد کی کتاب ''پاکستان کے خلاف سازش'' منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں پاکستان کے خلاف سازش کرنے والوں کے بارے میں تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے اس لیے یہ کتاب تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ضیاء شاہد کی حیرت مندی ثابت کرتی ہے۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے پاکستان، جاپان، نیویارک اور لندن میں تعارفی تقاریب منعقد ہو چکی ہیں، بلاشبہ ضیاء شاہد نے اس کتاب کو تحریر کر کے حقیقی سپوت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ مصنف کتاب ضیاء شاہد کی کتاب ''پاکستان کے خلاف سازش'' کی رونمائی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> **''پاکستان پر احسان کہنے سے جھجک رہا ہوں کیونکہ ملک تو ماں کی طرح ہوتا ہے اور ماں پر تو کوئی بھی خدمت احسان نہیں ہوتی، مگر ''پاکستان کے خلاف سازش'' تحریر کر کے ضیاء شاہد نے دھرتی کے حقیقی سپوت ہونے کا ثبوت ضرور دیا ہے''**(۴۴)

پاکستان میں جہاں اس وطن کے خلاف سازشیں کرنے والے موجود ہیں وہاں ان سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے ضیاء شاہد جیسے محب وطن سپوت اور لکھاری بھی موجود ہیں۔

عامر بن علی ضیاء شاہد کی کتاب کے بعد ایسے ہی نامور ادیب، صحافی، صوفی شاعر اور سفر نامہ نگار ''ماتسو باشو'' جن کی تخلیقات کا ترجمہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں کہ گہرائی، خیال، فن اور پختگی کے اعتبار سے ''ماتسو باشو'' دنیا کے بڑے شعراء کرام کی فہرست میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک لافانی ہائیکو بھی لکھی جو عالمی ادب کا قیمتی اثاثہ ہے۔ ملاحظہ ہو:

**ایک ہی چھت کے تلے**
**طوائفیں بھی ہوتی ہیں**
**جنگلی گھاس اور چاند**(۴۵)

عامر بن علی نے جاپان کی زندگی کا سرسری مشاہدہ نہیں کیا بلکہ جاپانی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے اسے دیکھا، پھر تحریر کر کے اپنا تجربہ خود آزمایا۔ مصنف کتاب کا جاپان کے بارے میں تجزیے کے مطابق جاپان کی موجودہ صورتحال بہترین ہے۔ مجموعی طور پر جاپانی قوم شرمیلی اور ایماندار ہے۔ معاشی نظام مستحکم ہے اور روزگار کے مواقع عوام الناس کے

لیے عام ہیں۔ جرائم کی شرح بہت کم ہے۔ جاپانی قوم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ صبر و تحمل، بردباری، برداشت اس قوم کا خاصہ بن گیا ہے۔

عامر بن علی کی تصنیف ''نگر نگر اک نظر'' کے حصہ سوم کا آغاز فیض احمد فیض کے خوبصورت شعر کے مصرعے سے کیا گیا ہے۔

؎ چلو آؤ تو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں
یہ مزار اہل صفا کے ہیں، یہ ہیں اہل صدق کی تربتیں (۳۶)

دراصل یہ ایک دکھ کی کیفیت ہے۔ان لوگوں کی یادگاری فہرست شامل کی ہے جو لوگ بچھڑ گئے مصنف کتاب نے مضامین قلمبند کرکے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں جن میں منو بھائی، مشکور، میجر منصور، مشتاق احمد یوسفی، سید علی رضا عابدی، منیر نیازی، مظہر بخاری، احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر فرتاش سید کی یادوں کا خزانہ ہے جو ان مضامین میں بکھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

پہلا مضمون منو بھائی کے بارے میں ''وہ مرد قلندر چھوڑ گیا'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ منو بھائی ۶ فروری ۱۹۳۳ء کو وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ان کا اصل نام ''منیر احمد قریشی'' تھا جو بعد میں احمد ندیم قاسمی کے کہنے پر منو بھائی رکھا۔ منو بھائی کالم نویس، صحافی، شاعر اور پاکستان کے عظیم مصنف تھے۔انہوں نے پیشے کے لحاظ سے آغاز اخبار میں بطور مترجم کیا مگر بعد میں ڈرامہ نگار بھی بن گئے۔ منو بھائی کا ڈرامہ نگار کے طور پر سب سے مشہور ٹی وی ڈرامہ ''سونا چاندی'' ہے جو ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔اس زمانے میں ''سونا چاندی'' کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ اس ڈرامے میں خاتون کو مرد پر حاوی دکھایا گیا جو اس وقت خلاف معمول بات تھی۔اس کے علاوہ اور بھی مقبول ڈرامے مثلاً گمشدہ، دشت، خوبصورت، سلسلے وار کھیل اور آشیانہ وغیرہ بھی لکھے۔ ڈراموں کے ساتھ ساتھ ایک دستاویزی فلم بھی لکھی۔ منو بھائی پاکستان کے سب سے نمایاں، نامور اور مستقل مزاج مصنفین میں سے ایک رہے ہیں۔ان کے ڈراموں کے کردار گلی محلوں کے حقیقی کردار ہوتے تھے۔ ان کے ڈراموں میں نہ کوئی محل نما گھر، نہ ہی لمبی لمبی کاریں اور نہ ہی انگریزی بولنے والے ماڈرن کردار ہوتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کے ڈرامے دیکھ کر لوگ اش اش کر اٹھتے تھے۔

منو بھائی ادبی، علمی اور تخلیقی شخصیت کے ساتھ ساتھ ایک ایماندار، سچے، کھرے اور سادہ انسان بھی تھے آپ دوستوں کے دوست اور محبت کرنے والے انسان تھے آپ دوسروں کے درد کو سمجھتے تھے۔انہوں نے روزنامہ جنگ میں اپنے کالم ''گریبان'' کے ذریعے لوگوں کے رویوں اور معاشرے کے برائیوں کے بارے میں قلمبند کیا۔

اس کے علاوہ ان کی مشہور تصانیف میں پنجابی شاعری کا مجموعہ ''اجے قیامت نئیں آئی''، منتخب کالموں کا مجموعہ ''جنگل اداس''، فلسطین، محبت کی ایک ایک نظمیں اور انسانی منظر نامہ (تراجم شامل) ہیں۔ حکومت پاکستان نے ۲۰۰۷ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔

منو بھائی ۸۴ سال کی عمر میں ۱۹ جنوری ۲۰۱۸ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی زندگی کا آخری حصہ انہوں نے تھیلیسیمیا، ہیمو فیلیا اور بلڈ کینسر جیسے امراض والے بچوں کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے انہی امراض میں مبتلا بچوں کے لیے ایک ادارہ بھی قائم کیا جو اس بیماری میں مبتلا بچوں کے لیے آج بھی نگہداشت کر رہا ہے۔ ۲۳ مارچ ۲۰۱۸ء کو انہیں ان کی نمایاں ادبی خدمات پر بعد از مرگ ہلال امتیاز سے نوازا گیا۔ منو بھائی فرماتے ہیں:

ے جو توں چاہنا ایں، اونئیں ہونا
ہونئیں جاندا کرنا پیندا
عشق سمندر ترنا پیندا
حق دی خاطر لڑنا پیندا
سکھ لئی دکھ وی جھلنا پیندا
جیون دے لئی مرنا پیندا(۳۷)

عامر بن علی اپنے مضمون ''وہ مرد قلندر چھوڑ گیا'' میں بتاتے ہیں کہ منو بھائی پاکستان کو ایک ایسا ترقی یافتہ اور جدید ملک بنانا چاہتے تھے جہاں عدالتی انصاف کے ساتھ ساتھ معاشی انصاف بھی ہو، ان کا جمہوریت پر کامل یقین تھا۔ منو بھائی خود بھی ہمیشہ مسکراتے رہے اور مسکراہٹیں بکھیرنے کی کوشش کرتے رہے اور خاص طور پر بیمار بچوں کی مسکراہٹ دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ وہ ایک باکردار اور خوددار انسان تھے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''منو بھائی کے ارد گرد بہت سے صحافی اور ان میں سے کئی جونیئر قلم کار حکمرانوں سے مفادات اٹھا کر ارب پتی بن گئے مگر انہوں نے کبھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا، چاہے اس کی قیمت جو بھی چکانا پڑی، ریواز گارڈن لاہور کے جس گھر سے ان کا جنازہ اٹھایا گیا، اس مکان کے باہر انہیں پلستر کروانے کے لیے بیس سال کا عرصہ انتظار کرنا پڑا''(۸۳)

منو بھائی کی شاہکار تصنیف ''جنگل اداس ہے'' میں انہوں نے بڑی عمدگی اور خوبصورتی سے دنیا سے رخصت ہونے والی شخصیات کی زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ اپنی تحریروں کے ذریعے منو بھائی ہمیشہ زندہ رہ گئے لیکن ان کے جانے سے ہمارا معاشرہ ایک بہت اچھے اور بڑے انسان سے محروم ہو گیا ہے۔

مصنف کتاب نے دوسرا مضمون ''مشکور حسین'' کے بارے میں ''مشکور حسین یاد کی یادیں'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ مشکور حسین اردو کے نامور انشائیہ نگار، نقاد، ادیب، مزاح نگار، ماہر تعلیم اور نامور شاعر ۱۱ ستمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ آپ قصبہ بڑول ء، ضلع مظفر نگر، یوپی، بھارت کے سادات خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مشکور حسین کے والد کی ملازمت کے سبب ان کی تعلیم و تربیت ضلع حصار مشرقی پنجاب میں ہوئی۔ آپ کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ بی اے کے امتحان کے بعد ایک ہفتہ وار اخبار (پکار) کی ادارت سنبھالی، پھر کچھ عرصہ کے لیے رائٹنگ کے محکمہ میں بطور انکوائری آفیسر کام کیا لیکن جلد ہی یہ محکمہ چھوڑ کر ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول ڈیوالی میں انگریزی کے معلم بن گئے۔ ابھی ایک ماہ سے بھی کم عرصہ ہوا تھا کہ ۱۹۴۷ء (اگست) میں مسلمانوں کا بے دردی سے قتل عام شروع ہو گیا تو مشکور حسین کے والد کے ساتھ ساتھ ماں، بیوی، بیٹی، بھائی اور دوسرے قریبی عزیز شہید ہوئے اور ان کو مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ اتنی بڑی قربانی کے بعد نومبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان آئے۔ یہاں اگر کچھ عرصہ ڈائریکٹر تعلیم لاہور کے دفتر میں بطور کلرک کام کیا اس کے بعد ایم۔ اے اردو اور فارسی کیا اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ اردو سے منسلک ہو گئے۔ آپ کی تصانیف ''دشنام کے آئینے میں، جوہر اندیشہ، آزادی کے چراغ، علامہ اقبال کے عوامی افق، میر بلا نوش (میر تقی میر)، برداشت، غالب بوطیقا، اشعار غالب کی تفہیم، غالب کا جمالیاتی شعور، غالب کا ذوق الہیات، غالب کی طبع نکتہ جو، گونگی نظمیں، ممکنات انشائیہ، میر انیس کی شاعرانہ بصیرت، بات کی اونچی ذات، اپنی صورت آپ، لاحول ولا قوۃ، ستارے چہچہاتے ہیں، مطالعہ انیس کے نازک مراحل، میں اردو ہوں، غالب نکتہ جو، وقت کا استخارہ، ستم ظریف، ممکنات انشائیہ، پرستش (شاعری)، پرداخت (شاعری)، برداشت (شاعری)، عرضداشت (شاعری)، نگہ داشت (شاعری) اور ملا صدرا اور ان کا فلسفہ (تجزیہ اور حیات)'' شامل ہیں۔ مشکور حسین شاندار اسلوب کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ آپ نے زندگی کے مختلف ادوار میں بطور چیف ایڈیٹر ہفت روز ''پکار''، ایڈیٹر ماہنامہ ''زعفران''، لاہور ایڈیٹر ماہنامہ ''چشمک'' بھی کام کیا۔ آپ کو حکومت پاکستان نے علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۹۹ء میں صدارتی تمغہ حسن اور ۲۰۱۱ء میں ستارہ امتیاز سے نوازا۔ آپ ۱۱ نومبر ۲۰۱۷ء کو ۹۲ سال کی طویل عمر کے بعد وفات پا گئے۔ بقول فیض احمد فیض:

**ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن**
**اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے** (۳۹)

مصنف کتاب نے اپنی تصنیف کے حصہ سوم میں جس تیسری شخصیت کا ذکر کیا ہے وہ پاک فوج کے بہادر سپوت میجر منصور خان ہیں۔ آپ علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی والدہ شعر و ادب سے بڑا لگاؤ رکھتی تھیں۔ میجر منصور خان کی زندگی کا مقصد یہی تھا کہ جس دھرتی اور قوم نے ہم ان گنت احسانات کیے ہیں اس کی خدمت کی جائے۔ آپ نے ملک کی محبت میں سرشار ہو کر اپنی اہلیہ کا انتخاب بھی پاک فوج میں خدمات سرانجام دینے والی ایک خاتون کا کیا، ان کی اہلیہ

بھی پاک فوج میں میجر تھیں۔ان کی اولاد میں ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔میجر منصور خان جیسے صاحب ایمان ہوتے ہیں جن کا مقصد اللہ کی راہ میں شہادت کے حصول کے سوااور کچھ نہیں ہوتاہے انہیں دنیا کی مال و دولت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا بلکہ زندگی کا مقصد ہی ملک وملت کی خاطر ڈٹ جاناہے۔علامہ اقبال نے کیاخوب کہا:

؎ شہادت ہے مطلوب ومقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی(۴۰)

میجر منصور خان کی شہادت کے بارے سفر نامہ نگار کہتے ہیں:

**''پاکستان میں دہشتگردی کے ناسور کو ختم کرنے کے لیے میجر منصور خان نے جو شہادت دی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعاہے کہ وہ اس پاک سرزمین پر امن قائم کرنے میں مددگاراور فیصلہ کن ثابت ہو جائے۔''**(۴۱)

ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ وطن پر جان نچھاور کرنے والے میجر منصور خان سمیت جتنے بھی سپاہی شہید ہوئے ہیں ان کی شہادتیں رائیگاں نہیں جائیں گی،ان کے خون سے فتح ونصرت کے پھول کھلیں گے اور پاکستان میں مستقل نوعیت کا امن قائم ہوگا۔

زیر تحقیق تصنیف کے حصہ سوم میں میجر منصور خان کے بعد مشتاق احمد یوسفی کے بارے میں لکھا گیا مضمون جس کا عنوان ''مشتاق احمد یوسفی کا عہد'' ہے۔مشتاق احمد یوسفی ۱۹۲۳ء میں راجھستان کے شہر جے پور میں پیدا ہوئے۔انہوں نے اپنی تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی مگر پاکستان میں پہلی تحریر حنیف رامے کے رسالے ''سویرا'' میں شائع ہوئی جس کا عنوان ''صنف لاغر'' تھا۔آپ پاکستان بننے کے بعد ہجرت کرکے کراچی قیام پذیر ہوگئے اور اپنی ساری زندگی اسی شہر میں گزاردی۔کراچی کے موسم کے متعلق آپ کی رائے تھی کہ اس فضا میں صرف تاجر اور مہاجر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔آپ کی تصانیف میں ''چراغ تلے، حاکم بدہن، زر گزشت، آب گم اور شام شعر یاراں'' شامل ہیں۔اردو مزاح نگاری میں انہوں نے نئے اور بلند معیارات قائم کیے ہیں۔اس اعلیٰ معیار کی اردو زبان میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ بنک کی ملازمت میں گزارہ جس کے تجربات کا نچوڑ ''زر گزشت'' کی صورت میں منظر عام پر آیا۔کسی حد تک ''زر گزشت'' کو سوانح حیات بھی کہا جاسکتا ہے۔ان کی تحریر ''شام شعر یاراں'' میں قائداعظم پر لکھا گیا مضمون ایک مثبت قدم تھا جو تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہنے والی تحریروں میں شامل ہے۔اس مضمون میں قائداعظم محمد علی جناح کو جیتے جاگتے، باتیں کرتے، عدالت میں دلائل دیتے یوسفی کی آنکھوں سے قاری دیکھ سکتا ہے۔انہوں نے اپنی ساری زندگی اپنی توجہ تخلیق پر مرکوز رکھی۔آپ شہرت سے بے نیاز شخص تھے۔سماجی روابط اور شہرت ان کی ترجیح نہیں رہی۔ مشتاق احمد یوسفی بہت بڑے انسان، باصلاحیت فنکار اور درد دل رکھنے والے ہمدرد انسان تھے۔ان کا طرز تحریر منفرد اور

موضوعات بے مثال تھے۔ بلاشبہ مشتاق احمد یوسفی کی موت سے اردو ادب ایک ایسے لکھاری سے محروم ہو گیا ہے جسے عالمی ادب کے کسی بھی مقابلے میں فخریہ طور پر پاکستان کی نمائندگی کے لیے پیش کیا جا سکتا تھا۔

عامر بن علی نے اپنے مضامین میں نہ صرف ادباء یا شعراء کو خراج تحسین کیا ہے بلکہ سیاست سے تعلق رکھنے والے سید علی رضا علی عابدی کے قتل کا بہت دکھ سے اظہار کرتے ہیں۔ اس مضمون کا عنوان ''پاش پاش ہو کے بکھرہ ہوا وہ لہو'' ہے۔ مصنف کتاب لکھتے ہیں سید علی رضا عابدی کو ان کے گھر کی دہلیز پر کرسمس کے دن قتل کر دیا گیا۔ ان کا تعلق ایک صاف ستھرے، تعلیم یافتہ، دلیر، مہذب اور سیاستدان خاندان سے تھا۔

سید علی رضا عابدی کی والدہ محترمہ صاحب دیوان شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''زندان ذات'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے شعری مجموعے کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

ے دار ہو کہ خنجر ہو یا کہ زہر کا پیالہ
ان گنت سزائیں ہیں جرم اک کہن تنہا(۲۴)

اُم سارہ جو سید علی رضا عابدی کی والدہ کی تصنیف سے حوصلہ مند اور باہمت والدہ کے نظریات، سوچ و فکر اور شخصیت کو جان سکتے ہیں۔ ان کی شاعری اردو ادب کے جدید و قدیم موضوعات کا حسین امتزاج ہے کہیں اردو شاعری کی قدیم صنف سہرا ملتی ہے تو کہیں جدید نظمیں ''چشم دید''، جیسی بھی لکھیں۔ ان کی شاعری اپنے معاشرے اور عہد و زمان سے "باخبری کی ایک عمدہ مثال ہے۔

ے دوڑ ہے مشینوں کے جگمگاتے صحرا میں
اور اک طرف لپٹی خواہش وطن تنہا(۲۴)

اُم سارہ ایک باہمت خاتون ہے۔ بیٹے کی موت کا دکھ تو ضرور ہے لیکن ان کا حوصلہ چٹان جیسا ہے۔ بیٹے کی وفات کے بعد ان کی والدہ نے کراچی پریس کلب کے باہر اظہار یکجہتی اور افسوس کرنے والوں کی یاد میں شمعیں روشن کرنے والوں سے خطاب کیا۔ اس خطاب میں انہوں نے جس دلیری اور جرات مندی سے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا وہ عام انسان نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ اُم سارہ ایک عظیم اور دلیر خاتون ہیں لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی سید علی رضا عابدی کے قاتلوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

دنیا میں ایک شاعر، مصنف یا ادیب وغیرہ کا اصل مقام ان کی تصانیف کی وجہ سے ہی ملتا ہے جو ان کے بچھڑنے کے بعد بھی اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ ایسے ہی نامور اردو اور پنجابی کے عہد ساز شاعر منیر نیازی تھے۔ آپ اپنی شخصیت، ذات اور شاعری کی طرح اپنا مزاج بھی الگ رکھتے تھے۔ ان کا ظاہر اور باطن اجلا اجلا اور روشن تھا۔ بیسویں صدی کے مقبول ترین شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ منیر نیازی کا اصل نام منیر احمد تھا۔ آپ ۱۹ اپریل ۱۹۲۸ء کو مشرقی پنجاب کے

ضلع ہوشیار پور کے قصبے خانپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم خانپور سے حاصل کی۔ پاکستان کے قیام سے پہلے ساہیوال میں منتقل ہو گئے اور میٹرک وہیں پر کیا، پھر صادق ایجرٹن بہاولپور کے بعد لاہور ہجرت کر گئے اور یہاں سے بی۔اے پاس کیا۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں ہجرت کا استعارہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ منیر نیازی اپنے سے بڑا کسی کو شاعر نہیں مانتے تھے۔ مصنف کتاب منیر نیازی کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہیں:

**''ان کے ادبی نظریے کا خلاصہ پیش کیا جائے تو یوں تھا کہ کائنات کی تاریخ میں آج تک ایک ہی شاعر ہوا ہے اور اس کا نام منیر نیازی ہے۔ یہ بات ان کے منہ سے جچتی بھی تھی، چونکہ وہ تھے بھی فقید المثال، نابغہ روزگار''**(۴۴)

بلاشبہ منیر نیازی عہد حاضر کے بہترین شاعر تھے۔ انہوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ بہت سے فلمی گیت بھی لکھے۔ زندگی کے آخری حصے میں تخلیقی عمل رک گیا تھا اور کوئی ایک شعر بھی نہیں لکھا۔ ۱۹۹۲ء میں انہیں ان کی ادبی خدمات پر ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' اور ۲۰۰۵ء میں ستارہ امتیاز سے نوازا گیا۔

منیر نیازی غموں دکھوں اور المیوں کو سینے میں چھپا کر اور ہر کسی سے وفائیں تقسیم کرتے ہوئے ۲۶ دسمبر ۲۰۰۶ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

عامر بن علی منیر نیازی کے بعد مظہر بخاری کے بارے مضمون قلمبند کرتے ہیں جس کا عنوان 'مظہر بخاری۔ شمع محفل تھا وہ شخص'' ہے۔ مظہر بخاری شعر و ادب کا ایسا جاوداں حوالہ ہے جن کے بغیر ہمارے دبستان کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ آپ میٹھے شاعر اور عمدہ نثر نگار تھے۔ جب کوئی بھی شاعر محبت اور وفا کے شعر کہتے ہیں تو ضروری ہوتا ہے کہ جس محبت کے پرچارک ہیں وہ ان کی ذات اور شخصیت کا حصہ ہو ورنہ سارا تخلیقی عمل مشکوک ہے۔ مظہر بخاری ان اہل قلم میں سے تھے جو سراپا محبت تھے۔ ان کی شاعری اور نثر اور ان کے وجود سے تمام عمر اعلیٰ اقدار و حسن سلوک کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ مظہر بخاری بہت سخی انسان تھے۔ دوستوں کی خاطر مدارت میں ہمیشہ حاضر رہتے تھے۔ اپنی ساری زندگی ادیبوں، شاعروں کو جمع کر کے شہر میں ادبی و تخلیقی فضا قائم کرنے کے لیے کوشاں رہے، درد دل رکھنے والے انسان تھے، دوسروں کے درد اور تکالیف کو محسوس کرتے تھے ذاتی دکھ اور درد کو ہمیشہ خندہ پیشانی سے اٹھاتے۔ مظہر بخاری کی اچانک وفات سے ادب میں جو خلا پیدا ہوا اسے ہمیشہ محسوس کیا جائے گا۔

**بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی**
**اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا**(۴۵)

''احمد ندیم قاسمی۔ تجھ سا کہاں سے لائیں'' کے عنوان سے لکھا گیا مضمون عامر بن علی کی احمد ندیم قاسمی سے خاص محبت اور عقیدت کا ثبوت ہے۔ احمد ندیم قاسمی پاکستان کے ایک معروف ادیب، افسانہ نگار، صحافی، مدیر، شاعر اور کالم نگار ۲۰

نومبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام ''احمد شاہ'' تھا اور ''ندیم'' ان کا تخلص تھا اور اپنے پر دادا کی نسبت سے ''قاسمی'' کہلائے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں انگہ ضلع خوشاب سے ہی حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد ۱۹۲۳ء میں چچا کے پاس چلے گئے۔ شیخوپورہ کے گورنمنٹ اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد بہاولپور کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ چچا کے پاس آنے کے بعد علمی، مذہبی اور شاعرانہ ماحول میسر آیا۔ انھوں نے ابتدائی زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کیا۔ قاسمی صاحب جب اپنی گاؤں سے لاہور پہنچے تو ان کے پاس رہنے کے لیے ٹھکانہ نہ تھا کئی دن فاقہ کشی بھی کی لیکن اپنے احوال کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ تب انہی دنوں ان کی ملاقات اختر شیرانی سے ہوئی۔ اختر شیرانی نے قاسمی صاحب کی کافی حوصلہ افزائی بھی کی جس کی وجہ سے شیرانی صاحب کے بہت قریب کر دیا اور ان کی شاعری اور شخصیت سے لگاؤ احمد ندیم قاسمی کا آخر تک رہا۔ اسی دوران ان کی ملاقات امتیاز علی تاج سے ہوئی، انھوں نے اپنے ماہنامہ رسالے ''پھول'' کی ادارت کی پیش کش کی جو قاسمی صاحب نے قبول کر لی جو بچوں کا رسالہ تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک سال ادارت کے وقت میں بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں۔ بہت سی جگہ ملازمت کے بعد ہاجرہ مسرور کے ساتھ مل کر ایک نئے ادبی رسالے ''نقوش'' کی بنیاد رکھی جو ایک کامیاب رسالہ ثابت ہوا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی شاعری کی ابتداء ہوئی جب مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر پہلی نظم شائع ہوئی۔

قاسمی صاحب کی ۱۹۳۷ء تک بہت سی نظمیں شائع ہوئیں جس کی بنا پر انہیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں ''چوپال، بگولے، طلوع و غروب، گرداب، سیلاب، آنچل، آبلے، آس پاس، درودیوار، سناٹا، بازار حیات، برگ حنا، سیلاب و گرداب، گھر سے گھر تک، کپاس کا پھول، نیلا پتھر، کوہ پیما، پت جھڑ اور اس راستے پر'' شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں دھڑکنیں، رم جھم، جلال و جمال، شعلہ گل، دشت وفا، محیط، دوام، لوح خاک اور ارض و سماء شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بسیط، ندیم کی نظمیں، ندیم کی غزلیں، ندیم بیت بازی، میرے ہم قدم، کیر کیاری، انگڑائیاں اور پاکستان کی لوک کہانیاں بھی تحریر کیں۔

قاسمی صاحب نے بچوں کے لیے تین ٹانک، دوستوں کی کہانیاں، نئی نویلی کہانیاں جیسی اور بہت سی دلچسپ تصانیف قلمبند کیں۔ انھوں نے صحافتی سرگرمیوں میں ہفت روزہ پھول، تہذیب نسواں، ماہنامہ ادب لطیف، سویرا، سحر لاہور، روزنامہ امروز، ماہنامہ فنون، روزنامہ امروز لاہور میں کالم 'حرف و حکایت' بھی لکھے۔ اخبار کا ایڈیٹر بننے پر کالم ''پنج دریا'' بھی لکھا۔ روزنامہ امروز سے علیحدہ ہونے پر روزنامہ ہلال پاکستان میں پنج دریا اور موج دریا کے نام سے فکاہیہ کالم نویسی کی۔ روزنامہ جنگ میں بھی کافی کام کیا اور ساتھ ساتھ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ قاسمی صاحب نے ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی لیکن افسانے اور غزل کے حوالے سے بہت شہرت حاصل کی۔ انہیں ان کی ادبی خدمات پر بہت سے انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں آدم جی ادبی انعام برائے دشت وفا، ۱۹۷۶ء میں آدم جی انعام برائے محیط، ۱۹۷۹ء میں

آدم جی انعام برائے دوام، ۱۹۶۸ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی، ۱۹۸۰ء میں پاکستان کا اعلیٰ ترین سول اعزیز ستارہ امتیاز، ۱۹۹۷ء میں کمال فن ادبی ایوارڈ اور ۲۰۰۷ء میں علامہ اقبال ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مصنف کتاب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ انہیں احمد ندیم قاسمی کے شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ایسی شاندار، بامقصد، بامعنی زندگی گزارنے والی شخصیت چراغوں کے اندھیرے مٹاتی اور رہنمائی کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ تبسم رہتا تھا، دوسروں سے محبت کرنے والے انسان تھے۔ آزادی صحافت اور جمہوریت کی بالادستی کے لیے کئی بار انہیں جیل جانا پڑا۔ انہوں نے خود ہی حریت فکر کا راستہ منتخب کیا، مجبوری نہ تھی۔ انہیں شاعری میں ظفر علی خاں، اقبال، اختر شیرانی کی تحریریں زیادہ پسند تھیں جبکہ افسانے میں منشی پریم چند کے عاشق تھے۔

قاسمی صاحب ایک سچے مسلمان تھے۔ زندگی میں کبھی بھی شراب نوشی نہیں کی۔ زندگی کے آخری حصے میں بھی ذہنی اور جسمانی طور پر تندرست تھے۔ انہیں منیر نیازی ''سدابہار بوڑھا'' کہتے تھے۔ زندگی کے آخری حصے میں بھی ایک عجیب وقار، طنطنہ اور رعب تھا، زندگی میں بے شمار مشکلات کا بہادری سے سامنا کیا۔ عامر بن علی احمد ندیم قاسمی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> **''ایک محنت کش اور غیرت مند ماں کی اولاد تھے جو جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی، انا اور غیرت کے ساتھ مفلسی کے مشکل دن بچوں کے ساتھ کاٹنے والی اس عورت کی ساری خوبیاں ان کے بیٹے میں بھی نظر آتی تھیں، دنیا جسے آج احمد ندیم قاسمی کے نام سے جانتی ہے''(۴۶)**

۹۰ سال کی طویل عمر کے بعد ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء کو مختصر علالت کے بعد احمد ندیم قاسمی انتقال کر گئے لیکن اردو کا بے بدل شاعر اور سب سے بڑے افسانہ نگار لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہ گئے۔ احمد ندیم قاسمی کے شعر کے ساتھ انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

**کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا**
**میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا**(۴۷)

زیر تحقیق کتاب ''نگر نگر اک نظر'' کے آخری مضمون کا عنوان ''شیشوں کا مسیحا رخصت ہوا'' جو کہ ماہر تعلیم، شاعر، نوجوان، ادیب و دانشور ڈاکٹر فرتاش سید کے بارے میں لکھا گیا ہے جن کا کرونا کے باعث انتقال ہوا۔ ان کے جانے سے جو خلاف پیدا ہوا ہے وہ کبھی بھی پورا نہیں ہو سکے گا۔

**سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں**
**خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں**(۴۸)

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو عامر بن علی اپنی تصنیف ''نگر نگر اک نظر''میں زندگی کی عکاسی خوبصورت الفاظ اور سچے جذبات کے ساتھ کرتے ہیں۔ اپنے سفر ناموں کے بیان میں عامر بن علی اس لیے کامیاب نظر آتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کے ساتھ دوسرے ممالک کی تہذیب و ثقافت کو گہرائی سے بیان کرتے ہیں اور یوں ان کی دلفریبی اور اسلوب کی چاشنی قاری کو اپنی گرفت میں لے کر ادبی سفر نامے کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

(ب)

انسانی سرشت کا ایک حصہ اظہار ہے اس لیے انسان جو نئی شے دیکھتا ہے یا جو کیفیت یا جو شے اُسے خوشی اور حیرانی میں مبتلا کرتی ہے وہ اس کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ ایسی خواہش کہ وہ روداد اور حالات جن سے وہ گزرا ہے وہ دوسرے تک پہنچائے یا اپنی کیفیت دوسرے کو بیان کرے نے سفر نامے کو جنم دیا ہے۔ سفر نامے میں سفر نامہ نگار دوسرے ممالک کے طور طریقوں، رہن سہن اور رسم و رواج سے واقفیت حاصل کر کے اُن کو قلمبند کرتا ہے۔ اب سفر نامہ ایک باقاعدہ بیانیہ صنف ادب بن چکا ہے۔ یہ اگرچہ قدیم مگر دلچسپ صنف ہے کیونکہ جب سفر کیا گیا تو دوسروں تک معلومات پہنچانے کی غرض سے سفر و حضر کی روداد کو تحریر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سفر نامہ قریہ قریہ، نگری نگری، کونہ کونہ پھرنے کا نام نہیں بلکہ ادبی نقطہ نظر سے ایک کامیاب سفر نامہ نگار یا سیاح وہ ہوتا ہے جو اپنے ذاتی مشاہدات کے ساتھ ساتھ ان تاثرات کو بیان کرے جو سفر کے دوران اس کے دل میں پیدا ہوئے۔ اس حوالے سے سفر نامہ نگار اپنے تخیل سے بھی کام لے سکتا ہے اور تاریخ کے اوراق کی مدد سے بھی حقیقت پیدا کر سکتا ہے۔ ایسے ہی دور جدید کے سفر نامہ نگار عامر بن علی ہیں جن کے سفر ناموں میں سیاست، معاشرتی، جغرافیہ، تہذیب، تاریخ اور داخلی عناصر کی موجودگی انہیں دوسرے سفر نامہ نگاروں سے منفرد مقام و مرتبہ بخشتی ہے۔ عامر بن علی نگر نگر گھومنے والے ایسے سیاح ہیں جو ہر لمحہ ہر منظر لفظوں میں قید کر لیتے ہیں۔ ان کی نظر سرسری نہیں ہوتی بلکہ بہت عمیق ہوتی ہے جو صدیوں کو کھنگال لیتی ہے جس کی ایک تازہ اور خوبصورت مثال ان کی کتاب ''مشرق کی طرف دیکھ''ہے۔

معروف شاعر، ادیب، صحافی، مترجم، معروف مدیر اور ماہر لسانیات عامر بن علی کی تازہ کتاب ''مشرق کی طرف دیکھ'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے قبل ان کے تین سفر نامے ''آج کا جاپان''، ''جہاں گردی''اور ''نگر نگر ایک نظر'' نے اپنے عمدہ اور جداگانہ اسلوب کے ذریعے سفر نامہ نگاری کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ عامر بن علی کی دلچسپ اور منفرد کتاب ۶۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے تین حصے ہیں۔

کتاب کے پہلے حصے میں جاپان، کوریا، تھائی لینڈ اور ملائشیا کا احوال بیان کیا ہے۔ حصہ اول کا عنوان ''پورب کا دروازہ کھلا''شہ سرخی میں دیا گیا ہے۔ اس حصہ میں تیئیس مضامین بیان کیے گئے ہیں جن کی ترتیب یوں ہے:

- شکستہ ظروف
- نحوست
- سماج کا باطن اور گیشا
- کسٹمر سروس
- ٹیکنالوجی کے کرشمے
- سمندروں کے سفر پہ نکلو
- پت جھڑ کی چھاپ
- تلوار کی واپسی اور توشہ خانہ
- سابق جاپانی وزیراعظم کا قتل
- ٹوکیو اولمپک ۲۰۲۰ء
- عوامی سواری
- رزق ضائع مت کریں
- جاپان پر ایٹمی بمباری کی یادیں
- ایک نگری دورافتادہ۔۔۔پیکا
- تھائی لینڈ کی ایک صبح
- تھائی انتخابات
- مائی سوت اور روہنگیا
- جنوبی کوریا میں کیا دیکھا
- کوریا کی ایک جھلک
- ساخالینی کورین
- قوس قزح کے رنگوں سے مزین ملائشیا
- یہ دیس ہے میٹھے لوگوں کا
- ملائشیا نامہ

کتاب کے اس حصہ میں مختلف ممالک کی تہذیب و ثقافت، سیاست، معاشیات، تعلیم و تربیت کے حوالے سے تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔ مصنف کا گہرا مشاہدہ اور بصیرت افروز قلب و نظر ایک رہنما حیثیت سے قاری کی انگلی پکڑ کرا ے ساتھ

لے چلتا ہے اور قاری کے لیے ذاتی مشاہدے کو تاریخی واقعہ کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری مختلف ممالک کی سیر کے ساتھ ساتھ تاریخ کا مطالعہ بھی کر لیتا ہے۔

کتاب کے حصہ دوم کا عنوان ''نیرنگ خیال'' سے شہ سرخی میں دیا گیا ہے۔اس حصہ کے ذیلی پندرہ مضامین یہ ہیں:

- ❖ زبان یار کے اوج کمال کا نسخہ
- ❖ بین الثقافتی ہم آہنگی کی عالمی ضرورت
- ❖ کس برہمن نے کہا تھا یہ سال اچھا ہے
- ❖ ایک تھا گورباچوف
- ❖ براہموس میزائل کا میاں چنوں گرنا
- ❖ نئی سحر کی امید
- ❖ پاکستان کی معاشی گراوٹ اور عالم دیگر
- ❖ کتاب سے بہتر کوئی جیلس نہیں
- ❖ یکساں نصاب تعلیم۔دوسرا رخ
- ❖ روس یوکرین جنگ کا پس منظر
- ❖ روس یوکرین جنگ کا ایک سال
- ❖ پریگوزن اور قلب عالم کا نظریہ
- ❖ میاں میر کا عرس اور احساس تقرری
- ❖ غلط فہمیوں کا تدارک
- ❖ سفر نامے کا ارتقا اور لندن
- ❖ آنے والے سنہری ایام کے نام

یہ حصہ مختلف موضوعات کا مجموعہ ہے۔اس حصہ میں زبان، ثقافت اور پاکستان کے ساتھ ساتھ روس کی سیاست کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ متفرق موضوعات پر مبنی کتاب کا یہ حصہ معلومات سے بھرپور ہے۔کتاب کے حصہ سوم کا عنوان ''یادیاراں'' بھی جلی حروف میں دیا گیا ہے۔اس حصہ میں نو مضامین ہیں جن کی ترتیب یوں ہے:

- ❖ محبت کا فلسفی شاعر رخصت ہوا
- ❖ استاد محترم شعیب ہاشمی
- ❖ اس کے بغیر آج بہت جی اداس ہے۔اجمل نیازی

- جی بسم اللہ اختر شمار
- منشاء یاد کا فن اور شخصیت
- احمد ندیم قاسمی کی یادیں
- قائم نقوی۔اک چراغ اور بجھا
- ستارے دیکھتے رہنا
- ظفر دل والا

کتاب کے اس حصہ میں چند نابغہ روز گار ہستیوں کا ذکر ہے جو چند برس پہلے ہمارے ساتھ تھیں۔ مصنف کتاب حصہ سوم کے مضامین تحریر کر کے ان نابغہ روز گار ہستیوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور اپنی تحریروں کے ذریعے ان کی یادوں کو بکھیرتے ہیں۔اس کتاب کا تیسرا حصہ انتظار حسین کے افسانوں کی طرح ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' کی زندہ مثال ہے۔

اس کتاب کو الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے۔کتاب کا انتساب خاندان کے نئے جوڑے مریم اور غماز حسنین کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ تازہ تصنیف اپریل ۲۰۲۴ء کو شائع کی گئی ہے۔کتاب کا دیباچہ آمنہ مفتی نے لکھا ہے۔ اعلیٰ کاغذ پر معیاری طباعت کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے جو کہ بے حد مناسب ہے۔ عامر بن علی کی تازہ کتاب ''مشرق کی طرف دیکھ''ایک دلچسپ اور معیاری کتاب ہے۔آمنہ مفتی مصنف کی کتاب کی تازہ تصنیف کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہیں:

> **''ابھی عامر کی کہانیوں کے طلسم میں گم ہی تھے کہ ان کی کتاب ''مشرق کی طرف دیکھ'' موصول ہوئی۔۔۔ جو چیز ہمیں لے بیٹھی وہ عامر کی جاپان کی تہذیب و ثقافت پر عبور ہے۔اپنی روانی میں وہ ہمیں مشرق کے اسرار بتاتے جاتے ہیں جیسے کوئی فلسفی بادام کے شگوفوں سے لدے درخت کے نیچے بیٹھا گیان بانٹ رہا ہو''**(۱)

''مشرق کی طرف دیکھ''ایک دلچسپ اور منفرد سفر نامہ ہے۔اس سفر نامے کے مصنف نے اکثر مقامات کا ذکر بھی کیا ہے جو اس سے قبل سفر ناموں میں بیان کیے جا چکے ہیں لیکن یہاں انداز نسبتاً منفرد ہے اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ تاریخی، جغرافیائی، سیاسی و سماجی معلومات کا دامن تھامتے ہوئے قاری کو معلومات پہنچی ہے۔

عامر بن علی ایک سچے سیاح ہیں اور سچی سیاحت وہ اہم عنصر ہے جو ان کے سفر ناموں کو کامیاب بناتی ہے۔وہ سفر سے کشید کرنے اور لطف اٹھانے کا ہنر جانتے ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ مصنف کے پاس ''کہہ دینے'' کیلئے بہترین ادبی اسلوب بھی موجود ہے۔اس اسلوب کی وجہ سے وہ اپنی سچی سیاحت کو صفحہ قرطاس پر تحریر کرتے چلے جاتے ہیں۔زیر تحقیق کتاب

کے حصہ اول میں جاپان، تھائی لینڈ، ملائشیا اور کوریا کا احوال بیان کرتے ہیں۔ جاپان پر لکھے گئے مضامین میں 'شکستہ ظروف کا سنہرا سفر، نحوست، سماج کا باطن اور گیشا، کسٹمر سروس، ٹیکنالوجی کے کرشمے، پت جھڑ کی چھاپ، تلوار کی واپسی اور توشہ خانہ، سابق جاپانی وزیر اعظم کا قتل، ٹوکیو اولمپک ۲۰۲۰ء، عوامی سواری، رزق ضائع مت کریں اور جاپان پر ایٹمی بمباری کی یادیں' شامل ہیں۔ ان مضامین میں جاپان کی تہذیب و ثقافت، تعلیم و تربیت، سیاست اور سائنس و ٹیکنالوجی پر بات کی گئی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان جس جگہ، خطے یا ملک کا باشندہ ہوتا ہے وہ اس خطے یا ملک کی تاریخ و ثقافت سے ضرور آگاہ ہوتا ہے۔ عامر بن علی بھی جاپان کی تہذیب کے ایسے روپ دکھاتے ہیں جو اس سے قبل معلوم نہیں تھے۔ اگر جغرافیائی لحاظ سے دیکھا جائے تو جاپان کا ۸۰ فیصد حصہ پہاڑوں اور جنگلوں پر مشتمل ہے اور پہاڑ بھی سرسبز درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ جاپانی قوم موسم بہار میں ان سرسبز درختوں اور ''چیری بلاسم'' کو دیکھنے کے لیے ایک تہوار مناتے ہیں۔ اس تہوار کو ''ہنامی'' کہا جاتا ہے جس کا مطلب ''پھول تکنا'' ہے۔ بہار کے جوبن پر جاپانی اہل خانہ اور دوستوں کے ہمراہ چیری بلاسم کو دیکھنے کے لیے جمع ہوتے ہیں اور جشن بہاراں مناتے ہیں۔ اسی طرح خزاں کا رنگ بدلتے ہی جب درختوں کے پتوں کا رنگ نارنجی، زرد اور سرخ ہونے لگتا ہے اور پتے ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں جاپانیوں کے نزدیک یہ بھی تہوار ہی کا موقع ہے۔ موسم خزاں میں گرتے پتوں کا نظارہ کرنے کے لیے جانے کو ''زرد پتوں کا شکار'' کے لیے جانا کہا جاتا ہے۔ اس نظارہ کو دیکھنے کے لیے جاپانی ٹولیوں کی شکل میں پہاڑوں، جنگلوں اور دریاؤں کے کنارے رخ کرتے ہیں اور ان کے گھر سے نکلنے کو ''مومی جگاری'' کہا جاتا ہے۔ اس تہوار کا تذکرہ ایک ہزار سال پرانی شاعری میں موجود ہے۔ ہمارے نامور شاعر فیض احمد فیض نے بھی اس موضوع پر ''زرد پتوں کا بن'' نظم لکھی جو پاکستان کے بارے لکھی گئی کیونکہ وہ قانون کے نفاذ کے حوالے سے اس ملک کو جنگل محسوس کرتے تھے۔ عامر بن علی موسم خزاں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> **''پہاڑی جنگلوں میں دور تک نکل جانے والے جاپانی لوگوں کے لیے سرخ اور ادھ مڑے پتوں کا مطلب، آنے والے تنہائی اور طویل موسم سرما کے دن ہیں۔۔۔ سرما کی قید سے پہلے آزادی کے چند دنوں کا یہ جشن ہے مگر حزن اور اداسی کے رنگ واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں''**(۲)

ہر خطے کے لوگوں کے اپنے رسم و رواج اور زندگی گزارنے کے طور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ جاپانی قوم کھیلوں کے بھی بے حد شوقین ہے اور کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر شرکت کرتے ہیں۔ عامر بن علی بتاتے ہیں کہ جاپان میں بہت برسوں یہ روایت ہے کہ ہر چار سال بعد موسم گرما میں اولمپک مقابلوں کے انعقاد کے ساتھ ہی خصوصی افراد کے لیے بھی اولمپک مقابلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ گرما اولمپک کی عالمی کامیابی کے چار سال بعد سرما اولمپک بھی باقاعدگی سے منعقد کیا جاتا ہے۔

برسوں پہلے اولمپک مقابلوں کی ابتداء یونان سے ہوئی تھی۔ان کھیلوں کو پیش کرنے کا مقصد یونانی دیوتاؤں کو خوش کرنا تھا۔ اسی وجہ سے ابتداء میں ان کھیلوں کی اہمیت مذہبی تھی پھر ۱۸۹۴ء میں ایک فرانسیسی شخص نے اولمپک کمیٹی تشکیل دی اور کئی صدیوں کے وقفے کے بعد ۱۸۹۴ء میں جدید اولمپک مقابلے دوبارہ شروع ہوئے۔ سفر نامہ نگار ٹوکیو اولمپک ۲۰۲۰ء کی صورتحال سے آگاہ کرتے ہیں جو کہ موذی مرض کرونا کی وجہ سے ایک سال تاخیر سے شروع ہوا اور کرونا کے سبب اولمپک مقابلے شائقین اور تماشائیوں کے سٹیڈیم میں پابندی لگائی گئی اور اولمپک کا مقابلہ ملک بھر کے تمام ٹی وی چینلز نے ہمہ وقت گھر بیٹھے شائقین کو دکھایا۔اسی اولمپک ۲۰۲۰ء کے مقابلے میں اولمپک کے پرچم کا بھی صد سال جشن منایا گیا کیونکہ یہ ۱۹۱۶ء میں تشکیل پایا تھا اور پہلی مرتبہ ۱۹۲۰ء کے کھیلوں کے مقابلے میں لہرایا گیا۔ مصنف کتاب ''ٹوکیو اولمپک ۲۰۲۰ء'' میں لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ شائقین کے بغیر کھیلوں کے مقابلے پھیکے پھیکے اور بجھے بجھے محسوس ہو رہے ہیں البتہ ٹوکیو میں قائم اولمپک میوزیم میں داخلے کی عام اجازت ہے۔ یہاں اولمپک کھیلوں کی مکمل تاریخ سے آگاہی ملتی ہے اور اس بابت اہم معلومات دستیاب ہیں''(۳)

اولمپک ۲۰۲۰ء کے پینتیس کھیلوں کے چار مقابلے میں پہلی پوزیشن لینے والے کو سونے، دوسری پوزیشن لینے والے کو چاندی اور تیسری پوزیشن لینے والے کو کانسی کے تمغے پہنائے گئے۔ یہ افتتاحی تقریب بہت شاندار رہی۔

مصنف لکھتے ہیں کہ جاپان کے لوگ اگست کے مہینے میں ''اوبون'' نامی تہوار مناتے ہیں۔اس تہوار کی وجہ دوسری جنگ عظیم ہے جس میں امریکا نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بمباری کی تھی جس کے سبب لاکھوں کی تعداد میں ہلاکتیں ہوئی تھیں اور زندہ بچ جانے والے لاکھوں انسان ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئے۔اس دردناک المیہ کے ۷۵ سال بعد بھی خوف، دہشت اور کرب کے اثرات اب بھی دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ جاپان میں اگست کا مہینہ مرنے والوں کی یاد کے لیے مخصوص ہے جس طرح مسلمان محرم الحرام میں اپنے پیاروں کی قبروں کی صفائی ستھرائی اور لپائی کرتے ہیں بالکل اسی طرح جاپانی میں اپنے پیاروں کی قبروں پر جاتے ہیں اور دیکھ بھال کا کام کرتے ہیں۔ ہر بستی بستی، نگر نگر روایتی لباس میں ملبوس طبل و علم بردار نوجوان جلوس نکالتے ہیں۔ان جلوسوں کا رنگ تعزیے کی بجائے عرس کا ہوتا ہے۔اس تفاوت کا سبب موت اور حیات کا مذہبی تصور ہے۔ سفر نامہ نگار جاپانیوں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''جاپانیوں نے ایٹمی بمباری کے نتیجے میں ہنستے بستے شہروں کو جلا کر راکھ ہوتے دیکھا۔ایسی تباہی کہ جس کی نظیر انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی، نہ ہی اس کے بعد کسی انسانی بستی نے ایسی بربادی کا سامنا کیا''(۴)

جاپانی قوم نے ہیروشیما اور ناگاساکی کی راکھ پر ماتم پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ نئے جذبے اور عزم کے ساتھ تعمیر نور کی مہم شروع کی جو آج بھی جاری و ساری ہے۔ جاپانیوں میں حالات اور وقت کے ساتھ ساتھ تیور بدلنے کی امتیازی خوبی ہے۔ جاپانی قوم شکست کا ماتم کرنے کی بجائے شکست سے عبرت حاصل کر کے جلد از جلد ہنگامی اقدامات کرنے کے قائل ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی جنگ کی شکست نے جاپانیوں کی نفسیات کو ایسے ہی رکھا البتہ ترقی کے معاملات میں جاپانیوں نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ جاپان نے دنیا بھر کی سب سے تیز ترین بلٹ ٹرین جس کی رفتار ۳۰۶ کلو میٹر فی گھنٹہ کی ایجاد کے بعد ''ٹیسٹ دی ٹی وی (TTVE)'' یعنی ٹی وی چکھو'' کو ایجاد کر کے سب کو حیرت گم کر دیا ہے۔ اس نئی ایجاد کا موجد پروفیسر میاشیتا ہے۔ اس نئے ٹی وی کی وجہ سے اسکرین پر نظر آنے والی پھل سبزیاں اور رنگ برنگ کے کھانوں کو ٹی وی اسکرین چاٹ کر ذائقہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا پروٹوٹائپ ٹیلی ویژن ہے جس کی اسکرین پر دس مختلف ذائقوں کا مخصوص اسپرے کے بعد جیسے ہی اسکرین ٹی وی پر کوئی تصویر ظاہر ہوتی ہے اُس اسکرین کو چاٹ کر ذائقہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس حیرت انگیز ایجاد کے بعد جاپان میں ڈوئل موڈ گاڑی کا افتتاح بھی کر دیا گیا ہے جو نا صرف جاپان بلکہ پوری دنیا بھر میں پہلی ڈوئل موڈ گاڑی ہے یہ گاڑی نا صرف سڑک پر بلکہ ریلوے لائن پر بھی دوڑتی ہے اس کی حد رفتار سو کلو میٹر فی گھنٹہ ہے۔ مصنف ڈوئل موڈ گاڑی کے بارے بتاتے ہیں:

> **''براستہ سڑک یہ ربڑ کے عام ٹائروں سے چلتی ہے کوئی بھی خاص فرق دکھائی نہیں دیتا مگر جب یہ ریلوے انٹر چینج پر چلنے کے لیے پہنچتی ہے تو اندر کی جانب موجود فولادی پہیے ریل ٹریک پر آ جاتے ہیں۔ ریل گاڑی کی صورت میں اس کی حد رفتار ذرا کم ہے یعنی ۶۰ کلو میٹر فی گھنٹہ''**(۵)

جاپانی قوم کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ محنت کش روبوٹ قوم معلوم ہوتی ہے اور محنت پر یقین رکھتی ہے تبھی یہ قوم دن دگنی رات چگنی ترقی کر رہی ہے۔

اس قوم کے فنون لطیفہ میں ٹوٹے ہوئے برتنوں کو جوڑنے اور قیمتی دھاتوں سے ان میں آئے بال کو پر کرنے فن بھی شامل ہے جسے ''کھن سگی'' کہا جاتا ہے۔ جاپانیوں میں ظروف کو ٹوٹنے کے بعد قابل استعمال اور عزیز رکھنے کی خواہش بہت قدیم ہے اس کی بنیادیں مذہبی و روحانی، سلسلے زن ZEN مسلک سے بھی منسلک ہے۔ اس کے بارے عامر بن علی لکھتے ہیں:

> **''جن برتنوں سے خوبصورت یادیں وابستہ ہوں ان کے ٹوٹنے کا دکھ اس لیے بھی زیادہ ہوتا ہے کہ ان یادوں کے فراموش ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے ایسے شکستہ ظروف کے لیے ''کھن سگی'' مسیحائی کا عمل ہے''**(۶)

فقط یہ ایک لطیف فن نہیں بلکہ جوش نما حوصلے کی تلمیح ہے۔ بچھڑے یا ٹوٹے ہوئے رشتوں میں خوبصورتی تلاش کرنے کی ہمت و حوصلے کی نشانی ہے۔

عامر بن علی جاپان کے لوگوں کی زندہ دلی اور محبت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ پوری دنیا میں تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور ان میں آئے روز اضافے کے تسلسل نے تمام عالم کے لوگوں کی زندگی کو متاثر کیا ہے جاپانیوں نے اس کا حل بھی نکال لیا ہے۔ جاپان میں موٹر سائیکل ایک سستے اور بہتر متبادل کے طور پر اپنایا جا رہا ہے اور سائیکلوں میں الیکٹرک بائیکس بے حد مقبول ہیں جیسے ہائی برڈ اور الیکٹرک کاریں پٹرول اور بجلی دونوں کی مدد سے چلتی ہیں بالکل اسی طرح ہائی برڈ الیکٹرک بائیکس بجلی سے بھی چارج ہوتی ہیں اور پیڈل بھی لگے ہوئے ہیں۔ سفر کے آغاز میں چند منٹ پیڈل گھمانے کے بعد یہ سائیکل موٹر سائیکل بن جاتی ہے لیکن اس کی حد رفتار موٹر سائیکل سے کم ہوتی ہے۔ جاپان کی عوامی سواری آج کل سائیکل ہے جو نا صرف محنت کش اور سفید پوش طبقے تک محدود ہے بلکہ وزیر قانون بھی پارلیمنٹ کی عمارت میں اجلاس میں شرکت کے لیے سائیکل چلاتے تشریف لا رہے ہیں۔ عامر بن علی اس واقعہ کو بہت دلچسپ انداز میں قلمبند کرتے ہیں:

> **''صحافی نے پوچھا، جناب عالی مقام! آپ نے یہ سائیکل کب خریدی ہے؟ سابق وزیر قانون کا جواب تھا کہ جب مجھ سے وزارتی سیاہ رنگ کی کار واپس لے لی گئی تو اس کے فوراً بعد ہی میں نے یہ سیاہ رنگ کی سائیکل خرید لی تھی۔ یہ میری متبادل ٹرانسپورٹ بڑی ہی اچھی چلتی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں متبادل ٹرانسپورٹ سے مراد کالی گاڑی کی جگہ کالی سائیکل ہے''**(۷)

جاپان کے شہر ٹوکیو میں ایک سال کے دورانیے میں دس لاکھ سے زائد الیکٹرک سائیکل فروخت ہوئے ہیں۔ اس سے جاپان میں خرید و فروخت ہونے والی سائیکلوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جاپانیوں میں سائیکل کی سواری کتنی مقبول ہے۔

جاپانیوں کی محنت کشی کے بعد عامر بن علی ان کی اخلاقی تربیت کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ گاہک بھگوان یا دیوتا سا ہوتا ہے یہ مثل صدیوں سے مشہور ہے لیکن جاپان میں معاملہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہاں گاہک کو خدا مانا جاتا ہے۔ مہمان اور گاہک کے لیے ایک ہی لفظ رائج ہے گویا جس طرح مہمان کی عزت کی جاتی ہے اسی طرح جاپان میں گاہک کی عزت افزائی اور آؤ بھگت ہوتی ہے۔ کسی دوکان یا اسٹور میں داخل ہوتے ہیں اسٹاف کے تمام افراد باآواز بلند خوش آمدید کہتے ہیں اور جاتے وقت اجتماعی طور پر ''شکریہ'' کی بلند آواز لگاتے ہیں۔ سفر نامہ نگار اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> **''جاپان میں گاہک اگر رشتہ داری کرنے تک کا بھی کوئی منصوبہ یا تجویز پیش کر دے تو اسے صاف انکار نہیں کیا جائے گا''**(۸)

گاہک کے ساتھ دوستانہ رویے سے پیش آنا جاپانی قوم کی تربیت کا حصہ ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جاپانیوں کو سکول اور گھروں میں باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے کہ رزق ضائع نہ کریں۔ جاپان میں جوٹھا کھانا چھوڑنے کا تصور بھی محال ہے یہاں تک کہ جاپان میں ریستوران میں بھی گاہک کھانا برتن میں چھوڑ کر نہیں جاتے۔ جاپانی ریستوران میں عمومی سائز کی چاول کی پلیٹ کو کم کرنے کے لیے پچاس روپے اضافی دیئے جاتے ہیں جبکہ چاول کی عمومی مقدار سے چاول کھانے کے لیے قیمت ادا نہیں کی جاتی لیکن جاپانی پچاس روپے ادا کر کے چاول کی پلیٹ کم کرواتے ہیں جوٹھا کھانا چھوڑ کر نہیں جاتے یہ جاپانیوں کی بچپن کی تربیت کا اثر ہے۔اس ملک میں رزق کا ضیاع اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ یہ بات ان کی ثقافت کا حصہ بن چکی ہے۔ یہ بات ان کی تہذیب کے خلاف ہے کہ ایک دانا بھی اناج کا کسی کی تھالی میں نظر آئے۔ جاپانیوں کی مثال کے ذریعے مصنف مسلمانوں کی اس جانب توجہ دلاتے ہیں:

**"ہم رزق ضائع کرنے کی عادت اپناتے جارہے ہیں حالانکہ روایتی اور ثقافتی اعتبار سے ہم کھانے کا بے حد احترام کرتے چلے آئے ہیں، مگر یہ بدعت اب بہت عام ہو تی جارہی ہے۔ ضیاع تو کسی بھی چیز کا برا ہے لیکن کھانے کا ضائع کرنا تو انتہائی بری بات ہے"**(۹)

مصنف جاپان کی ترقی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ جدید ٹیکنالوجی کے اپناتے ہوئے جاپان کے ریستوران میں ویٹرز کی بجائے روبوٹ نما گھڑی نے لے لی ہے۔ سلیٹ نما اسکرین پر اپنی پسند کا کھانا منتخب کر کے اسکرین پر آرڈر دیا جاتا ہے چند منٹوں میں روبوٹ نما گاڑی کھانا اس کی نشست پر پہنچا دیتی ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اس قدر ترقی کے باوجود ضعیف الاعتقادی اور نظریات جاپانی قوم میں عام ہیں۔ کئی چیزوں کو اس ملک میں نحوست کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ان میں ۹ اور ۴ کا عدد بھی ہے جسے نحوست سمجھا جاتا ہے۔ جاپان میں کسی بھی کثیر المنزلہ عمارت کی لفٹ میں چوتھا اور نواں فلور نہیں ہوتا کیونکہ جاپانیوں کے نزدیک یہ ہندسے بدبختی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جاپان کی ایپل کمپنی نے آئی فون ۸ کے بعد آئی فون ٹین پیش کیا تھا ۹ کو نحوست کی علامت سمجھتے ہوئے نظرانداز کر دیا گیا۔ اسی طرح جاپانی قوم کالی بلی کے راستہ کاٹنے کو بھی نحوست کی علامت خیال کرتے ہیں۔ جاپان کی طرح چین میں بھی چار کا ہندسہ منحوس اور موت کی علامت مانا جاتا ہے کیونکہ چین میں بھی توہم پرستی بہت زیادہ ہے۔ جاپانی قوم کی ہندسوں کی نحوست کے حوالے سے عامر بن علی آگاہ کرتے ہیں:

**"کبھی کسی جاپانی کو ایسا تحفہ نہ دیں جس میں چار یا ۹ کا ہندسہ آتا ہو تحائف کی تعداد زیادہ ہے تو پھر تین یا پانچ ہی ہو چار قطعاً نہ ہو۔ پھول پیش کرنا چاہتے ہیں تو ان کی تعداد چار قطعی طور پر نہ ہو ورنہ آپ پچھتائیں گے"**(۱۰)

کسی حد تک یہ درست ہے کہ جاپانی قوم بہت بھولی ہے لیکن کبھی کبھار جاپان میں کچھ لوگ بھولے پن کی اداکاری کرتے ہیں۔ عامر بن علی اپنی کتاب میں اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ جاپانیوں کے باطن کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ جاپانی سب کچھ جاننے کے باوجود ظاہر اس طرح کرتے ہیں کہ جیسا ان کو کچھ نہیں پتا۔ دوسروں کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ یہ قوم تنقید بالکل بھی نہیں کرتی ہے مثلاً اگر ان سے پوچھا جائے کہ موسم بہت اچھا ہے نناوے فی صد یہی جواب دیا جاتا ہے کہ واقعی آج موسم بہت اچھا ہے اور اسی جگہ اسی وقت کوئی دوسرا شخص کہہ دے کہ موسم آج بہت خراب ہے پھر بھی ان کا جواب ہاں ہی ہے۔ جاپان میں عمومی طور پر اختلاف رائے کا رواج نہیں ہے۔

عامر بن علی جاپان کی سیاست کے حوالے سے بھی اپنی کتاب میں تذکرہ کرتے ہیں کہ جاپان میں سب سے عرصہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز وزیر اعظم کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا جو ایک غیر معمولی واقعہ ہے کیونکہ جاپان کی سو سالہ تاریخ میں پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جاپان میں اسلحے پر شدید کنٹرول ہے یہاں لائسنس ملنا مشکل تو کیا ناممکن ہی ہے۔ وزیر اعظم کو قتل کرنے والے ملزم نے پستول گھر میں خود تیار کیا تھا اس کا سبب ملزم کا فوجی پس منظر ہے۔ جاپانی وزیر اعظم 'شنزو آبے'' نے دو مرتبہ اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے اپنے منصب سے استعفیٰ دیا۔ اس جاپانی وزیر اعظم کو عوام میں مقبولیت کی وجہ سے طویل ترین عرصہ وزیر اعظم رہنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ان کے مبینہ قاتل کو موقع واردات پر ہی گرفتار کر لیا گیا تھا اور قتل کی تحقیقات کی جا رہی ہیں جو یقیناً اچھے انداز میں شفافیت اور انصاف پر مبنی ہوں گی لیکن بہر حال شنزو آبے واپس نہیں آئیں گے۔ سفر نامہ نگار جاپانی وزیر اعظم کے قتل کے حوالے سے بتاتے ہیں:

> **''جاپان میں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ گزشتہ سو سال کی تاریخ میں آپے سال وہ پہلے سابق و موجودہ وزرائے اعظم کی فہرست میں سے آدمی ہیں جنہیں قتل کیا گیا۔ امریکی صدر کینڈی اگر قتل ہو جاتے ہیں تو یہ بات افسوس ناک ہے مگر حیران کن نہیں چونکہ ہر سال پینتیس ہزار امریکی گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں''**(۱۱)

جاپان میں وزیر اعظم کا قتل بلاشبہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ مصنف کتاب جاپان کے بعد تھائی لینڈ کی طرز معاشرت اور سیاست کو متعارف کراتے ہیں اور تھائی لینڈ پر تین مضامین تحریر کرتے ہیں جو یہ ہیں:

تھائی لینڈ کی ایک صبح

تھائی انتخابات

مائی سوت اور روہنگیا

تھائی لینڈ کے لفظی معنی ''آزاد لوگوں کے رہنے کی جگہ'' ہیں۔ اس ملک کا تاریخی نام ''سیام'' تھا۔ تھائی لینڈ کا دارالحکومت بنکاک ہے۔ اس ملک کے شمال لاؤس اور میانمار (برما) واقع ہیں اس کے جنوبی طرف تھائی لینڈ اور ملائیشیا کی خلیج

اور مشرقی جانب کمبوڈیا اور لاؤس واقع ہیں اور مغربی جانب انڈیمان سمندر واقع ہے۔ تھائی لینڈ کی سرکاری زبان ''تھائی'' ہے اور ملک کا چالیس فیصد حصہ ''تھائی'' زبان ہی بولتا ہے۔ یہ ملک کبھی بھی کسی اور قوم کا غلام نہیں رہا۔ یہ ملک سرسبز ہے ہر جگہ ہریالی ہی ہریالی ہے۔ موسم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس ملک میں سارا سال موسم بہار ہی کی طرح ہوتا ہے، نہ زیادہ گرم نہ ہی زیادہ سرد۔ تھائی لینڈ بڑا مذہبی ملک ہے۔ ملکی اکثریت مذہب کے لحاظ سے بدھ مت ہے۔ بدھ مت کے پیروکار ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگ پُرامن، منکسرالمزاج، خدمت گزار اور بردبار ہیں۔ اس ملک میں چرانوے فیصد بدھ دھرم، پانچ فیصد مسلمان اور ایک فیصد آبادی دیگر مذاہب کو ماننے والے ہیں۔ اس ملک میں بادشاہ کو مذہبی تکریم حاصل ہے۔ پورے ملک میں بادشاہ کی قدآور تصاویر کرنسی نوٹوں کے علاوہ جگہ جگہ آویزاں ہیں۔

سفر نامہ نگار تھائی لینڈ کی خوبصورت وادی ''مائی سوت'' کا تذکرہ کرتے ہیں کہ یہ خوبصورت شہر جسے جنت نظیر کہنا غلط نہ ہوگا، بلند پہاڑوں میں گھری وادی نما یہ شہر آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے چھوٹا ہے مگر صاف ستھرا اس قدر ہے کہ بڑے بڑے شہروں کو مات دیتا دکھائی دیتا ہے۔ کہساروں میں گرم پانی کے بہتے چشموں کے اردگرد سرائے قائم ہیں۔ اس شہر کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس علاقے میں چوری چکاری کا رواج بالکل نہیں ہے گھروں سے جاتے وقت لوگ عموماً تالے بھی نہیں لگاتے ہیں۔ عامر بن علی ''مائی سوت'' کی خوبصورتی کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> **''سچی بات تو یہ ہے کہ یہ خوبصورت شہر جسے جنت نظیر کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگی، اس قابل ہے کہ اس کی مداحی میں پوری کتاب بآسانی تحریر کی جاسکتی ہے، تب جا کر ہی اس کے قدرتی حسن سے مالامال مناظر کا احاطہ ممکن ہوگا، حق تو پھر بھی شاید ادا نہ ہوسکے گا''**(۱۲)

اس ملک میں پھل بے شمار انواع واقسام کے پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی مقبول فصل چاول ہے۔ تھائی لینڈ کی مقامی کرنسی ''بھات'' ہے جو پاکستانی آٹھ روپے کے برابر ہے۔ اس ملک کا معیاری وقت پاکستان سے دو گھنٹے آگے ہے۔ سفر نامہ نگار تھائی لینڈ کے انتخابات کے حوالے سے بھی بات کرتے ہیں کہ انتخابات سے چند دن پہلے پورے ملک میں امیدواروں کی تشہیری مہم کے باعث رنگوں کی برسات آئی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تھائی کے انتخابات میں ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس ملک میں حاضر سروس فوجی اور سویلین سرکاری ملازمین بھی عام انتخابات میں بطور امیدوار حصہ لے سکتے ہیں۔ یہاں ایوان بالا کے ۲۵۰/افراد فوج منتخب کرتی ہے اور ان نامزد سینٹ ممبران میں بھی اکثر تعداد سرکاری ملازمین کی ہوتی ہے۔ تھائی لینڈ میں آئینی بادشاہت رائج ہے۔ بادشاہ کو مکمل اختیارات کے ساتھ ساتھ مذہبی تکریم بھی حاصل ہے۔ عامر بن علی بادشاہ کی تکریم کے حوالے سے تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ملک کے طول و عرض میں بادشاہ اور ملکہ کی جہازی سائز کی تصاویر نصب ہیں۔ سچ پوچھیے تو انتخابی دنگل عروج پر ہونے کے باوجود مجھے بادشاہ اور ملکہ کی نصب تصاویر تمام مناظر پر غالب نظر آئیں۔ یہاں شاہی خاندان بدلتے رہتے ہیں مگر صدیوں سے بادشاہت ہی رائج ہے''(۱۳)

تھائی لینڈ کی سب سے بڑی انڈسٹری سیاحت ہونے کے باوجود یہاں مستحکم معیشت ہے۔

عامر بن علی تھائی لینڈ کے بعد جنوبی کوریا کا رخ کرتے ہیں۔ جنوبی کوریا رقبہ کے لحاظ سے ۳۸۰۰۰ میل ہے اور اس ملک کی کل آبادی ۴۶.۸۸ ملین ہے۔ کوریا کا دارالحکومت سیوئل ہے۔ اس ملک کی سرکاری زبان کوریائی ہے۔ یہ مشرقی ایشیا کا ایک ملک ہے جو زیادہ تر پہاڑوں اور جنگلات پر مشتمل جزائر کا مجموعہ ہے۔ اگر مذہبی لحاظ سے کوریا کو دیکھا جائے تو اس ملک کی چھپن فیصد آبادی لادین ہے اور عیسائیوں کی تعداد ستائیس فیصد ہے۔ تاریخی اعتبار سے جنوبی کوریا بدھ مت کے پیروکار رہے ہیں لیکن اب بدھ مت کے ماننے والے پندرہ سولہ فیصد رہ گئے ہیں۔ گزشتہ صدی کا تقریباً پہلا نصف حصہ جاپان کا اس ملک پر قبضہ رہا ہے۔ آغاز میں اس ملک کو KOREA اور COREA دونوں ہجوں اور طریقوں کے ساتھ تحریر کیا جاتا تھا لیکن جب جاپان نے کوریا پر قبضہ کیا تو KOREA کے یہ ہجے لازمی قرار دے دیئے کیونکہ حروف تہجی کے اعتبار سے کوریا جاپان سے پہلے آتا ہے اور جاپانیوں کو یہ پسند نہ تھا۔

سفر نامہ نگار اپنی تصنیف میں جنوبی کوریا پر تین مضامین تحریر کرتے ہیں جن کی ترتیب یوں ہے۔ ''جنوبی کوریا میں کیا دیکھا، کوریا کی ایک جھلک، ساخالینی کورین'' جنوبی کوریا معیشت کے لحاظ سے دنیا کا بارہواں ملک ہے۔ اس ملک میں قدرتی وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن اس کے باوجود معاشی لحاظ سے مضبوط ملک ہے جس کی ایک وجہ محنتی قوم اور موثر نظام حکومت ہے۔ اس ملک کی ترقی کی ایک اور وجہ اس ملک کی شرح پیدائش ہے جو دنیا میں سب سے کم ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا میں یہ طویل ترین عمر پانے والی قوم ہے۔ جنوبی کوریا G۲۰ کا اہم رکن ہے جو کہ دنیا کی بیس سب سے بڑی معیشتوں کی ایک تنظیم ہے۔ اس کے علاوہ یہ ملک پیرس کلب اور OECD کا رکن بھی ہے۔ اس وقت جنوبی کوریا دنیا کا نواں بڑا ایکسپورٹر ہے۔ بلاشبہ جنوبی کوریا ترقی کی راہ پر گامزن ہے جس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے ایک وجہ عامر بن علی بیان کرتے ہیں:

> ''میری نظر میں اس خیرہ کن ترقی کی وجہ محنتی قوم اور موثر حکومتی نظام ہے۔ معاشی پالیسیوں کا تسلسل بھی ایک اہم وجہ ہے کہ یہاں حکومتیں بدلتی رہتی ہیں مگر معاشی پالیسی ریاست کی مستقل خیال کی جاتی ہے۔ یہاں کی کرنسی ''وین'' کہلاتی ہے جو آج کل ایک روپے کے چھ آتے ہیں اس تذکرے کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ کرنسی کا نرخ ملک کی معیشت اور اس کی ترقی کا رخ طے نہیں کیا کرتا''(۱۴)

کورین لوگ اپنے جذبات کے اظہار کے سلسلے میں پاکستانیوں کی طرح کھلے ڈلے ہیں۔ اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کھلے الفاظ میں کرتے ہیں۔ کورین قوم جلدی کھل جانے اور دوست بنا لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کے تاثرات بآسانی چہروں سے پڑھے جا سکتے ہیں۔

کوریا پر مضامین تحریر کرنے کے بعد سفر نامہ نگار ملائشیا کے بارے میں تین مضامین قلمبند کرتے ہیں جو یہ ہیں "قوس قزح کے رنگوں سے مزین ملائشیا، یہ دیس ہے میٹھے لوگوں کا اور ملائشیا نامہ"۔اس ملک کی کل آبادی تین کروڑ بیس لاکھ ہے۔ یہ ملک دنیا کا تینتالیسواں آبادی والا ملک ہے۔ یہ جنوبی ایشیاء میں ایک مسلم ملک ہے۔اس ملک کا دارالحکومت کوالالمپور ہے۔ آبادی کا ستر فیصد حصہ ملایا نسل پر مشتمل ہے اور بیس فیصد چینی کاروبار کی وجہ سے یہاں پر آباد ہے۔ ملائشیا مذہبی اعتبار سے متنوع ملک ہے۔ یہاں تریسٹھ فیصد مسلمان ہیں جو کہ ایک غالب اکثریت ہے۔ بدھ مت کی آبادی بیس فی صد جبکہ دس فیصد عیسائی اور سات فیصد ہندو آباد ہیں۔اس ملک کی سرحدیں انڈونیشیا اور تھائی لینڈ کے ساتھ برونائی سے بھی ملتی ہیں اور سمندری سرحدیں فلپائن اور سنگاپور سے ملتی ہیں۔ یہاں کی مقبول غذا جاپان کی طرح چاول اور مچھلی ہے۔اس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے تمام کھانے حلال ملتے ہیں۔ یہاں سارا سال موسم ایک جیسا رہتا ہے۔ ملائشیا کی قوم زبان مالے ہے اور کرنسی "رنگٹ" ہے جو پاکستانی ساٹھ روپے کے برابر ہے۔ معاشیات کے لحاظ سے یہ مضبوط ملک ہے۔ اس حوالے سے مصنف رقمطراز ہیں:

> **"اس وقت ملائشیا دنیا کی تیسویں بڑی معیشت ہے، غربت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ لوگوں کا عمومی معیار زندگی ہر آنے والے سال سے بہتر ہو رہا ہے۔ بے روزگاری انتہائی کم ہے اور کام کروانے کے لیے تو روزگار کی ذرا بھی کمی نہیں ہے"**(۱۵)

اس ملک میں بسنے والے لوگوں کا عجز وانکساری خاصہ ہے اور خاص طور پر سرکاری اہلکاروں کا رویہ پاکستانیوں کے ساتھ بالکل دوستانہ ہے۔ سفر نامہ نگار کے مطابق ایشیاء کا یہ ملک سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ خوش اخلاق لوگوں کا مسکن ہے۔ یہ میٹھے لوگوں کا دیس ہے۔ یہ بہترین سیاحتی ملک ہے۔ امریکا اور برطانیہ سے بہت زیادہ تعداد میں لوگ ملائشیا میں سیاحت کے لیے آتے ہیں جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں انگریزی زبان سمجھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔اس ملک کا قومی پھول "ہائی بسکس" ہے اور یہ اس کے دارالحکومت کوالالمپور میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اس پھول کو "گل وطن" کا درجہ حاصل ہے جس کا سبب یہ ہے کہ اس پھول کی پانچ پتیوں سے ملائشیا کی پانچ نکاتی حکمت عملی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ پانچ عزائم یہ ہیں:

- خدا پر بھروسہ

- بادشاہ اور مملکت سے وفاداری
- آئین اور قانون کی عملداری
- دانشمندانہ رویہ
- بلند کردار

اس پھول کا رنگ سرخ ہے جو ہمت اور حوصلے کی علامت مانا جاتا ہے جس طرح جاپان میں چیری کے پھول سے جاپانی دلی عقیدت رکھتے ہیں اسی طرح ہائی بسکس کو ملائشیا کی روح قرار دیا جاتا ہے۔

زیر تحقیق کتاب کا حصہ اول چار ممالک کی سیاحت پر مشتمل ہے جن میں ان ممالک کی تاریخ، تہذیب و ثقافت، رسم و رواج اور سیاست کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ عامر بن علی کا گہرا مشاہدہ اور بصیرت افروز قلب و نظر ایک رہبر کی حیثیت سے قاری کی انگلی پکڑ کر اسے ساتھ لے چلتا ہے اور قاری کے لیے ذاتی مشاہدے کو تاریخی واقعہ کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری ملک ملک، بستی بستی کی سیر کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا مطالعہ بھی ہلکے پھلکے انداز میں کر لیتا ہے۔

کتاب کا حصہ دوم مختلف موضوعات کا مجموعہ ہے جس میں زبان، ثقافت، سیاست اور کتاب کی رونمائی کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ کتاب کے اس حصہ میں معلومات فراہم کرنے کا سلسلہ لحہ بہ لحہ جاری رہتا ہے اور قاری کی دلچسپی بھی برقرار رہتی ہے۔

عامر بن علی لکھتے ہیں کہ زبان کی ایجاد کا بنیادی مقصد فقط اتنا ہے کہ اپنی بات دوسروں تک پہنچائی جا سکے اور دوسرے لوگوں کی بات سمجھی جا سکے۔ یہ نظریہ حضرت آدمؑ سے لے کر آج تک چلتا آ رہا ہے۔ کوئی بھی زبان برتر یا کمتر نہیں ہے، زبان فقط ذریعہ اظہار ہے۔ پاکستان کی قومی زبان اردو کے قیام اور عرج کی وجہ بھی یہی تھی کہ برصغیر پاک و ہند میں لوگوں کے باہمی رابطے کے لیے اردو سے بہتر زبان موجود نہیں تھی اس زبان کے فروغ کا سبب بازار میں کاروبار و تجارت کی ضرورت تھی جو کہ پہلے پہل اردو زبان مختلف علاقوں کی چھاونیوں میں رہنے والی فوجیوں کی آپسی رابطے کی زبان کے طور پر وجود میں آئی تھی لیکن ترقی نہ کر سکی جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان اردو نہیں ہے۔ اردو سمیت پاکستان کی دیگر زبانوں کا المیہ بھی یہی ہے کہ ان میں کوئی بھی چیز ایجاد نہیں ہوئی اور نہ ہی تحقیق اس قابل ہے کہ دنیا اردو کو درخوا اعتنا سمجھے۔ اس کے برعکس اگر انگریزی زبان کو دیکھا جائے تو ہر آنے والے سال اور دہائی میں اس کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ پورے عالم دنیا کی دس بڑی معیشتوں میں شامل ممالک میں یہی زبان بولی جاتی ہے۔ کیونکہ زبان ہی کسی بھی ملک کی سماج اور ثقافت کا DNA ہوتی ہے اور زبان ہی کے ذریعے کسی بھی ملک کی ثقافت اور سماج کو سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر روسی زبان کی بات کی جائے تو دور جدید کے امریکی خلانوردوں کے لیے یہ زبان سیکھنا ضروری ہے، اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ خلا میں قائم اسٹیشنوں پر مقیم روسی خلا بازوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور دوسری

وجہ یہ ہے کہ روسی لوگ عمومی طور پر انگریزی سمیت کسی بھی غیر ملکی زبان کو نہیں سیکھتے۔ اسی سبب امریکی خلا بازوں کے لیے یہ ضروری ہے۔ کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ملک اور قوم ترقی یافتہ ہو پھر ہی زبان ترقی کرتی ہے۔ مصنف زبانوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

**"زبانوں کا عروج وزوال بھی قوموں کے عروج وزوال کے ساتھ جڑا ہوا ہے، جب ملک و قوم عروج پاتے ہیں تو ان کی زبان بھی اوج کمال پر پہنچ جاتی ہے"**(۱۶)

جس طرح کسی بھی علاقے یا خطے کے ذریعہ اظہار کو زبان کہتے ہیں اسی طرح کسی بھی خطے کے لوگوں کا زندگی گزارنے کا مخصوص ڈھنگ یا طریقہ ثقافت کہلاتا ہے۔ زبان کسی بھی ثقافت کا DNA ہوتی ہے۔ عامر بن علی اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ ثقافت اگر جسم ہے تو زبان اس جسم میں روح کی مانند ہے۔ پوری دنیا میں ثقافت کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہر علاقے کے باشندوں کو اپنی اپنی ثقافت سے بہت لگاؤ ہوتا ہے اور خاص طور پر بیرونی دنیا میں اپنی ثقافت سے خاص عقیدت رکھتے ہیں۔ اگر دور جدید کو دیکھا جائے تو بہت سے دردناک اور افسوس ناک واقعات سامنے آتے ہیں جس میں انسان کو جانور سے بدتر سمجھ کر مار دیا جاتا ہے جس کی بنیاد مذہبی منافرت، نسلی تعصب اور عدم برداشت ہے۔ عامر بن علی اس کا حل یہ بتاتے ہیں کہ پوری عالم دنیا کو پر امن طور پر آگے بڑھنے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ واحد راستہ بین الثقافتی ہم آہنگی ہے۔ عالمی امن برقرار رکھنے کے لیے ثقافتی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ اس ضمن میں مکالمہ سب سے موثر اور بنیادی ذریعہ ہے جس کے ذریعے ایک دوسرے کی ثقافت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

**"یہ آج کی تلخ حقیقت ہے کہ دنیا تنگ نظری کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے جو کہ زمین کو تنگ کیے جا رہی ہے۔ جب ہم ایک زبان کے ادب کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرتے ہیں تو ہمیں دوسرے لوگوں کے اندازِ فکر، نظریات کے ساتھ ساتھ اخلاقی پیمانوں کی بھی سمجھ آتی ہے۔۔۔ کسی بھی زبان کا ادب اس کے سماجی، ثقافتی اور عقلی ارتقاء کا نچوڑ ہوتا ہے اگر ہم عالمی امن کے خواہاں ہیں تو اس کے لیے ثقافتی ہم آہنگی ضروری ہے"**(۱۷)

ثقافت کو سمجھنے کا ایک طریقہ بین اللسانی تراجم ہیں، جس کے ذریعے ایک دوسرے کی ثقافت کو سمجھا جا سکتا ہے اور عالم دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

زبان اور ثقافت کے بعد سفر نامہ نگار پاکستان کی معاشیات اور سیاست پر چند ایک مضامین قلمبند کرتے ہیں۔ پاکستان سمیت دیگر ممالک کی معاشی گراوٹ کو دیکھا جائے تو آئی۔ ایم ا۔ یف کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق پہلے نمبر پر امریکا، دوسرے نمبر پر چین اور تیسرے نمبر پر جاپان اقتصادی و معاشی لحاظ سے طاقتور ممالک ہیں۔ پاکستان کا ہمسایہ ملک

بھارت دنیا کی ساتویں بڑی معیشت بن گیا ہے۔ بنگلہ دیش بھی معیشت کے لحاظ سے سات ممالک میں شامل ہے۔ موجودہ دور میں بھارت امریکا اور چین سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ بقول عامر بن علی:

**''بھارت اس وقت چین اور امریکا سے بھی زیادہ سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے، متوقع شرح نمو نو فیصد جبکہ بنگلہ دیش کی موجودہ متوقع شرح نو ہندوستان سے بھی زیادہ ہے۔۔۔ آئی۔ ایم۔ ایف کے مطابق دنیا کی اوسط معاشی نمو چھ فیصد رہنے کی اس برس متوقع ہے۔ ہمارے ملک کے بارے میں توقع اس اوسط سے بھی آدھی، یعنی تین فیصد رہنے کی ہے''**(۱۸)

آبادی کے اعتبار سے پاکستان دنیا کا پانچواں بڑا ملک ہے لیکن معاشی لحاظ سے تقریباً سب ممالک سے پیچھے ہے۔ سفر نامہ نگار پاکستان کی گزشتہ حکومت جنہوں نے تبدیلی لانے کا نعرہ لگایا تھا ان پر تنقید کرتے ہیں کہ ملک میں معاشی و سماجی حالات، کمزور ہو گئے اور بے روزگاری بڑھ گئی۔ مثبت تبدیلی کی بجائے منفی تبدیلی رونما ہوئی۔ مصنف گزشتہ حکومت پر اپنی تصنیف کے ایک مضمون میں تنقید کرتے ہیں۔ مضمون کا عنوان مرزا غالب کے ایک شعر کے مصرعے میں ترمیم کر کے لکھا گیا ہے جو کہ یہ ہے ''کس برہمن نے کہا تھا یہ سال اچھا ہے'' غالب کا شعر یہ ہے:

**دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض**
**اک برہمن نے کہا ہے یہ سال اچھا ہے**(۱۹)

مصنف کے مطابق قیام پاکستان کے بعد سب سے مشکل برس اب رہا ہے جس کا سبب کچھ لوگوں کی نظر میں کرونا وائرس ہے لیکن عامر بن علی اس کا جواب دیتے ہیں کہ کرونا کی لپیٹ میں صرف پاکستان ہی نہیں تھا دنیا کے دوسرے ممالک بنگلہ دیش، چین، بھارت اور جاپان سمیت بہت سے ممالک شامل تھے جبکہ دوسرے ممالک معاشی لحاظ سے پاکستان کی نسبت بہت آگے ہیں۔ سفر نامہ نگار اس حوالے سے مزید بتاتے ہیں:

**''موجودہ حکومت کی مستقل پالیسی یہ رہی ہے کہ ہر خرابی کی ذمہ داری گزشتہ حکومتوں پر ڈال کر خود کو بری الذمہ ثابت کر دیا جائے۔۔۔ اتنے ترجمان چشم فلک نے آج تک کسی حکومت کے نہیں دیکھے، جتنے موجودہ عہد میں سامنے آئے ہیں''**(۲۰)

مصنف پاکستان کے تعلیمی نظام کے بارے میں بھی بتاتے ہیں کہ پاکستان میں حکومت نے یکساں نصاب تعلیم رائج کر دیا ہے جس کے مطابق تمام سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں میں ایک جیسی نصابی کتب پڑھائی جائیں گی۔ حکومت کے اس اقدام پر ایک طرف داد و تحسین دی جا رہی ہے اور دوسری طرف تنقید کی گئی ہے جبکہ مصنف کی رائے یہ ہے کہ یکساں نصاب تعلیم سے زیادہ ضروری ہے کہ یکساں ماحول فراہم کیا جائے۔ سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں میں فرق صرف نصاب کا ہی

نہیں ہے بلکہ بنیادی فرق تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ماحول ہے۔ مصنف کتاب یکساں نصاب تعلیم کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

**''یکساں نصاب و نظام نافذ کرنے کے پیچھے مجھے آمرانہ سوچ نظر آتی ہے۔ طالب علموں کی بھلائی سے زیادہ حکمرانوں کا اپنے اقتدار کی ڈھاک بٹھانے کا جذبہ نظر آرہا ہے۔ حکومت اگر ملک و قوم سے خلوص کا ثبوت پیش کرنا چاہتی ہے تو شرح خواندگی بڑھا کر دکھائے جو کہ گراوٹ کا شکار ہے''**(۲۱)

سفر نامہ نگار کے مطابق پاکستانی حکومت کو اس بابت اقدام کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ ان کروڑوں بچوں کو سکول داخل کروائے جو معاشی حالت کے سبب سکول نہیں جاتے اور پڑھنے کی عمر میں مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔ بہتر اور معیاری تعلیمی نظام کے ذریعے ہی ملک میں مثبت تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ انسان اور جانور میں بنیادی فرق تعلیم کا ہے۔ جانور اپنی زندگی سے ہر نفس خود سیکھتا ہے اور اپنی زندگی کے خاتمے کے ساتھ ہی اپنے تجربات اور علم کو بھی لے جاتا ہے جبکہ انسان اپنے تجربات اور علم ہزاروں، لاکھوں سال سے اپنی اگلی نسلوں کو منتقل کرتا ہے۔ کتب ہی کے ذریعے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جانا جاتا ہے۔

ایسی ہی ایک کتاب کے بارے میں سفر نامہ نگار لکھتے ہیں کہ حال ہی میں فقیر اللہ خان کا سفر نامہ ''یہ ہے لندن'' منظر عام پر آیا۔ اس سفر نامے میں لندن شہر کے تمام گلی کوچوں اور چوک چوراہوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ فقیر اللہ خان کے سفر نامے میں لندن کے تمام تعلیمی اداروں کا تفصیلی بیان اور طرز تدریس کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جیسا کہ سر سید احمد خان کے سفر نامے ''مسافران لندن'' میں تحریر کیا گیا تھا۔ عامر بن علی ''یہ ہے لندن'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

**''ہماری قوم میں جن لوگوں کے پاس سفر کرنے کی استطاعت اور وسائل ہوتے ہیں، ان کے پاس عمومی طور پر قلم نہیں ہوتا ہے اور جو اہل قلم ہیں ان کے پاس دنیا گھومنے کے عام طور پر وسائل نہیں ہوتے۔ یہ فقیر اللہ خان صاحب کی خوش بختی ہے کہ مالک کائنات نے انہیں مادی وسائل سے بھی مالا مال رکھا ہے''**(۲۲)

اس سفر نامے میں زبان سلیس اور سہل ہونے کے ساتھ ساتھ طرز تحریر انتہائی دلچسپ ہے۔ جذبات کا شاعرانہ بیان فقیر اللہ خان کے سفر نامے کا خاصہ ہے۔ اس کے بعد مصنف ظفر محی الدین کے شعری مجموعہ ''ستارے دیکھتے رہنا'' کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں۔ اس شعری مجموعے سے پہلے ان کے بہت سے شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ ظفر محی الدین کے پانچ شعری مجموعے ''کن دا جوگی''، ''بھانبھڑ وچ سر پیر''، ''دیوان''، ''دیوان ظفر محی الدین'' اور ''عشق'' شائع ہو

چکے ہیں۔ ظفر محی الدین کی تازہ تصنیف ''ستارے دیکھتے رہنا'' ان کا چھٹا شعری مجموعہ ہے۔اس شعری مجموعے میں صوفیانہ رنگ نمایاں ہے جس کا سبب ان کا بچپن کا ماحول اور ان کی خاندانی تربیت ہے۔ جیسا کہ مصنف کتاب لکھتے ہیں :

**''اس مجموعے میں شامل شاعری اپنے عنوان کی طرح نرم و نازک جذبات سے مزین ہے''**(۳۲)

ظفر محی الدین کا یہ شعری مجموعہ جدیدیت، سہل ممتنع اور معنویت سے بھرپور تخلیق ہے۔ کسی بھی ادیب یا فنکار کے لیے اپنا حقیقی تخلیقی جوہر تلاش کرنا، محنت طلب اور جدوجہد کا متقاضی عمل ہوتا ہے۔ کتاب کی رونمائی کے بعد عامر بن علی نامور فن کار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ مصور، ظروف نگار، خطاط منشاء یاد ہیں جن کا فن ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد اوج کمال پر پہنچ چکا ہے۔ان کے فن پاروں کی مقامی، قومی اور عالمی سطح پر بے شمار نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں۔ مختلف ممالک کی اہم دیواروں پر ان کے فن پارے آویزاں ہیں جو ان کے فن کی عظمت کا ثبوت ہیں۔ منشاء یاد معروف خطاط اظہر قلم کار کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے فن خطاطی میں استعمال ہونے والے تمام خطوط سیکھے اور اپنے فن پارے میں خط ثلث، خط کوفی، خط نسخ، خط شکستہ، خط رقعہ اور دیوانی کو خوبصورت انداز میں استعمال کیا ہے۔انہوں نے فرہنگ ایران کی جانب سے منعقد نمائش میں حصہ لیا اور بہترین آرٹسٹ کا ایوارڈ بھی جیتا۔اس کے علاوہ بھی بے شمار انعامات اپنے نام کیے ہیں۔ان کے فن کے حوالے سے سفر نامہ نگار لکھتے ہیں :

**''ان کا فن ہماری ثقافت اور فنکارانہ عظمت کا بھی ثبوت ہے، نگار خانوں اور عجائب گھروں میں ان کا کام پہنچائے جانے کا حق دار ہے''**(۲۴)

بلاشبہ منشاء یاد کا فن پاکستان کا فخر اور نشان ہے۔ایسے ہی فنکار تمام دنیا عالم میں پاکستان کا نام روشن کرتے ہیں۔ پاکستان میں ایسے عظیم دانشور لوگوں کی کمی نہیں ہے لیکن المیہ ہے کہ ایسے اچھے لوگوں پر مبنی اور خوبصورت ملک کا دنیا میں امیج منفی ہے۔

سفر نامہ نگار ایک مضمون میں بتاتے ہیں کہ ان کے دوست اپنی سولہ سالہ بیٹی کے ہمراہ پاکستان میں سیاحت کے لیے آتے ہیں۔ پاکستان آنے کا سبب ٹام کو کوہ پیمائی کا شوق ہے۔ پاکستان میں دنیا کی کئی بلند ترین پہاڑی چوٹیاں موجود ہیں۔اس وجہ سے ٹام کا نظر انتخاب پاکستان ٹھہرا۔ پاکستان آنے کے بعد ٹام اس ملک سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو :

**''آپ کا خوبصورت دیس ہے اور دلدار لوگ ہیں یہاں کے رہنے والے ٹام کا کہنا ہے کہ پاکستان کو دنیا نے صحیح طور پر سمجھا نہیں ہے۔۔۔اس کے مطابق پاکستانیوں جیسے دوستانہ مزاج اور مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار لوگ اس عالم رنگ و بو میں کم کم ہی پائے جاتے ہیں''**(۲۵)

پاکستان بلا شبہ ایک خوبصورت ملک ہے۔ پوری عالم دنیا میں پاکستان کا امیج خراب ہونے کی وجوہات چاہے جو بھی ہیں لیکن پاکستانیوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس ملک کا امیج بہتر بنائیں، اس میں سفارت خانے اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ متعلقہ ممالک کے میڈیا پر پاکستان کو موقف جاندار طریقے سے پیش کریں۔ پریس سیکرٹری کا عہدہ میڈیا کی سمجھ بوجھ رکھنے والے صحافیوں کو دینا چاہیے اور یہ بھی ضروری ہے کہ میڈیا سے منسلک افراد اردو کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں پر عبور رکھتے ہوں اور خود کو پاکستان کا سفیر سمجھ کر جس ملک میں بھی مقیم ہوں پاکستان کا امیج بہتر بنانے کی کوشش قومی فریضہ سمجھ کر کرتے رہیں۔

عامر بن علی کا انداز تحریر اچھوتا ہونے کے ساتھ ساتھ متاثر کن بھی ہے کیونکہ وہ نامانوس الفاظ کا استعمال نہیں کرتے بلکہ زبان وادب کی روایت کی پاسداری کرتے ہوئے قاری کے لیے آسان اور سادہ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جس سے قاری اعلیٰ سے اعلیٰ تر مقصد کے بیان کو آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔

کتاب کے حصہ سوم میں چند نابغہ روزگار ہستیوں کا ذکر ہے جو ہم سے بچھڑ گئی ہیں۔ یہ حصہ مخصوص ان لوگوں کی یاد میں قلمبند کیا گیا ہے۔ سفر نامہ نگار جن ہستیوں پر مضامین تحریر کرکے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں ان میں امجد اسلام امجد، شعیب ہاشمی، اجمل نیازی، اختر شمار، احمد ندیم قاسمی، قائم نقوی اور ظفر شامل ہیں۔

امجد اسلام امجد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء لاہور کے علاقے گڑھی شاہو میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق دستکار گھرانے سے تھا۔ انہوں نے ایم۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا اور اس کے بعد تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے اور سات سال تدریسی فرائض ایم۔ اے۔ او کالج میں ادا کرنے کے بعد پنجاب آرٹس کونسل میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر متعین ہو گئے۔ ایک طویل عرصہ ثقافتی ادارے میں گزارنے کے سبب انہیں تخلیق کے لیے موزوں ماحول دستیاب رہا اور اس ماحول سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ان کی پہلی کتاب شاعری کی ''برزخ'' شائع ہوئی جو تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ انہوں نے ۷۰ کتابیں لکھیں جن میں ''برزخ، ساتوں در، عکس، ذرا پھر سے کہنا، فشار، وارث، شہر در شہر، آنکھوں میں تیرے سپنے، پھر یوں ہوا اور یہیں کہیں''، بہت مقبول ہوئیں۔ انہوں نے بہت سے ڈرامے بھی لکھے لیکن جن ڈراموں نے انہیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا ان میں ''دن، وارث، فشار، دہلیز اور سمندر اور دن'' شامل ہیں۔

امجد اسلام امجد بہت نامور مترجم بھی تھے۔ انہوں نے غیر ملکی شاعری سے ہم وطنوں کو متعارف کروانے کے لیے دیس دیس کی شاعری کو اردو میں ترجمہ کرکے شائع کروایا۔ جدید تراجم میں ''عکس'' اور ''کالے لوگوں کی روشن نظمیں'' شامل ہیں۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۷ء میں انہیں حکومت کی جانب سے پرائیڈ آف پرفارمنس (جسے صدارتی تمغہ حسن کارکردگی کہتے ہیں) سے نوازا گیا اور ۱۹۹۸ء میں ستارہ امتیاز سے نوازا گیا۔ مصنف امجد اسلام امجد کا ذکر یوں کرتے ہیں:

**''وہ بڑے خوش قسمت تخلیق کار تھے کہ انہیں زندگی میں بے پناہ محبت اور توجہ ملی۔ بلاشبہ اس عزت وشہرت کے حق دار بھی تھے۔ کیا خوبصورت زندگی گزار گئے کہ زمانے سے انہیں کوئی شکوہ نہ تھا اور نہ ہی زمانے کو ان سے کوئی شکایت۔ بلکہ دوطرفہ محبت کا معاملہ رہا''**(۲۶)

یہ عہد ساز شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار، کالم نویس، محقق، مترجم، سفر نامہ نگار، معلم اور اعلیٰ اخلاقیات کی حامل شخصیت ۸۷ سال کی عمر میں ۱۰ فروری ۲۰۲۳ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

پاکستان کے نامور ڈرامہ نگار، ہدایت کار، ماہر تعلیم، علمی و ادبی شخصیت کے حامل شعیب ہاشمی ۱۲ جولائی ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایم۔اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور بعد میں لندن کی رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹس سے تھیٹر کی تعلیم بھی حاصل کی۔ شعیب ہاشمی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کئی سالوں تک گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔ ان کی شادی نامور شاعر فیض احمد فیض کی بیٹی سلمہ ہاشمی سے ہوئی اور ان کے دو بچے ہیں۔ انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے جو ۱۹۷۰ء کی دہائی میں نشر ہوئے ان میں اذکار بکر، سچ گپ، تال متول، بلبلا (نشر ہونے کے فوراً بعد پابندی لگا دی گئی) شامل ہیں۔ ان سیریلز کے علاوہ ''دی نیوز انٹرنیشنل'' اخبار میں ''تال متول'' کالم بھی لکھتے تھے۔ ان کی خدمت کے اعتراف میں ۱۹۹۵ء میں حکومت کی طرف سے پرائیڈ آف پرفارمنس اور تمغہ امتیاز سے نوازا گیا۔

شعیب ہاشمی بہت اچھے دل کے سخی انسان تھے انہوں نے بطور معلم بہت محنت اور صدق دل سے مثالی کردار نبھایا۔ مصنف شعیب ہاشمی کے بارے میں لکھتے ہیں:

**''فیض احمد فیض کا داماد ہونا ان کا پاکستان کے ادبی حلقوں میں عمومی تعارف تھا مگر ہاشمی صاحب بڑے اعلیٰ ظرف کے آدمی تھے، خود باکمال مصنف اور ماہر تعلیم ہونے کے باوجود ہمیشہ خندہ پیشانی اور کھلے دل سے اس تعارف کو بھی قبول کرتے تھے''**(۲۷)

شعیب ہاشمی ۸۴ سال کی عمر میں ۱۵ مئی ۲۰۲۳ء کو وفات پا گئے اور یہی خالق کائنات کا نظام ہے اس دنیا میں جو بھی آیا، اس نے واپس اپنے مالک حقیقی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ بقول غالب:

**ؔ مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کی سے لئیم**
**تو نے گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے**(۸۲)

ڈاکٹر اجمل نیازی اردو زبان کے نامور شاعر، صحافی اور کالم نگار ۱۶ ستمبر ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوئے انہوں گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی۔ طالب علمی کے دوران ہی مختلف مجالس سے وابستگی رہی۔ اجمل نیازی بطور لیکچرار

گارڈن کالج راولپنڈی، گورنمنٹ کالج میانوالی، گورنمنٹ کالج لاہور اور ایف۔ سی کالج میں تعینات رہے۔ انہوں نے ۴۵ سال اپنی زندگی میں صحافتی وادبی خدمات انجام دیں۔ روزنامہ نوائے وقت میں بھی بے نیازیاں کے عنوان سے کالم لکھتے رہے تھے۔ ان کی تصانیف میں ''مندر میں محراب، جل تھل، محمد الدین فوق، مجموعہ مقالات اور بے نیازیاں'' شامل ہیں۔ حکومت پاکستان نے ادبی خدمات کے اعتراف پر ستارہ امتیاز سے نوازا۔ اجمل نیازی ایک سچے اور کھرے انسان تھے، بے حد مخلص انسان تھے، ان کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ لوگوں کے دکھ سکھ میں شرکت کر کے اپنا محسوس کرتے تھے یہ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اعلیٰ انسانی صفات کا نا صرف پرچار کرتے تھے بلکہ اعلیٰ انسانی صفات ان کی شخصیت کا عملی نمونہ تھی۔ عامر بن علی اجمل نیازی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے اندر مخصوص اداسی تھی جو ان کی شاعری میں واضح نظر آتی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

اجمل ہوں وسط شہر میں اجڑا ہوا مکان ؎
پاس آ کے لحہ بھر کوئی بیٹھتا نہیں(۲۹)

اجمل نیازی کمال کے فقرے باز اور بزلہ منبج تھے پھکڑ بازی نہیں کرتے تھے۔ انا پرستی اور عاجزی کے حسین امتزاج کا پیکر شخصیت صرف انہی کا خاصہ تھی، وہ تاریک دور میں جگنو کی مانند تھے لیکن اس جگنو کے بجھ جانے سے تاریکی اور بڑھ گئی ہے۔ یہ تابندہ شاعر، منفرد ادیب، مقبول کالم نگار، ٹی وی اینکر، ماہر تعلیم ڈاکٹر اجمل نیازی ۷۵ سال ۱ ماہ کی عمر میں ۱۸ اکتوبر ۲۰۲۴ء کو وفات پا گئے۔

اختر شمار ۱۷ اپریل ۱۹۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام اعظم خان تھا۔ ان کا تعلق چکری، راولپنڈی کے نزدیک پوٹھوہار میں واقع سیہال سے تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ملتان سے حاصل کی اور ایم۔ اے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد قصور کالج میں شعبہ تدریس سے وابستہ رہے۔ ان کا پہلا باقاعدہ شعری مجموعہ ''کسی کی آنکھ کے ہوئے ہم'' ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا اور ۱۹۹۳ء میں دوسرا شعری مجموعہ ''یہ آغاز محبت ہے'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ اس سے پہلے ۱۹۸۵ء میں پہلی کتاب ''روشنی کے پھول'' شائع ہوئی جو ہائیکو شاعری پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد ایک درجن سے زائد کتابیں اپنی مختصر زندگی میں تحریر کیں۔ جو شہرت، مقبولیت اور محبت ان کے حصے میں آئی وہ کم کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے۔

ان کی غزل کے اشعار نامور گلوکار نصرت فتح علی خان نے گائے اور مزہ دوآتشہ کر دیا:

اس کے نزدیک غم ترک وفا کچھ بھی نہیں ؎
مطمئن ایسے ہے جیسے کہ ہوا کچھ بھی نہیں
اب تو ہاتھوں سے لکیریں بھی مٹی جاتی ہیں

**اس کو کھو کر تو میرے پاس رہا کچھ بھی نہیں**(۳۰)

اختر شمار کو پی ٹی وی اور ریڈیو کے بے شمار پروگراموں میں میزبانی کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ عامر بن علی، اختر شمار کے بارے میں کہتے ہیں:

> **''ایسے مخلص اور دلیر سخن ور کی کمی بھلا کیسے پوری ہو سکتی ہے جو شاعر ہونے کے باوجود مبالغہ آرائی نہ کرتا ہو۔ میری دعوت پر بارہا میاں چنوں تشریف لائے۔ جب کبھی، جہاں کہیں مشاعرے پر بلایا ضرور تشریف لائے۔ یاروں کے یار مشاعرے باز آدمی تھے۔''**(۳۱)

ایثار کیش معلم و ماہر تعلیم ۱۸ اگست ۲۰۲۲ء کو انتقال کر گئے، ان کی کمی ادبی و صحافتی منظر نامے پر ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔

اردو شعر و ادب اور صحافت کا ایک معتبر نام احمد ندیم قاسمی ہے جو صرف ایک فرد نہیں ہے بلکہ ایک عہد کا نام ہے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی، ان کے لہجے میں نرمی تھی جس کی وجہ سے ان کی سخت اصول پسندی اور نظریاتی وابستگی کی گہرائی کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ احمد ندیم قاسمی کی زندگی میں جہاں محبت کرنے والوں کی کمی نہیں تھی وہیں ان کو تنقید کا نشانہ بنانے والے بھی کم نہیں تھے۔ اس بارے میں مصنف بتاتے ہیں:

> **''احمد ندیم قاسمی کے آپ کو نقاد بھی بہت ملیں گے۔ جس کی وجہ میری نظر میں تو واحد یہ ہے کہ ان کی سماج میں عزت اور اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا، اس لیے بہت سارے لوگ ان کو ہدف تنقید بنا کر لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے''**(۳۲)

احمد ندیم قاسمی غیرت مند، ہمدرد، شفیق، اصول پرست، روشن خیال، بلند کردار انسان تھے۔ یہ ایسی شاندار، بامقصد، بامعنی زندگی گزارنے والی شخصیت کے مالک تھے جو جادواں اور چراغوں کے ایک سلسلے کی طرح جہالت کے اندھیرے مٹاتے اور رہنمائی کرتے چل بسے۔

**کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا** ؎
**میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا**(۳۳)

نامور مدیر، خوبصورت لہجے کے شاعر، منفرد ادیب اور محقق قائم نقوی ۶ جون ۱۹۴۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام سید قائم حسین نقوی تھا۔ ان کا تعلق ادبی و علمی خاندان سے تھا۔ اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ ادبی ماہنامہ ''ماہ نو'' کے مدیر رہے، اس کے بعد ''نمود'' کے نام سے اپنی ادارت میں ذاتی پرچہ نکالا۔ ''مغربی پاکستان'' نامی رسالے اور روزنامہ ''نوائے وقت'' میں طویل عرصہ کالم لکھتے رہے۔ وزارت اطلاعات و نشریات سے بھی وابستہ رہے اور بطور ڈپٹی ڈائریکٹر

ریٹائرڈ ہوئے۔ ریڈیو پاکستان سے بھی ان کی وابستگی تیس سال رہی تھی۔ انہوں نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں آٹھ کتابیں تخلیق کیں جن میں ان کی مرتب کردہ کتاب ''تحفۃ العوام'' بے حد مقبول کتب میں شامل ہوتی ہے اور پنجابی تصنیف میں ''بیلے رمزاں دے'' انتہائی مقبول ہوا۔ قائم نقوی حلقہ ارباب ذوق کے تین مرتبہ سیکرٹری بھی منتخب ہوئے۔ مصنف قائم نقوی کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

**''ان کی دھیمے لہجے کی پراثر شاعری دل پر پھوار کی طرح گرتی ہے۔ نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میں بھی طالب علم تھا جب ماہ نو میں لکھنا شروع کیا اور ان کو ہمیشہ انتہائی شفیق اور مہربان پایا۔ ان کی شاعری اور نثر دونوں اپنے عہد کی کیفیات بیان کرتی ہے، ان کا تخلیقی کام تادم مرگ جاری رہا''** (۳۴)

نامور شاعر، مدیر، منفرد ادیب اور محقق ۷۳ سال کی عمر میں ۱۲ اگست ۲۰۲۲ء کو انتقال کر گئے۔ ان کی وفات ادب اور صحافت کے لیے ایک بڑے سرمایے سے محرومی کا سبب بنی ہے۔ ان کی وفات پر ایک پاکستانی شاعر نے یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

ے **بچھڑ گیا ہے وہ ہم سے مگر جدا تو نہیں**
**نظر سے دور ہوا ہے کہیں گیا تو نہیں** (۳۵)

عامر بن علی کتاب کے آخری مضمون میں اپنے دوست ظفر حنیف کی موت کا تعزیت نامہ لکھتے ہیں جو کہ کاروبار کے سلسلے میں جاپان قیام پذیر تھے۔ جاپان میں ایک ریستوران کے بانی تھے۔ اپنی شاعرانہ طبیعت کی وجہ سے اس ریستوران کا نام بھی ''دل ریستوران'' رکھا تھا۔ اس کاروبار سے پہلے جاپانی گاڑیوں کی ایکسپورٹ سے منسلک تھے۔ ظفر حنیف کوئی مشہور اور مقبول شخصیت نہیں تھے لیکن مجلسی آدمی تھے جس کے سبب ہر وقت ہوٹل میں پاکستانیوں کی رونق لگی رہتی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی بڑے نشیب و فراز کی شکار رہی اور متعدد بار شادیاں کیں لیکن راس نہ آئیں جس کی ایک بڑی وجہ ان کی غصیلی طبیعت تھی۔ عامر بن علی اپنے دوست کے بارے میں لکھتے ہیں:

**''سارے شہر کو ویران کر جانا کہوں تو شاید شاعرانہ مبالغہ لگے مگر ظفر دل والا جاپان کے ساحلی شہر توہاما کی کئی محفلوں کو سُونا اور پھیکا ضرور کر گیا ہے''** (۳۶)

ظفر حنیف جوانی میں ہی انتقال کر گئے۔ جاپان کے شہر ٹوکیو میں ان کی تدفین کی گئی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ سفر نامہ منفرد نوعیت کا ہے جس میں عامر بن علی نے روایتی سفر ناموں سے ہٹ کر نیا انداز متعارف کرایا ہے۔ مصنف نے جاپان سمیت تھائی لینڈ، کوریا، پاکستان اور ملائشیا کے احوال مختلف حوالوں سے پیش کیے ہیں۔ سفر نامہ نگار کی خاصیت ہوتی ہے کہ وہ جس علاقے کا بھی دورہ کرتا ہوا اپنے قارئین کا رشتہ اس علاقے سے جوڑے

رکھتا ہے۔ طرح طرح کے منار کے ساتھ ساتھ عامر بن علی بچھڑے ہوؤں کی یاد کے جگنو بکھیر کر سفر نامہ کی روایت میں جدت پیدا کرتے ہیں جو قارئین کو علمی شخصیات سے روشناس کراتی ہے۔ عامر بن علی قارئین کو ہم سفر بنا کر سفر نامے قلمبند کرتے ہیں اس لیے قاری بھی مصنف کی طرح کسی بھی علاقے یا خطے کی بودوباش سے خوب واقف ہو جاتا ہے کیونکہ سفر نامے تحریر کرتے وقت عامر بن علی ایسا اسلوب برتتے ہیں کہ قاری معاشرے کی تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے۔

# حوالہ جات

## (الف)


۱۔عامر بن علی، نگر نگر اک نظر، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ص ۱۴

۲۔ مظفر علی سید، بین السطور مضمون، مشمولہ، سویرا/۱۹۷، ص ۸۰

۳۔عامر بن علی، نگر نگر اک نظر، ص ۲۸

۴۔ایضاً، ص ۲۸

۵۔ایضاً، ص ۲۸

۶۔ایضاً، ص ۲۸

۷۔بحوالہ ایضاً، ص ۱۰۳

۸۔ایضاً، ص ۲۸

۹۔ایضاً، ص ۲۸

۱۰۔ایضاً، ص ۲۸

۱۱۔ایضاً، ص ۲۸

۱۲۔ایضاً، ص ۲۸

۱۳۔ایضاً، ص ۲۸

۱۴۔ایضاً، ص ۲۸

۱۵۔ایضاً، ص ۲۸

۱۶۔ایضاً، ص ۲۸

۱۷۔ایضاً، ص ۲۸

۱۸۔ایضاً، ص ۲۸

۱۹۔ایضاً، ص ۲۸

۲۰۔ایضاً، ص ۲۸

۲۱۔ایضاً، ص ۲۸

۲۲۔ایضاً، ص ۱۲۰

۲۳۔ بیگم اختر ریاض الدین، سات سمندر پار، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹیو سوسائٹی ۱۹۸۹ء، ص ۳۳
۲۴۔ الطاف شیخ، گیشاؤں کے دیس میں، لاہور: جہانگیر بک ڈپو، س۔ن، ص ۴۱
۲۵۔ علی بن عامر، نگر نگر اک نظر، ص ۱۹۳
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۷۵
۲۷۔ الطاف شیخ، جاپان کے دن، کراچی: ویلکم بک پورٹ، ۲۰۱۲ء، ص ۵۵
۲۸۔ علی بن عامر، نگر نگر اک نظر، ص ۱۳۳
۲۹۔ ایضاً، ص ۱۲۹
۳۰۔ رفیق ڈوگر، جاپان نورد، لاہور: دید شنید پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۲۵
۳۱۔ علی بن عمر، نگر نگر اک نظر، ص ۱۵۴
۳۲۔ ایضاً، ص ۲۰۱
۳۳۔ ایضاً، ص ۱۴۲
۳۴۔ ایضاً، ص ۱۸۳
۳۵۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۱۳۹
۳۶۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، لاہور: کارروان پریس، س۔ن، ص ۵۰۲
۳۷۔ بہ حوالہ، ایضاً، ص ۲۰۹
۳۸۔ ایضاً، ص ۲۱۳
۳۹ بہ حوالہ، ایضاًص ۲۱۳
۴۰۔ علامہ اقبال بال جبریل، طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں) پہلا بند شعر ۴
۴۱۔ علی بن عامر، نگر نگر اک نظر، ص ۲۱۵تا۲۱۶
۴۲۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۲۲۴
۴۳۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۲۲۵
۴۴۔ ایضاً، ص ۲۲۵
۴۵۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۲۳۲
۴۶۔ ایضاً، ص ۲۳۵
۴۷۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۲۳۷

۴۸۔مرزا غالب، دیوان، متن و ترتیب، حامد علی خان، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء، ص ۹۰

## (ب)

۱۔عامر بن علی، مشرق کی طرف دیکھ، لاہور: نستعلیق مطبوعات ۲۰۲۴ء، ص ۱۰ تا ۱۱

۲۔ایضاً، ص ۳۸

۳۔ایضاً، ص ۴۸

۴۔ایضاً، ص ۵۶

۵۔ایضاً، ص ۳۰

۶۔ایضاً، ص ۱۵

۷۔ایضاً، ص ۵۰

۸۔ایضاً، ص ۲۸

۹۔ایضاً، ص ۵۴

۱۰۔ایضاً، ص ۱۸

۱۱۔ایضاً، ص ۴۶

۱۲۔ایضاً، ص ۷۰

۱۳۔ایضاً، ص ۶۷

۱۴۔ایضاً، ص ۸۱

۱۵۔ایضاً، ص ۸۹

۱۶۔ایضاً، ص ۱۰۳

۱۷۔ایضاً، ص ۱۰۶

۱۸۔ایضاً، ص ۱۲۴

۱۹۔بہ حوالہ ایضاً، ص ۱۱۱

۲۰۔ایضاً، ص ۱۲۰

۲۱۔ایضاً، ص ۱۳۳

۲۲۔ایضاً، ص ۱۵۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۷۸ تا ۱۷۹

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۲۸۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۱۶۹

۲۹۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۱۷۶

۳۰۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۱۷۵

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۷۵

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۳۳۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۱۸۳

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۳۵۔ بہ حوالہ ایضاً، ص ۱۸۵

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۹۶

# محاکمہ

## الف: مجموعی جائزہ:

ادب انسانی زندگی کا رہبر اور معمار ہے جو عملی طور پر انسانی شعور اور عزم کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے۔ ادب ایک بڑی تہذیبی قدر ہے جس کے ذریعے مصنف اپنے قلم کی مدد سے خود اپنی صراحت کرتا ہے۔ یوں ادب زندگی کا شارح ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کا ایک باشعور نقاد بھی ہے۔ ابتدائے آفرنیش سے ہی انسان قصہ کہانی سننے اور سنانے کا ذوق رکھتا ہے۔ مصنفین نے انسان کی اس فطرت کو اصناف نثر میں پیش کر کے قارئین کو محظوظ ہونے کا موقع عطا کیا ہے۔ داستان، ناول، ڈرامے اور افسانے کی طرح سفر نامے بھی ایک دلچسپ صنف نثر ہے۔ انسان کی متلون مزاجی کی بدولت صنف سفر نامہ نگاری معرض وجود میں آئی ہے۔

سفر نامہ ایک متحرک اور زندہ ادبی صنف ہے جو اعلیٰ اقدار و روایات کو اُجاگر کرتے ہوئے زندگی کو نئی راہوں سے متعارف کراتا ہے۔ اگر انسانی تہذیب کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ تاریخ ایک مرحلہ وار سفر سے عبارت نظر آتی ہے کیونکہ انسان نے اپنی زندگی کا آغاز پتھر اور غار سے کیا اور پھر زرعی ترقی کا سفر کیا۔ بعد ازاں انسان کا سفر خلاؤں میں بھی ہوا۔ یوں اگر انسان کے ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو انسان کے ارتقاء کی ساری کہانی سفر کے گرد گھومتی ہے۔

سفر روزِ اول سے انسان کی فطرت کا حصہ بنا ہے۔ کائنات میں موجود ہر شے سفر میں ہے اور یہ سفر ازل سے ابد تک جاری و ساری رہے گا۔ سیاحت انسان کے ذہن کو پختگی اور وسعت عطا کرتی ہے اور سیاح علاقائی گروہی اور لسانی تعصبات کے دائرے سے نکل کر دنیا اور اس کی حسین رنگینیوں کو وسیع تناظر میں دیکھنے لگتا ہے۔ یوں وہ اپنے علاقے یا خطے کے سماجی، ثقافتی، تہذیبی، مقامی احوال و کوائف اور تجربات و مشاہدات کو جب ادبی منظر نامے کی زینت بنا کر پیش کرتا ہے تو وہ سفر نامہ کہلاتا ہے۔ سفر نامہ نگار وسعت نظری سے سفر نامہ قلمبند کر کے قارئین کے لیے نت نئی معلومات کے ساتھ ساتھ جیتی جاگتی تاریخ و تہذیب مہیا کرتا ہے۔

اردو سفر نامے کی روایت کا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آغاز میں سفر نامہ اردو ادب کی مختلف اصناف میں نمودار ہوتا رہا ہے لیکن سفر نامے کی ابتدائی شکلیں زیادہ دلچسپ اور معلوماتی نظر نہیں آتیں کیونکہ ان سفر ناموں میں کسی خطے یا علاقے کے جغرافیے، محل وقوع اور رسم و رواج کا بیان زیادہ تھا۔ قدیم سفر نامہ نگار حقائق اور شواہد کے ذریعے جغرافیائی اور تاریخی معلومات کے ساتھ داخلی محسوسات کی بجائے خارجی معلومات کو بیان کرتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے سفر ناموں کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔

جدید سفر ناموں میں موجود شگفتگی اور افسانوی طرز احساس کی وجہ سے ان کی مقبولیت میں روبروز اضافہ ہو رہا ہے اور پُر کشش اسلوب کے ذریعے اس صنف کو شگفتہ اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ جدید سفر نامہ نگاروں کی بڑی کھیپ میں عامر بن علی کا نام

نمایاں ہے۔ اُن کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جو انفرادیت کے حامل ہیں۔ آپ ایک تخلیق کار کا ذہن، حسن کار کا قلم اور مصور کا دل لے کر آئے ہیں۔ ان تینوں حس کے اضافے سے تحریر کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔

عامر بن علی یکم جنوری ۱۹۷۸ء کو جنوبی پنجاب کی تحصیل میاں چنوں میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم میاں چنوں سے حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے میاں چنوں سے لاہور آ گئے۔ فرسٹ ائیر میں داخلے کے چند دنوں بعد گورنمنٹ کالج آف سائنس لاہور کے ادبی پرچے ''دبستان'' کے نائب مدیر بنے۔ عامر بن علی نے مختلف ادبی میگزین کے ایڈیٹوریل بورڈز میں اپنی خدمات سرانجام دیں اور تعلیم کے دوران ہی کتابوں کی اشاعت ہونے لگی۔

عامر بن علی کا شعری مجموعہ ''یاد نہ آئے کوئی'' اُس وقت ترتیب دیا جب آپ گریجویشن کے طالب علم تھے۔ اس کے بعد ان کا اگلا شعری مجموعہ ''سرگوشیاں'' کے نام سے شائع ہوا اور اب تک ان کے چار شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ تعلیم مکمل کرتے ہیں ''ماہنامہ ارژنگ'' کے نام سے ادبی پرچہ شائع کرنا شروع کیا جس سلسلے میں مختلف مشاہیر کے انٹرویو کیے جو ''گفتگو'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔

عامر بن علی کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے انہوں نے نوبل انعام یافتہ گبریلا مسترال اور پابلو نرودا کی شاعری کا ہسپانوی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جو کہ ''محبت کے دورنگ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ عامر بن علی ادبی دنیا میں کئی حوالوں سے جانے جاتے ہیں۔ آپ نامور شاعر، صحافی، ادیب اور مترجم ہونے کے علاوہ معروف مدیر اور ماہر لسانیات ہیں۔

عامر بن علی نگر نگر، قریہ قریہ، گھومنے والے ایسے سیاح ہیں جو ہر لمحہ، ہر منظر لفظوں میں قید کر لیتے ہیں۔ ان کی نظر سرسری نہیں ہوتی بلکہ بہت عمیق ہوتی ہے جو صدیوں کو کھنگال لیتی ہے۔ اب تک ان کے چار سفر نامے منظر عام پر آئے ہیں جو کہ ''آج کا جاپان''، ''جہاں گردی''، ''نگر نگر اک نظر'' اور ''مشرق کی طرف دیکھ'' ہیں۔ سفر نامہ نگار کے سفر ناموں میں مختلف ممالک کی تہذیب و ثقافت، سیاست، معاشیات، رسم و رواج اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مصنف کا گہرا مشاہدہ اور بصیرت افروز قلب و نظر ایک رہنما کی حیثیت سے قاری کی انگلی پکڑ کر اُسے ساتھ لے چلتا ہے اور قاری کے ذاتی مشاہدے کو تاریخی واقعہ کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں کہ قاری مختلف ممالک کی سیر کے ساتھ ساتھ تاریخ کا مطالعہ بھی کر لیتا ہے۔ عامر بن علی کے سفر نامے معلومات کا بے بہا خزینہ ہیں۔ عامر بن علی کا سفر نامہ ''آج کا جاپان'' سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ یہ ایک تجربہ نامہ ہے مصنف نے جاپانی معاشرے کے اندر رہتے ہوئے اس کو خوب دیکھا اور اپنا تجربہ خوب آزمایا ہے۔ یہ تجربہ نامہ دوسرے سفر ناموں سے مختلف ہے اس سفر نامے کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جاپان ایک ایسا ملک ہے جہاں جا کر تیسری دنیا کے لوگ ہی نہیں بلکہ انتہائی ترقی یافتہ ممالک کے لوگ بھی حیران رہ جاتے ہیں۔ جاپان کے چھوٹے بڑے شہروں میں آبادی کی کثرت اور اس سے وابستہ لوازم سے قطع نظر عام لوگوں کے لیے چھوٹے سے چھوٹے شہر اور قصبے کی عوام کے لیے بھی وہی سہولیات ہیں جو بڑے بڑے شہروں میں مل جاتی ہیں۔ جاپان کا

چپہ چپہ ٹیکنالوجی کے بل پر باہم منسلک ہے۔ ''آج کا جاپان'' سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ جاپانی قوم قانون پسند، متحمل نرم خو، مستقبل بین، محنتی اور دھیمے مزاج کی حامل ہیں۔ غیر ضروری جذبات سے دور اور بے کار سیاسی و مذہبی منافشات سے نفوذ ہے۔ ہم اگر چاہیں تو جاپانیوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ جاپان نے ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز ترقی کی ہے خصوصاً الیکٹرانکس میں دنیا بھر میں ان کا صحیح معنوں میں کوئی مد مقابل نہیں ہے۔

مصنف اپنے سفر نامے میں جاپانیوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جاپانی قوم کا طرز حیات کے انداز منفرد نرالے ہیں۔ یہ قوم کئی زمینی پیچیدگیوں اور چیلنج کا سامنا کر کے ترقی کے مراحل طے کر رہی ہے۔ جاپانی قوم ترقی کرنے کے ساتھ ساتھ اب بھی کہیں نہ کہیں اپنے ماضی سے جڑے ہوئے ہیں۔ اب بھی جاپانی قوم اپنے شہنشاہ کو ایک خدا کا درجہ دیتے ہیں۔ جاپانی سماج شہنشاہ کے لیے ''تھن نو'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس کا مطلب ''خدا جیسا'' یا پھر ''بھگوان سمان'' ہے۔ اُسے بے حد مذہبی تقدس حاصل ہے۔ بہت سی منفرد باتیں جاپانی معاشرہ کا حصہ ہیں۔ یہ قوم بے عیب زندگی کے خواہش مند ہیں۔ سکولوں میں باقاعدہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی دی جاتی ہیں۔ ان کی زندگی جاپانی اصول و ضوابط کے زیر اثر ہوتی ہے، ذرا سی کوتاہی انہیں گوارہ نہیں ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر خودکشی سے بھی گریز نہیں کرتے ہیں۔

عامر بن علی کے مطابق محنت کش جاپانی قوم روبوٹ معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی جنگوں کے سب سے زیادہ برے اثرات جاپانیوں پر پڑے لیکن اس کے باوجود اس قوم نے اقوام عالم میں اپنا لوہا منوایا۔ اتحاد، محنت و یکجہتی جاپانیوں کی اجتماعیت میں موجود ہے اور اس قوم کی انفرادیت بن گئی۔ اسی خوبی کے سبب ان قوم نے ترقی کی۔ جاپانی قوم اپنی صحت کے متعلق ہر دم باخبر ہے۔ ان کے گھر نہ صرف نفیس اور صاف ستھرے ہوتے ہیں بلکہ مساج پارلر سے لے کر کھانے پینے کی اشیاء بھی خاص ہوتی ہیں۔ جاپانی قوم حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرتی ہے۔ جاپانی سائنسی شعور کی مالک ایک جدید اور ترقی یافتہ قوم ہے لیکن ان اعتقادات میں ابھی بھی کافی حد تک قدامت پرستی نظر آتی ہے اور ابھی بھی بھوت پریت اور روحوں پر یقین رکھتے ہیں۔ جاپانیوں کو پالتو جانوروں سے بے حد لگاؤ ہے۔ ان جانوروں کے مرنے کا سوگ، مرنے والے گھر کے فرد کی طرح منایا جاتا ہے۔ بلی اور کتے کے مرنے کا باقاعدہ کریا کرم رکھا جاتا ہے جس میں ارتھی کے ساتھ دیگر مذہبی رسومات بھی شامل ہوتی ہیں۔

عامر بن علی لکھتے ہیں کہ مجموعی طور پر جاپانی قوم منظم ہے۔ ٹریفک کا نظام ہو یا ریلوے کا نظام، کاروباری دفاتر ہو یا مصنوعات کی فیکٹری ان میں ملاوٹ اور جھوٹ کا تصور بھی نہیں اور وقت کی پابندی کا خاص لحاظ رکھتے ہیں۔ برداشت، بردباری اور صبر و تحمل اس قوم کا خاصا بن گیا ہے۔ جاپانی قوم ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ عامر بن علی جاپان کے ساتھ پاکستان کا تجزیہ بھی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ پاکستانیوں کو بھی جاپانیوں سے محنت، حب الوطنی، صبر و تحمل اور برداشت جیسے اوصاف سیکھ کر اپنے ملک و قوم کی ترقی میں حصہ ڈالنا چاہیے اور ایک محب وطن پاکستانی ہونے کے ناطے پاکستانیوں کو

چاہیے کہ دنیا میں پاکستان کی تصویر بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ ہر قوم کے فرد کا تعلق ملک سے ہے اگر فرد اچھا ہو تو قوم بھی اچھی ہو گی۔ عامر بن علی سفر نامے کے فن سے بخوبی واقف ہیں اس لیے ان کے سفر نامے چاہے وہ کسی بھی ملک یا موضوع کے متعلق ہوں یکساں ذہنی اور تخلیقی رویے کی بدولت منفرد ہیں۔ ان کے سفر نامے چاہے کسی بھی موضوعات کے حوالے سے لکھے گئے ہوں ان کی سبھی تحریروں میں قاری کی دلچسپی ضرور ملتی ہے اسی طرح ''جہاں گردی'' عامر بن علی کا ایک ایسا سفر نامہ ہے جس کی انفرادیت مسلمہ ہے۔ اس سفر نامے میں مصنف نے تھائی لینڈ، سری لنکا، قطر، ارجنٹائن، پیرو، چلی، میکسیکو کی تہذیب و ثقافت کو اپنے سفر ناموں میں پیش کرکے بے شمار حقیقتوں کا انکشاف کرتے ہیں۔ عامر بن علی کے سفر ناموں میں قارئین کیلئے اس لیے دلچسپی کا باعث ہے کہ عوام و خواص کو اپنی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔

سفر نامہ نگار اپنے سفر نامے میں اجتماعیت کے ساتھ ساتھ انفرادیت کے رنگوں کو بھی اُجاگر کرتے ہیں۔ اپنے ذاتی حالات و تجربات کو بھی سفر نامے کا حصہ بنا لیتے ہیں جس سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے۔ عامر بن علی کے سفر ناموں میں جدید سفر ناموں کی شیرینی موجود ہوتی ہے۔ سفر نامہ نگار چلی کا رخ کرتے ہوئے معروف ادبی شخصیات پابلو نرودا اور گبریلا مستر ال پر تفصیلی بات کرتے ہیں۔ پابلو نرودا کی رہائش گاہ اس میں خوبصورتی، مصوری کے نمونے اور ان کی بیوی کی پینٹنگ کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ میکسیکو میں فرید کا آستانہ اور لیون ٹراسکی کے گھر کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

عامر بن علی مناظر کے بیان میں محاکات نگاری سے بھی کام لیتے ہیں۔ آپ مشاہدات کے اظہار کے لیے الفاظ کا استعمال یوں کرتے ہیں کہ قارئین ان کے سفر نامے پڑھتے ہوئے مناظر کی ہو بہو تصویر اپنی آنکھ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ عامر بن علی کے سفر نامے میں جمالیات کے مظاہر ہیں وہ سفر ناموں میں فنکارانہ پختگی اور چابکدستی سے حسین مناظر کو ایسے ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں کہ وہ کسی مصور کی بنائی ہوئی خوبصورت تصویر کا رخ پیش کرتا ہے عامر بن علی اپنے احساسات لطیفہ کی بدولت فن سفر نامہ نگاری کو منفرد اور حسین سوغات عطا کرتے ہیں۔

عامر بن علی کے سفر نامہ ''نگر نگر اک نظر'' کے متعلق میری تحقیق ماحاصل یہ ہے کہ اس سفر نامے کو مختلف تحاریر کا گلدستہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ سفر نامے پر مشتمل ہے۔ چھوٹے چھوٹے ابواب میں بٹا ہوا یہ نہایت دلچسپ ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ کالموں پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات میں چھپتے رہے ہیں۔ اس سفر نامے کا تیسرا حصہ ملاقاتوں کے حوالے سے ہے۔ یہ کتاب نا صرف معلومات کا انسائیکلوپیڈیا ہے بلکہ اس میں ادبی رنگ بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ سفر نامے میں افریقی ممالک کے لوگوں کی دانشورانہ باتیں حیران کر دیتی ہیں۔ سفر نامے کے آخری چند ابواب میں مشتاق احمد یوسفی، منو بھائی، مشکور حسین، میجر منصور خان، منیر نیازی اور احمد ندیم قاسمی کے بارے میں نہایت دلچسپ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

عامر بن علی کے سفر ناموں کی ایک اور اہم خوبی منظر نگاری بھی ہے جو قاری کا دل موہ لیتی ہے اور قاری وہ منظر اپنے آنکھوں کے سامنے محسوس کرتا ہے۔ بلاشبہ عامر بن علی الفاظ کے جادو سے بہترین مناظر تخلیق کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو غیر ضروری سمجھ کر نظرانداز نہیں کرتے بلکہ ان کے تذکرے سے سفر نامے کی فضا کو پر تاثیر بناتے ہیں۔ عامر بن علی کی تازہ تصنیف کا جائزہ لیا جائے تو ہر منظر کی عکاسی اس مہارت سے کی ہے کہ اس گہرے مشاہدے کی داد دینا پڑتی ہے۔ ان کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔ ان کے اسلوب کی اصل خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی سیاحت کے تاثرات، **مشاہدات و تجربات کو اپنے جذبات میں ڈھال کر سفر ناموں میں اس طرح شامل کیا ہے کہ ان کے مشاہدات تجربات اور تاثرات کسی بھی خطے، علاقے یا ملک کی تاریخ کا پسِ منظر بن کر تہذیب و ثقافت اور معاشرت کا آئینہ دار بن جاتے ہیں۔**

**مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو عامر بن علی کے سفر ناموں کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا قلم محض چٹخارے ہی نہیں لیتا بلکہ وہ ہر معاشرے کی تصویر کشی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ عامر بن علی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے سفر ناموں کو روایتی سفر ناموں سے نکال کر ان میں جدت پیدا کی ہے۔ مصنف اپنے سفر ناموں میں نہ صرف مختلف ممالک کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کو بیان کرتے ہیں بلکہ ادباء اور شعراء کو بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ عامر بن علی بیرون ملک میں مقیم ہوتے ہوئے بھی اردو ادب کی روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ آپ نے سفر ناموں میں مختلف ادباء کی کتابوں کی رونمائی کے حوالے سے بھی اظہار خیال کرتے ہیں جس سے یہ سفر نامے ایک الگ اور نئے انداز میں سامنے آتے ہیں۔ ان کے سفر نامے یادداشتوں، شخصی خاکوں اور ادبی محافل کی خوبصورت تصویر پیش کرتے ہیں۔ عامر بن علی ایک صحافی ہونے کے ناطے میڈیا کی آزادی کے مثبت اور منفی پہلو بیان کرتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں مختلف ممالک کی معلومات کے ساتھ ساتھ مختلف شخصیات کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے جس سے قاری ایک منفرد تجربے سے ہمکنار ہوتا ہے۔ عامر بن علی کے سفر نامے ہیئتی اعتبار سے ایک منفرد تجربہ ہیں۔**

## ب: تحقیقی نتائج:

عامر بن علی کے زیر بحث سیاحتی سفر ناموں کے فکری اور فنی تقابل کی تفصیلی تجزیے کے بعد درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ عامر بن علی کے سفر نامے ایک ہی تسلسل کا حصہ نظر آتے ہیں۔ ''آج کا جاپان'' میں مصنف جاپان کی جدید ٹیکنالوجی میں ترقی اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کو بیان کرتے ہیں۔ ''جہاں گردی'' میں مختلف ممالک کی سیاحت کے متعلق بتاتے ہیں اور ''نگر نگر اک نظر'' میں جاپان کے کلچر کے ایسے ایسے روپ دکھائے تھے جو اس سے قبل ہمیں معلوم نہیں تھے اور ''مشرق کی طرف دیکھ'' میں جاپان، پاکستان، جنوبی کوریا، تھائی لینڈ اور ملائیشیا کے عمومی اور بنیادی موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ عامر بن علی کے سفر نامے بیانیہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

۳۔ فکری حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے سفر نامے مختلف تفکرات کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''آج کا جاپان'' میں جاپان کی سیاحت کے بارے میں بتایا ہے تو ''جہاں گردی'' میں مختلف ممالک کی سیر و سیاحت نظر آتی ہے ''نگر نگر اک نظر'' کی بات کی جائے تو اس میں بھی جاپان کا کلچر کے علاوہ مختلف شخصیات کے بارے میں بھی بیان ملتا ہے اور سفر نامہ ''مشرق کی طرف دیکھ'' میں مختلف ممالک کے بنیادی موضوعات کے ساتھ ساتھ عمومی موضوعات کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔

۴۔ ان کے سفر نامے آسان اور سادہ اندازِ بیان اختیار کیے ہوئے ہیں۔ قاری کو پڑھتے ہوئے کہیں بھی مشکل سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ سادہ اندازِ بیان ان کے سفر ناموں کو خوبصورت بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

۵۔ سفر ناموں کو پڑھتے ہوئے قاری کسی بھی قسم کی بوریت یا اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔

۶۔ عامر بن علی کے چاروں سفر ناموں کے فکری و فنی تقابل سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ چاروں اپنے اپنے انداز میں اعلیٰ درجے کی فکر اور فن اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ چاروں سفر نامے فکر اور فن کے اصولوں پر پورا اُترتے ہیں اور اپنے اندر اعلیٰ جامعیت رکھتے ہیں۔

## ج۔ سفارشات:

۱۔ عامر بن علی کے سیاحتی سفر ناموں کا دوسرے مصنفین کے لکھے گئے سیاحتی سفر ناموں کے حوالے سے تقابل پر مبنی تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ عامر بن علی کے سیاحتی سفر ناموں میں پائے جانے والے ثقافتی عناصر کے حوالے سے تحقیقی کام کیا جا سکتا ہے۔

# کتابیات

## بنیادی ماخذ:

- عامر بن علی، آج کا جاپان، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۳ء
- عامر بن علی، جہاں گردی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۷ء
- عامر بن علی، نگر نگر اک نظر، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۲۱ء
- عامر بن علی، مشرق کی طرف دیکھ، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۲۴ء

## ثانوی ماخذ:

- آصف محمود، ڈاکٹر، چڑھتے سورج کے دیس میں (جاپان)، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۹ء
- آغا سہیل، ڈاکٹر، نئے ہندوستان کا بڑھا ہاتھ، مشمولہ، زرد پتوں کی بہار، لکھنؤ: اکادمی ادبیات، ۱۹۸۲ء
- آمنہ مفتی، دیباچہ، مشمولہ، مشرق کی طرف دیکھ، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت اول، ۲۰۲۴ء
- ابن انشاء، دنیا گول ہے، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۸۰ء
- ابن انشاء، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۸۰ء
- ابن انشاء، چلتے ہو تو چین کو چلیے، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۲۰۱۹ء
- ابن انشاء، آوارہ گرد کی ڈائری، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۲۰۱۹ء
- ابن انشاء، نگری نگری پھرا مسافر، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۲۰۱۹ء
- احمد عقیل روبی، کچھ سرگوشیاں کے بارے میں، مشمولہ، سرگوشیاں، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت پنجم، ۲۰۱۰ء
- اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، لاہور: نسیم بک ڈپو، ۱۹۷۴ء
- اسد اللہ غالب، محبتوں کے سفیر کا سفر نامہ، مشمولہ، نگر نگر اک نظر، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت اول ۲۰۲۱ء
- اسلم کولسری، کومل جذبوں کے شاعر، مشمولہ، چلو آؤ اقرار کرتے ہی، لاہور: المطبع العربیہ، اشاعت دوم ۲۰۰۴ء
- الطاف یوسف زئی، ڈاکٹر، تھائی لینڈ کے رنگ، فیصل آباد: مثال آباد پبلشر ۲۰۱۶ء
- الطاف شیخ، گیشاؤں کے دیس میں، لاہور: جہانگیر بک ڈپو س۔ن
- القرآن: البقرہ، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور۔
- القرآن القریم، سورۃ العنکوبت، آیت ۲۰۔
- امجد ثاقب، گوتم کے دیس میں، دیباچہ: سچ کی تلاش، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۱ء
- امجد اسلام امجد، جاودانی کا سفر، مشمولہ، محبت چھوڑ گئی دل کو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت سوم، ۲۰۱۱ء

- انور سدید، ڈاکٹر، اردو میں سفر نامہ، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۷ء
- بیگم اختر ریاض الدین، سات سمندر پار، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۱۹۸۹ء
- بیگم اختر ریاض الدین، دھنک پر قدم، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۶ء
- بشریٰ رحمٰن، ٹک ٹک دم بدم ٹوکیو، لاہور: پاکستان کنکشنز، س۔ن
- تارا چند، ڈاکٹر، تمدن سندھ پر اسلامی اثرات، الہ آباد، ۱۹۴۶ء
- خالد محمود، ڈاکٹر، اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء
- خالد محمود، ڈاکٹر، ادب کی تعمیر (مجموعہ مضامین)، نئی دہلی: لبرٹی پریس مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۱ء
- ذوالفقار علی حسن، اردو سفر نامے میں جنس نگاری (۱۹۴۷ء کے بعد)، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۸ء
- رفیق ڈوگر، جاپان نورد، لاہور: دید شنید پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء
- رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء
- سعید احمد، آزادی کے بعد اردو سفر نامہ، دہلی: مرشیہ پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء
- سید راس مسعود، روح جاپان، حیدر آباد دکن: دار لطبع سرکار عالی، ۱۳۴۵ء
- شہرت بخاری، سر آغا، مشمولہ، یاد نہ آئے کوئی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، اشاعت دوم، ۲۰۱۵ء
- عامر بن علی، آج کا جاپان، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۳ء
- عامر بن علی، روبرو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۹ء
- عامر بن علی، گفتگو، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۴ء
- عامر بن علی، جہاں گردی، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۷ء
- عامر بن علی، نگر نگر اک نظر، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۲۱ء
- عامر بن علی، مشرق کی طرف دیکھ، لاہور: نستعلیق مطبوعات، ۲۰۲۴ء
- عبدالکریم خالد، ڈاکٹر، ایک جدید اور منفرد سفر نامہ، ۲۰۰۶ء
- علامہ اقبال، بال جبریل، لاہور: اقبال اکیڈمی، س۔ن
- غفور شاہ قاسم، پاکستانی شناخت کی صدی، راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
- غلام عباس وڑائچ، مشرق میں مغرب، اسلام آباد: بزمِ اکبر، ۱۹۹۸ء
- فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، لاہور: کارواں پریس، س۔ن
- قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، اردو سفر نامے انیسویں صدی میں، نئی دہلی: جامعہ نگر، ۱۹۸۷ء

- قمر علی عباس، لنکا ڈھائے، کراچی: ویلکم بک ڈپو، ۲۰۱۱ء
- محمد کامران، گ سے گڑیاج سے جاپان، لاہور: ماورا پبلشرز، ۲۰۱۰ء
- مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ، س۔ن
- مرزا غالب، دیوان، متن و ترتیب، حامد علی خان، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء
- ناصر کاظمی، دیوان، لاہور: مکتبہ خیال، ۱۹۸۱ء
- نفیسہ حق، سفر نامہ فن اور جواز، مشمولہ، سہ ماہی الزبیر سفر نامہ نمبر شمارہ ۳۶۔۳۷، اردو اکادمی بہاولپور، ۱۹۹۸ء
- یوسف خاں کمبل پوش، عجائبات فرنگ، لکھنؤ: مطبع نول کشور، ۱۸۳۷ء

## انٹرویوز:

- عامر بن علی، روبینہ شہادت، رہائش گاہ: عامر بن علی، میاں چنوں، ۲۱/اپریل ۲۰۲۲ء، بہ وقت دوپہر ۲ بجے

## رسائل:

- پروین شاکر، محبتوں کا شاعر، ماہنامہ چہار سو،، احمد فراز، راولپنڈی: جنوری تا فروری، ۱۹۹۵ء
- عصمت ناز، ڈاکٹر، سفر ناموں کی تاریخ وتدوین، رسالہ معاصر، جولائی تا دسمبر، ۲۰۰۰ء، شمارہ ۴۰۳
- نفیسہ حق، سفر ناموں کا فن اور جواز، مشمولہ، سہ ماہی الزبیر، شمارہ ۳۰۷، بہاولپور: اردو اکادمی ۱۹۹۸ء

## لغات:

- سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، جلد سوم، ۲۰۰۲ء
- سید شہاب الدین دستوری، جامع اردو لغت، مرتب: فہمیدہ بیگم، جہلم: بک کارنر، س۔ن
- قبول بیگ بدخشانی، فیروز اللغات، لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۴ء
- مقبول بیگ بدخشانی، مرتب، فیروز اللغات فارسی۔اردو، فیروز سن لمیٹڈ، ۲۰۰۴ء
- وارث سرہندی، علمی اردو لغت، لاہور: علمی کتاب خانہ، س۔ن

## انگریزی کتب:

Oxford Advanced Learner Dictionary P:649

Encyclopedia Word Dictionary larnlyn Vol:6923, P: 11

Encyclopedia Word Dictionary larnlyn Vol: 6923, P: 11